اقبالؒ اور گجرات

ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبال اور گجرات

اقبالؒ اور گجرات

ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ
ایم بی بی ایس (کے۔ای)، بی ایس سی (پنجاب)
ایم اے (اردو)، ایم اے (پنجابی)

سلیچ پبلیکیشنز گجرات

نام کتاب	اقبال اور گجرات
مصنف	ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ
ضخامت	۴۱۶ صفحات
ایڈیشن	اول
تعداد	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	جولائی ۱۹۹۸ء / ربیع الاول ۱۴۱۹ء
کمپوزنگ	رین بو کمپوزرز اینڈ پرنٹرز گجرات 512289
مطبع	شرکت پرنٹنگ پریس 43 نسبت روڈ لاہور
قیمت	۳۰۰ روپے

ناشر

سلیچ پبلیکیشنز گجرات

گجرات کی دو عظیم شخصیات

چودھری اکبر علی (ایم۔اے فلاسفی)
اور
ڈاکٹر نثار احمد چیمہ (ایف۔ آر۔ سی۔ ایس)

کے نام

حسن ترتیب

باب اول
اقبال کے بزرگ اور گجرات

باب دوم
گجرات: اقبال کا مُرشد خانہ
(بیعت بدست حضرت قاضی سلطان محمودؒ)

باب سوم

گجرات۔ اِقبال کا سسرال

حصہ اول:۔ "ہو گیا اِقبال قیدی محفل گجرات کا"

حصہ دوم:۔ زوجہ اولیٰ' اولاد اور سسرالی خاندان

باب چہارم

رجال گجرات سے اِقبال کے مراسم

حصہ اول:۔ محفل اِقبال کے ارکان مشیدہ (قریبی احباب)

حصہ دوم: وسعت محفل احباب

حصہ سوم: جن سے رسم و راہ تھی

حصہ چہارم: اِقبال سے ملاقات کرنیوالے

حصہ پنجم: اِقبال کے گجراتی مکتوب الیہم

باب پنجم

اِقبال شناسی میں گجرات کا کردار

حصہ اول:۔ مترجمین اِقبال

حصہ دوم: محققین اِقبال

حصہ سوم: مقلدین اقبال

حصہ چہارم:۔ جرائد و رسائل و بزمہائے اقبال

باب ششم

شعرائے گجرات کا اِقبال سے اظہارِ عقیدت

(منتخب منظومات اردو' فارسی' پنجابی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"زندہ رود" علامہ اقبال کی سب سے مفصل اور جامع سوانح عمری ہے۔ لیکن اس کی تکمیل (۱۹۸۵) کے بعد بھی اقبال پر سوانحی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ متعدد قابلِ قدر مضامین کے علاوہ اب تک حسبِ ذیل سوانحی کتابیں منظرعام پر آ چکی ہیں۔

۱	اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۹۸۵ء
۲	مظلوم اقبال	شیخ اعجاز احمد	۱۹۸۵ء
۳	اقبال کی ابتدائی زندگی	ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین	۱۹۸۶ء
۴	Iqbal : As I knew him	ڈورس احمد	۱۹۸۶ء
۵	عروجِ اقبال	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	۱۹۸۷ء
۶	حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے	محمد حمزہ فاروقی	۱۹۸۸ء
۷	نوادرِ اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۹۹۵ء

اقبال کے سوانح پر تحقیق کے لئے ان کتابوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان گیارہ سالوں میں ایک ہی موضوع پر سات اہم کتابوں کی اشاعت سے ایک قابلِ توجہ نکتہ ہے۔ اس سے سوانحِ اقبال کے شعبے میں تحقیق مزید کے امکانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ علامہ کی شخصیت، سوانح اور اس کے اطراف میں متعدد گوشے ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کی زیرِ نظر کاوش اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔

"اقبال اور گجرات" کا دائرۂ تحقیق محدود ہے۔ مگر مصنف نے اپنی مہم جو اور تحقیقی افتادِ طبع کے سبب "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے" کے مصداق ایک مخصوص اور محدود موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے ضمنی اور ذیلی موضوعات پر بھی تحقیق کر ڈالی ہے۔ اقبال کے آباء، ان کے سسرال، حضرت قاضی سلطان محمودؒ سے اقبال کی بیعت، پہلی بیوی سے تعلقات، رجالِ گجرات سے اقبال کے مراسم، اقبال شناسی میں گجرات کے اہلِ قلم کا حصہ...... اپنی اپنی نوعیت میں یہ سب موضوعات اور ان کے بعض ضمنی پہلو اہم ہیں اور

ڈاکٹر منیر احمد صاحب نے ان پر اپنے سادہ اور خاصی حد تک سائنٹفک مگر دلچسپ انداز و اسلوب میں بحث کی ہے۔ انھوں نے متعلقہ موضوعات پر معلوم و موجود حقائق پر ہی قناعت نہیں کی، نہ دستیاب روایات کو جوں کا توں قبول کیا ہے، بلکہ پوری چھان بین کے بعد آگے بڑھے ہیں۔ اقبال کے سسرال، پہلی بیوی سے تعلقات اور ازدواجی بحران پر ان کی بحث بہت سیر حاصل ہے اور نتائج تحقیق کو انھوں نے بڑی صاف گوئی سے پیش کر دیا ہے..... تاہم راقم کو ڈاکٹر محمد منیر احمد کی بعض آرا سے پوری طرح اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً: کریم بی بی کی مطلق مظلومیت کا تاثر درست نہیں ہے...... اس طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اقبال ہر حال میں ان سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے، وغیرہ...... اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے درمیان کشیدگی اور اختلافات کی وجوہ کیا تھیں؟ اس کی تفصیل اور واضح شہادتیں تو میسر نہیں ہیں، مگر قرائن بتاتے ہیں کہ اختلافِ طبائع بنیادی سبب تھا۔ دونوں خاندانوں میں معاشی تفاوت کی وجہ سے کریم بی بی میں ایک گونہ احساسِ برتری بھی فطری امر تھا اور بعید نہیں کہ وقتاً فوقتاً وہ اس کا اظہار بھی کرتی رہتی ہوں... ان کی بیٹی (معراج بیگم) کی شہادت موجود ہے کہ اباجان کے ذکر پر والدہ صاحبہ کی زبان قابو نہیں رہتی اور ان کو ہر وقت بد زبانی سے یاد کرتی ہے...... ذہنی ناموافقت میں تعلیمی تفاوت کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ سول سرجن جیسے اونچے عہدے پر فائز ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی بیٹی کا اَن پڑھ رہ جانا باعثِ تعجب ہے..... اس کے برعکس اقبال اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ان سب باتوں نے مل کر ایک مستقل دوری کی صورت اختیار کر لی۔ اس دوری میں، ممکن ہے اقبال سے بھی کچھ کوتاہی سرزد ہوئی ہو۔ بہرحال وہ ایک انسان تھے۔

پھر آفتاب اقبال کا طرزِ عمل بھی قابلِ غور ہے۔ اقبال مرنجان مرنج طبیعت رکھتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نے انھیں اتنی اور ایسی ایذا پہنچائی کہ وہ اسے "کم بخت" اور "مردود" کہنے پر مجبور ہوئے۔ وہ والدہ کو بلیک میل کرنے کے لئے nasty قسم کے خط لکھتا اور اقبال کے بقول، وہ ان کے لئے ایک مستقل دردِ سر (Constant source of pain) بنا رہا۔ اپنی ہمشیرہ کریم بی بی سے بدسلوکی کا مرتکب ہوا۔ والد کے نام پر سر اکبر حیدری اور انگلستان کے بعض لوگوں سے قرض لیتا رہا۔ اقبال نے والد ماجد شیخ نور محمد سے شکوہ کیا: "گزشتہ سالوں میں بھی وہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ اگر آپ کے پاس ان کا بیان کروں تو آپ کو سخت تکلیف ہوگی۔ " (۹ جون ۱۹۱۸ء)۔ معلوم ہوتا ہے آفتاب اور ان کی والدہ نے، اقبال کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا، جس کی وجہ سے دوری اور زیادہ ہوتی گئی۔ اقبال، ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں، اپنے طرزِ عمل کے دفاع میں اور اپنے قطع تعلق کا جواز پیش کرتے ہوئے والد صاحب کو لکھتے ہیں کہ "عقل مند آدمی

ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو بچانے اور اسے محفوظ رکھنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے"........اس طرح کی بہت سی باتیں خاصی حد تک علامہ اقبال کے طرزِ عمل کا جواز فراہم کرتی ہیں۔ پہلی بیوی کے سلسلے میں یہ ان کی منصف مزاجی ہے کہ وہ عمر بھر انھیں ماہانہ خرچ بھیجتے رہے۔ آفتاب اقبال 'کو علامہ نے محروم الارث کر دیا۔ کیا ان کا یہ طرزِ عمل درست تھا؟ یہ امر قابلِ بحث و تحقیق ہے۔ معاملہ اس قدر سادہ نہیں ہے اور اس لئے راقم ڈاکٹر محمد منیر احمد صاحب کی رائے سے متفق نہیں ہے کہ:"اقبال کا یہ عمل درست نہ تھا"..... شیخ عطا محمد ایک مغلوب الغضب اور غیر متوازن شخصیت کے مالک تھے' اس لئے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیا تصویر پیش کر کےص دیوبند سے فتویٰ منگایا اور پھر آفتاب کو اکسایا کہ وہ اپنے والد کے خلاف عدالت میں دعویٰ کر کے انھیں دنیا میں رسوا کرے۔ والدۂ آفتاب قابلِ تحسین ہیں کہ انھوں نے بیٹے کو اس سے باز رکھا۔ پھر جب علامہ کا انتقال ہوا تو (آفتاب عمرِ عزیز کے چہل سال پورے کر چکے تھے) ان کے رویے میں بھی تبدیلی آئی' اور آخر عمر میں تو وہ اپنے والد کو خراجِ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ علامہ اقبال ایک بڑے آدمی تھے' اور بڑے آدمیوں کی زندگی کا ہر ہر ورق زیرِ بحث آتا ہے اس لئے اقبال کی ازدواجی زندگی بھی اظہار و خیال اور بحث و تمحیص کا موضوع رہے گی۔ ضروری تو یہ ہے کہ اس ضمن میں ہر طرح کے تعصبات اور ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر کلام کیا جائے۔ ڈاکٹر محمد منیر صاحب کا تعلق بھی گجرات سے ہے' بایں ہمہ انھوں نے تنقید و تجزیے میں خاصے توازن و عتدال سے کام لیا ہے۔ طرفداری کے بجائے' اس سخن فہمی پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد منیر احمد کا ذوقِ جستجو بھی قابلِ داد ہے۔ انھوں نے وسیع ماخذ تک رسائی حاصل کر کے انھیں کھنگالا اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات' اقبالیات پر مزید تحقیق اور تفصیلی تنقیدی مطالعوں کی بنیاد بن سکتی ہیں' مثلاً: تاریخِ اقبالیات میں گجرات سے متعلق بعض اقبال شناسوں (شیخ عطاء اللہ' حکیم محمد حسن قرشی' پروفیسر محمد فرمان' ملک حسن اختر وغیرہ) کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا مقام و مرتبہ یا بعض مترجمینِ اقبال (جیسے: قریشی احمد حسین قلعداری' پروفیسر شریف کنجاہی اور سیّد اکبر علی شاہ) کے ترجموں کا معیار وغیرہ وغیرہ........اس طرح یہ کتاب اقبالیات کے بہت سے دوسرے تحقیق کاروں کے لئے معاون و مفید ہو گی۔

ص دیکھئے صفحہ ۳۷۵

اس سے قبل ، بعض دوسرے موضوعات پر ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کی علمی اور تحقیقی کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں ، جیسے:

خفتگانِ خاکِ گجرات ۱۹۹۶ء
احوال و کلام مولوی نورالدین انوؔر ۱۹۹۷ء
گجرات کے پنجابی نعت گو شعرا ۱۹۹۷ء
گجرات کے اردو نعت گو شعرا ۱۹۹۸ء

ان کے ہاں "گرم دمِ جستجو" کی کیفیت نظر آتی ہے اور ایک خاص ولولۂ تحقیق کا احساس ہوتا ہے ۔ اب وہ اقبالیات کی جانب متوجہ ہوئے ہیں ۔ موصوف جیسے ذہین اور باصلاحیت تحقیق کار کا یہ اعتنا ، اقبالیات کے مستقبل کے لئے فالِ نیک ہے ۔ امید ہے ان کی زیرِ نظر کتاب کا گرم دلی سے خیر مقدم کیا جائے گا۔

رفیع الدین ہاشمی
۶ ذی الحج ۱۴۱۸ھ
۴ اپریل ۱۹۹۸ء

شعبۂ اردو
یونی ورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من آنم کہ من دانم

(دیباچہ اَز مصنف)

فکرِ اِقبال سے میرا تعارف آٹھویں جماعت میں میرے عزیز ترین اُستاد جناب چودھری اَکبر علی نے کروایا تھا۔ انہوں نے "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" پڑھنے کو دی اور مناسب راہنمائی بہم پہنچاتے رہے "یومِ اِقبال" پر تقریریں لکھ کر دیتے رہے اور یوں میں اِقبال کے قریب ہوتا گیا۔ میٹرک کے بعد اِقبال پر کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا تو گویا اِقبال کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ زمیندار کالج میں مجھے سیف الرحمٰن سیفی جیسے بلند پایہ شاعر و ادیب کی راہنمائی اور شفقت حاصل رہی، جنہوں نے میرے اَدبی ذوق کو جلا بخشی۔ یہاں پر بھی اِقبال میرا پسندیدہ موضوع رہا۔ تقاریر کا سلسلہ ہوتا، مضمون نویسی کا مقابلہ ہوتا یا کالج مجلّہ "شاہین" میں لکھنے کا موقع ہوتا، میری اولین ترجیح اِقبال" ہی رہا۔ پرنسپل چودھری فضل حسین کی حوصلہ افزائی سے میرے "اِقبالی ذوق" میں مزید بہتری پیدا ہوئی اور اِقبال میرے اَدبی ذوق کا محور بن گیا۔ قیام لاہور (۱۹۸۶ء۔۱۹۹۳ء) کے دوران کتبِ اِقبالیات کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اِقبال" کے گجرات سے تعلق کی تفاصیل کا علم ہوا اور پھر میں نے اِس موضوع پر مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

چنانچہ ۱۹۸۹ء سے اِس موضوع پر کام جاری رہا اور آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ قطرے سے گہر ہونے تک جو مراحل طے کرنے پڑے ان کی تفصیل زیادہ اہم نہیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ کتاب کسی بڑی لائبریری کے ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ قلم کے ساتھ ساتھ قدم کی حرکت سے بھی کام لیا گیا ہے۔

"اِقبال اور گجرات" کے موضوع پر جوں جوں تحقیقی سفر جاری رہا، یہ احساس شدت اختیار کرتا گیا کہ کاش یہ کام آج سے چالیس برس قبل ہو چکا ہوتا جب اِس کہانی کے بہت سے کردار ابھی زِندہ تھے۔

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اسکا اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

مگر قدرت نے یہ کام میرے لئے مقدر کر رکھا تھا، کسی اور کو کیسے خیال آتا۔ "اِقبال اور گجرات" کا موضوع بظاہر سیدھا سا ہے لیکن اِقبال" کی زِندگی کے چند نازک اور متنازعہ

پہلوؤں سے متعلق ہونے کی وجہ سے بہت مشکل اور نازک ہے۔ مگر اِس پر لکھنے کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اِقبال کی سوانح میں بہت سے سوالوں کا تعلق اِس موضوع سے ہے۔ اِقبال کس کے ہاتھ پر بیعت تھے؟ اِن کی پہلی شادی کب اور کن حالات میں ہوئی؟ اِن کے سسرالی کون تھے؟ اِن کے سسر کیا اتنے گئے گزرے تھے کہ امتحان کے لئے آنے والے لڑکے کو ایک نظر دیکھ کر اپنی بیٹی دے دی؟ وہ کون سا غم تھا جو اِقبال کو راتوں کو سونے نہیں دیتا تھا اور تنہائی میں رلاتا تھا۔ کونسا کرب تھا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اِقبال شراب نوشی میں پناہ لینا چاہتے تھے اور ملک چھوڑنے پر مجبور تھے؟ وہ اَپنے فرزندِ اول سے کیوں نالاں رہے؟ اِن سوالوں اور بہت سے دوسرے ایسے ہی سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لئے اِس موضوع پر لکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ اِس سے پہلے بھی اِس موضوع کو چھیڑا گیا ہے لیکن اِس نازک موضوع سے عہدہ برا ہونے کے لئے جس سنجیدگی اور تفصیل کی ضرورت تھی اِس کے ساتھ کسی نے کام نہیں کیا۔ اِس موضوع پر یا اِس سے متعلقہ تحریروں میں بے شمار اغلاط موجود ہیں۔ مثلاً

(1) سید حامد جلالی نے ۱۹۶۷ء میں "علامہ اِقبال اور اِن کی پہلی بیوی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں اِقبال اور اِن کی زوجۂ اولیٰ کے اختلافات اور علیحدگی پر یک طرفہ فیصلہ سنایا گیا ہے۔ انداز علمی ہے نہ تحقیقی اور غیر ضروری مواد کی بھرمار ہے۔ چند اغلاط ملاحظہ ہوں۔

⇦ "یہ مقدس بیوی سرزمینِ حجاز میں پیدا ہوئیں" صفحہ ۲۲
(حقیقت یہ ہے کہ وہ گجرات میں پیدا ہوئیں -)

⇦ "آفتابِ اِقبال لاہور میں پریکٹس کر رہے تھے۔ آپنے والد بزرگوار کی شدت علالت کی خبر سے متاثر ہو کر مزاج پرسی کی غرض سے حضرتِ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے" صفحہ ۴۲
(آفتاب اِقبال نے ۱۹۴۵ء میں پریکٹس شروع کی جبکہ اِقبال ۱۹۳۸ء میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے)

⇦ "مسٹر اَکبر حیدری نے اِس تقریر پر آپ (آفتاب) کو ایک ہزار پونڈ اِنعام دیا" صفحہ ۸۶
(صرف ایک سو نوے پونڈ ملے تھے وہ بھی قرضِ حسنہ کے طور پر)

⇦ شیخ عطا محمد اور کریم بی بی کی تاریخ ہائے وفات غلط ہیں' ریٹائرمنٹ اور خطاب ملنے کے سال بھی غلط ہیں۔ صفحہ ۲۱ تا ۲۴

(2) "اِقبال اور گجرات" کے موضوع پر پہلی کوشش جناب پروفیسر حامد حسن سید نے کی تھی۔

اِن کا مضمون زمیندار کالج کے مجلّہ شاہین ۱۹۷۸ء (اقبال نمبر) میں شائع ہوا تھا اِس مضمون میں اکثر بنیادی اطلاعات درست نہیں مثلاً

⇦ اِقبال کے خسر کا نام "عطاء اللہ بٹ کشمیری" لکھا ہے صفحہ ۱۵
(اِن کا نام شیخ عطا محمد تھا)

⇦ "اِن کی سروس کا زیادہ تر حصہ کابل میں گزرا" صفحہ ۱۵
(وہ کبھی کابل میں نہیں رہے)

⇦ " آفتاب اِقبال نے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کی حویلی کو یادگار اِقبال نہیں بننے دیا" صفحہ ۱۵
(یہ درست نہیں۔ اِس حویلی کو ڈاکٹر عطا محمد کے پوتے نے خود بیچ دیا تھا)

⇦ "معراج بیگم کا اِنتقال بچپن میں ہوا" صفحہ نمبر ۱۵ (۱۹ برس کی عمر بچپن نہیں ہوتی)

⇦ "پروفیسر اکبر منیر' اِقبال کے ہم جماعت تھے" صفحہ نمبر ۲۱ (وہ اِقبال سے ۲۰ سال جونیئر تھے)

⇦ لدھیانہ والی بی بی کا اِنتقال ہوا تو اِقبال نے حضرت قاضی سلطان محمود کو یاد کیا کہ وہ جنازے کی نماز پڑھاتے" صفحہ نمبر ۲۵
(بی بی کا اِنتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا جبکہ قاضی صاحب ۱۹۱۹ء کو فوت ہو چکے تھے)

⇦ "مولانا دیدار علی نے کفر کا فتویٰ جاری کیا جس پر متعدد علمائے کرام کے دستخط ہوئے حضرت قاضی سلطان محمود نے دستخط سے اِنکار کیا اور بصراحت لکھا کہ حضرت محمد اِقبال مسلمان باایمان ہیں" صفحہ ۲۵
(فتویٰ ۱۹۲۵ء میں حضرت قاضی صاحب کی وفات سے چھ سال بعد جاری ہوا تھا!)

(3) سید نذیر نیازی نے "دانائے راز" میں ازدواج کے عنوان سے علامہ کی پہلی شادی پر بحث کی ہے اِس کے ۱۹۸۸ء کے ایڈیشن میں سے چند غلطیاں ملاحظہ ہوں۔

⇦ "ابو صاحب (سردار عبدالغفور درانی) اِقبال کے ہم جماعت تھے" صفحہ ۲۵۱
(ابو صاحب شاگرد تھے)

⇦ "ڈاکٹر عطا محمد ۱۸۷۹ء میں وائسرائے کے اعزازی سرجن مقرر ہوئے" صفحہ ۴۷
(۱۸۹۹ء درست سنہ ہے)

⇦ "ڈاکٹر عطا محمد نے ۱۹۲۷ء میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی" صفحہ ۴۷
(۱۹۲۲ء میں ۶۶ برس کی عمر میں ان کا اِنتقال ہوا)

⇦ "۱۸۹۸ء میں آفتاب اِقبال پیدا ہوئے پھر معراج بیگم" صفحہ ۷۶

(معراج ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئیں' آفتاب اِن کے بعد)

⇦ "شیخ محمد مسعود کا افسوس جوانی میں ہی اِنتقال ہو گیا" صفحہ ۷۸
(۵۹ برس کی عمر جوانی نہیں ہوتی)

(4) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کی کتاب "اقبال کی ابتدائی زندگی" مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۶ء میں بھی سسرالی خاندان کے بارے میں فراہم کردہ معلومات میں کئی غلطیاں در آئی ہیں مثلاً

⇦ ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی تاریخ پیدائش ۱۸۵۰ء دی گئی ہے۔ صفحہ ۱۶۸۔
(درست تاریخ پیدائش ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء ہے۔)

⇦ "۲۴ مئی ۱۸۸۸ء کو ڈاکٹر شیخ عطا محمد کو خان بہادر کا خطاب عطا ہوا" صفحہ ۱۷۰۔
(صحیح تاریخ ۲۴ مئی ۱۸۸۹ء ہے۔)

⇦ وفات کا سال ۱۹۲۳ء بعمر ۶۳ برس لکھا ہے۔ صفحہ ۱۷۲۔
(اصل تاریخ ۱۴ دسمبر ۱۹۲۲ء بعمر ۶۷ برس ہے۔)

⇦ "نواب بی بی کا گجرات میں حافظ فضل احمد سے بیاہ ہوا پھر عنایت اللہ سے نکاحِ ثانی کر لیا" صفحہ ۱۷۳۔

(ایک ہی نکاح عنایت اللہ سے ہوا۔ حافظ فضل احمد 'نذیر احمد بھٹی کے والد تھے۔ نذیر احمد سے نواب بی بی کی سب سے چھوٹی بہن شہزادہ بیگم کا پہلا نکاح ہوا تھا۔)

⇦ "کریم بی بی ۱۸۷۷ء میں گجرات میں پیدا ہوئیں" صفحہ ۱۷۷۔
(کریم بی بی ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو گجرات میں پیدا ہوئیں)

⇦ "معراج ۱۹۱۴ء میں چل بسی" صفحہ ۱۷۹۔
(معراج کا انتقال ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہوا تھا)

(5) ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے "اِقبال اور گجرات" کے عنوان سے مقالہ لکھا جسے ہم پہلی سنجیدہ کوشش کہہ سکتے ہیں یہ "اِقبالیات" جنوری مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اِس میں بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً

⇦ "ابو صاحب کے خانوادے کے سربراہ کا نام محمد افضل درانی اور خیل ماموں زئی بیان کی گئی ہے" صفحہ ۲۲۵
(سربراہ محمد حیات خاں درانی تھے اور ان کی خیل پوپلزئی ہے)

⇦ "پروفیسر آکبر منیر اپنی مثنوی "مہرِ منیر" کی وجہ سے مشہور ہیں" صفحہ ۲۲۷
(بغیر شائع ہوئے یہ کیسے شہرت کا سبب بن گئی؟)

- ڈاکٹر عبدالقیوم ملک کو گجراتی ظاہر کیا گیا ہے۔ صفحہ ۲۲۶
(وہ گجراتی نہیں ہیں جو کوائف دیئے گئے ہیں وہ ڈاکٹر عبدالحق کے ہیں)
- چودھری نیاز احمد کو خوشی محمد ناظر کا بھائی لکھا ہے۔ صفحہ ۲۲۵ (وہ ناظر کے بھتیجے تھے)
- ملک محمد الدین مدیر "صوفی" کا وطن برنالہ لکھا ہے صفحہ ۲۲۵
(جبکہ انہوں نے اپنی خود نوشت میں "مہوٹہ کلاں" لکھا ہے)
"اکبر منیر اقبال کے شاگرد تھے" صفحہ ۲۲۷
(اکبر منیر اقبال کے شاگرد نہیں تھے عبداللہ چغتائی نے بھی غلط لکھا ہے)
- "اقبال' آفتاب کو بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر ننھیال والے اس کے لئے تیار نہ ہوئے" صفحہ ۲۲۹
(آفتاب کو علامہ نے خود گھر سے نکال دیا تھا)

مجھے اعتراف ہے کہ میری فراہم کردہ ساری کی ساری معلومات بھی حتمی نہیں کیونکہ تحقیق میں بہت سی باتیں حتمی نہیں ہوتیں مگر میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ علمی تاریخی تحقیقی اور عقلی معیار پر پوری نہ اترنے والی معلومات سے اجتناب کیا جائے۔ کسی بات کو محض اس بنا پر قبول نہیں کیا کہ وہ کسی "بڑے" آدمی نے کہی ہے یا وہ اقبال کے بہت قریب رہا ہے۔ بلکہ اس قول پر عمل کیا ہے "خذ ما صفا ودع ما کدر" (جو ٹھیک ہے لے لو جس میں گڑبڑ ہے چھوڑ دو) "مکھی پہ مکھی مارنے" اور "لکیر کا فقیر" بننے سے پرہیز کیا گیا ہے کیونکہ اندھی تقلید اور عملی تحقیق کی کمی ہی ہماری تحقیق کے معیار کی پستی کا سبب ہے۔ بڑے سے بڑا صاحبِ علم بھی غلطی کر سکتا ہے' ٹھوکر کھا سکتا ہے' کسی نہ کسی لاعلمی یا تعصب یا غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے اس لئے عالم کے ادب کے ساتھ ساتھ علم کا احترام ضروری ہے اور تقلید کی بجائے تحقیق کا راستہ بہتر ہے۔

اس کتاب کے چھے ابواب میں سے تیسرا باب اہم ترین ہے۔ اس میں اقبال" کی پہلی شادی' اولاد' سسرالی خاندان' اس شادی کی ناکامی کی وجوہات پر پہلی مرتبہ تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے اور بہت سی نئی معلومات پہلی دفعہ فراہم کی جارہی ہیں۔ اس موضوع پر مزید تفصیل میں جانے سے رکاوٹ وہی شخصیت پرستی رہی ہے جس کی طرف مولانا شبلی نے اشارہ کیا ہے۔

"ہمارے زمانے میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں' ان کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں۔ لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کرتے ہیں۔ جس چیز نے ان کو

اظہارِ حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخصیت پرستی ہے۔ جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اِس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک بہت بڑا ضرر ہے" (موازنہ انیس و دبیر)

اِس موضوع پر لکھنے سے رکاوٹ کی وجہ یہ خیال بھی تھا کہ

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان افسانوں کو نہ چھیڑ

اور لکھتے ہوئے یہ احتیاط بھی دامن گیر تھی کہ

وصل کے اِسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دِل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

مگر اقبال کے ہی اِس شعر نے ہمت بندھائی کہ

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

چوتھے باب میں اہالیان گجرات سے اِقبال کے مراسم کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اَحباب کی درجہ بندی یقیناً ایک کٹھن کام ہے لیکن مراسم کی نوعیت کو دستیاب معلومات کی روشنی میں پرکھ کر یہ درجہ بندی کی گئی ہے۔ اِس باب میں ابو صاحب 'ناظر' قاضی فضل حق اور سید حبیب سے اِقبال کے مراسم کی تفصیلات پہلی دفعہ منظرعام پر آرہی ہیں۔ ماضی میں پروفیسر اَکبر منیر کو کبھی اِقبال کا ہم جماعت اور کبھی شاگرد ظاہر کیا گیا۔ عبداللہ چغتائی صاحب نے اِنہیں ایم اے فارسی ظاہر کیا اور اِقبال کا نام ان کے اساتذہ میں لکھ دیا حالانکہ انہوں نے ایم اے فارسی کیا ہی نہیں بلکہ عربی میں ایم اے کیا تھا۔ اِس باب میں شامل اَکبر منیر کے خود نوشت حالات نے ایسے اندازوں اور غلطیوں کی اصلاح کر دی ہے۔ اَکبر منیر اگرچہ آبائی طور پر گجراتی نہیں تھے لیکن طویل عرصہ گجرات میں رہنے کی وجہ سے "گجراتی" کہلانے لگے تھے۔ جیسے اِقبال لاہوری ہو گئے تھے۔ اِس باب میں رسم و راہ اور ملاقاتی' اِقبالیات میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔ مکتوب الیہم کے ضمن میں ماسٹر طالع محمد اور چودھری محمد احسن کے حالات بھی اِس سے پہلے صیغہ راز میں تھے۔ اِن لوگوں کے مختصر حالات زِندگی دینے کا مقصد ان کا تعارف کرانا اور ان کے حالات کو محفوظ کرنا ہے۔

سابق ضلع گجرات کی تقسیم سے ہماری تحقیق زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ منڈی بہاالدین سے تعلق رکھنے والے ملک محمدالدین اور سید نور قادری کا آبائی تعلق موجودہ ضلع گجرات سے ہی تھا۔

مجھے اِن امور کا اعتراف بھی کرنا ہے جو میں نہیں کر سکا مثلاً شیخ نور محمد کے ننھیالی خاندان (جلالپور جٹاں) کا سراغ نہیں لگایا جاسکا۔ محتاط اندازہ ہے کہ یہ خاندان اب ختم ہو چکا ہے۔ مولا بخش واصف کے نام خطوط دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئے اور مولوی محمد حسین (اِقبال اور سردار بیگم کے نکاح خواں) کے حالات بھی کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکے

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے اس کام میں مقدور بھر محنت کی ہے اور احتیاط بھی' اس کے باوجود مجھے دعوی نہیں کہ یہ کتاب غلطیوں سے پاک ہے۔ اصحاب علم و تحقیق سے گزارش ہے کہ میری غلطیوں اور فروگذاشتوں سے ضرور مطلع کریں میں اِن کا احسان مند بھی ہوں گا اور ضروری اصلاح بھی کر دی جائے گی۔

مجھے "اِقبال اور گجرت" کے سلسلے میں جن لوگوں سے مددؔ لینے کی ضرورت پیش آئی اِن میں سے اکثر کا رویہ نہایت حوصلہ شکن اور مایوس کن تھا۔ کچھ کا اِس لئے کہ وہ کچھ جانتے نہیں تھے اور بعض کا اِس لئے کہ وہ جانتے تو بہت کچھ تھے مگر کسی دوسرے کو بتا کر فائدہ پہنچانے کا ظرف نہیں رکھتے تھے۔ کچھ نے جان بوجھ کر ادھوری معلومات فراہم کیں اور کچھ نے مجھے گمراہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

تاہم کچھ مہربان ایسے تھے جنہوں نے واقعی میرے ساتھ تعاون کیا اور کسی نہ کسی شکل میں مثبت راہنمائی فراہم کی۔ کبھی زبانی معلومات سے' کبھی کتب کی فراہمی سے اور کبھی میرے کام کو سراہتے ہوئے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اِن حضرات میں سرفہرست جناب شریف کنجاہی ہیں جنہوں نے بعض ایسے امور کی نشاندہی کی جن سے شاید بہت کم لوگ واقف تھے۔ ڈاکٹر احمد حسین قریشی کی خدمت میں اِس کتاب کے سلسلے میں مسلسل ڈیڑھ دو برس حاضری دیتا رہا۔ مگر افسوس یہ حاضریاں زیادہ سودمند ثابت نہ ہو سکیں... البتہ ایک دو معاملات میں انہوں نے ضرور مدد کی جس کے لئے ممنون ہوں۔

بابا راز گجراتی' عارف علی میر ایڈووکیٹ' میاں اشرف تنویر ایڈووکیٹ' سید نور محمد قادری مرحوم' ملک ضیاء الدین ایڈووکیٹ لاہور' حکیم ضیاء الرحمٰن صاحب' چودھری فتح محمد عزیز ایڈووکیٹ' محترمہ رشیدہ آفتاب اِقبال صاحبہ (کراچی)' چودھری شاہد وڑائچ' چودھری محمد اشرف (عالمگڑھ) علامہ اختر فتح پوری' سید فخر تراب' سید حسن عسکری' سید حسن توقیر (گجرات)' جناب ادریس درانی (گجرات) نے بھی مختلف ذرائع سے تعاون کیا۔ اِن سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

اپنے دوست محمد اطہر مسعود (لاہور) کا شکریہ بھی واجب ہے انہوں نے دور رہ کر نزدیک والوں سے زیادہ مستعدی سے تعاون کیا۔ نامور ماہرِ اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین

ہاشمی نے مسودے کو بغور پڑھا' اغلاط کی نشان دہی کی 'مفید تجاویز دیں اور پیش لفظ لکھا۔ ان کے لیے بھی دِل سے دعا نکلتی ہے۔ جناب خالد حسین مرزا پروپرائیٹر رین بو کمپوزرز گجرات کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو فنی لحاظ سے بہتر بنانے کے لئے بہت محنت کی۔

(ڈاکٹر) محمد منیر احمد سلیچ
لوراں۔ گجرات

باب اول
اقبالؒ کے بزرگ اور گجرات

- اقبالؒ کے دادا اور گجرات
- اقبال کے والد اور گجرات
  - شیخ نور محمد کا ننھیال
  - شیخ نور محمد کا مرشد خانہ
  - شیخ نور محمد اور ڈاکٹر شیخ عطا محمد
  - شیخ نور محمد اور سید چراغ شاہ

اِقبال کے دادا اور گجرات

گجرات سے اِقبال کے تعلق کی داستان ان کے دادا کے زمانے یا شاید اِس سے بھی قدیم دور سے شروع ہوتی ہے' جب کشمیر سے ہجرت کر کے آنے والوں کے پنجاب میں دو سب سے اہم ٹھکانے سیالکوٹ اور جلالپور جٹاں ہوا کرتے تھے۔ آج بھی اِن دو شہروں میں کشمیریوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ جو وقتاً فوقتاً کشمیر کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔

اِقبال کے بزرگوں نے جب کشمیر سے ہجرت کی تو اِن کے کچھ عزیز سیالکوٹ کی بجائے جلالپور جٹاں میں آکر آباد ہو گئے۔ بعد میں اِن سے مزید رشتے داری ہو گئی۔ یہ رشتے داری اِقبال کے دادا شیخ محمد رفیق کی جلالپور جٹاں (ضلع گجرات) میں دوسری شادی کی صورت میں ہوئی۔ سیالکوٹ اور گجرات کو ملانے والی سڑک جلالپور جٹاں سے ہو کر گزرتی ہے اور سیالکوٹ سے جلالپور ۴۰ کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں۔

اِقبال کے دادا شیخ محمد رفیق انیسویں صدی کے شروع میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ وہ کشمیری لوئیوں اور دھسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ سیالکوٹ کے محلہ کھٹیکاں میں رہتے تھے۔ اِن کی پہلی شادی سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اِس بیوی کا شادی سے کچھ عرصہ بعد بغیر کسی اولاد کے اِنتقال ہو گیا۔ نسل کو جاری رکھنے کے لئے انہوں نے دوسری شادی کا ارادہ کیا اور ۱۸۳۰ء کے قریب اِن کی دوسری شادی جلالپور جٹاں کے ایک کشمیری خاندان کی دوشیزہ سے ہو گئی۔ یہ خاندان کیسا تھا؟ اِس کے اخلاف کیا ہوئے؟ اِس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ غالب امکان ہے کہ یہ خاندان مٹ چکا ہے ورنہ کسی نہ کسی حوالے سے اِس کا کوئی سراغ نکل آتا۔

ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا قیاس ہے کہ شیخ رفیق کی شادی جلالپور کے کسی رشی خاندان میں ہوئی ہو گی کیونکہ یہ خاندان نسبتاً متمول ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ایسا ممکن تو ہے مگر متمول ہونے کی بنیاد پر یہ شادی ہونا درست نہیں کیونکہ ایک متمول خاندان اپنی دوشیزہ کا رشتہ ایک متوسط بلکہ غریب خاندان کے ادھیڑ عمر کے اس مرد کو کیوں دے گا جو دوسری شادی کر رہا ہو؟

شیخ رفیق کی یہ بیوی بہت خوبصورت تھیں اور "گجری" کے نام سے مشہور تھیں۔ اِس

بیوی کے بطن سے یکے بعد دیگرے دس بیٹے پیدا ہوئے مگر سب بچپن میں ہی انتقال کر گئے۔ شیخ نور محمد گیارھویں اولاد تھے۔ انکی پیدائش سے قبل بہت سی منتیں مانی گئیں اور بہت سے پیروں فقیروں سے دعائیں کرائی گئیں۔ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کی درازی عمر کے لئے مزید تدابیر کی گئیں چڑھاوے چڑھائے گئے اور منتیں پوری کی گئیں۔ ٹونے ٹوٹکے کئے گئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ ان کی ناک میں ایک چھوٹی سی "نتھ" ڈالی گئی تاکہ وہ لڑکی نظر آئیں اور موت کا فرشتہ دھوکہ کھا جائے! اور شاید اس طرح وہ محفوظ رہیں۔ اسی "نتھ" کی وجہ سے ان کا نام "نتھو" پڑ گیا۔ جو تمام عمر ان کے اصل نام پر غالب رہا۔ شیخ نور محمد نہ صرف زندہ رہے بلکہ ۹۵ برس کی عمر پائی۔ ان کے بعد شیخ غلام محمد پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد والد کے ساتھ کام میں لگ گئے۔ شیخ غلام محمد نے تعلیم حاصل کی اور محکمہ نہر میں اوورسیر ہو گئے۔ روپڑ میں تعینات تھے جبکہ ان کے والد شیخ رفیق انہیں ملنے گئے۔ وہاں ہیضہ کی وبا پھیلی اور شیخ رفیق چل بسے اور وہیں دفن ہوئے۔(۱)

سید نذیر نیازی (۱۹۰۰-۱۹۸۵) نے علامہ اقبال کی زبانی شیخ محمد رفیق کا گجرات میں انگریزوں کی طرف سے سکھوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینا بیان کیا ہے۔ (۲) تاہم اس بات کی کسی اور حوالے سے تصدیق یا تردید نہیں ہو سکی۔ شیخ رفیق کاروبار کرتے تھے لیکن ممکن ہے وہ کسی دور میں فوج میں بھی ملازم رہے ہوں۔ لیکن یہ بات مد نظر رکھتے ہوئے کہ انگریزوں اور سکھوں کی گجرات میں جھڑپوں (مئی ۱۸۴۸ء اور فروری ۱۸۴۹ء) کے وقت شیخ رفیق کی عمر ۶۰ سال سے زائد ہو گی۔ ان کا لڑائی میں حصہ لینا زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔

اِقبال کے والد اور گجرات

اِقبال کے والد محترم شیخ نور محمد کے لئے گجرات "مقدس رشتوں کی سرزمین" تھا۔ گجرات کے ایک قصبے جلالپور رجتاں میں ان کی جنت' ان کی والدہ ماجدہ پروان چڑھی تھیں۔ گجرات کے ایک اور قصبے اعوان شریف میں ان کے ہادی و مرشد کا ڈیرہ تھا۔ اِسی شہرِ شاہدولہ میں اِن کے سمدھی ڈاکٹر عطا محمد رہتے تھے۔ جن کی صاحبزادی کو انہوں نے اپنی بہو بنایا تھا۔ اور یہی سرزمین ان کے محرمِ راز دوست سید چراغ شاہ کا آبائی وطن تھی۔

شیخ نور محمد ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ سیالکوٹ میں شیخ محمد رفیق کے گھر پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل نہ کرسکے مگر قدرت نے اِنہیں ذہن رسا عطا کر رکھا تھا۔ بچپن سے والد کے ساتھ کاروبار میں شریک رہے پھر پارچہ دوزی کرنے لگے۔ برقعوں کی ٹوپیاں اور کلاہ سینے میں خصوصی مہارت اور شہرت رکھتے تھے اور "بابا نتھو ٹوپیاں والا" کے نام سے مشہور تھے۔ تصوف کی طرف رغبت شروع سے تھی اور اہلِ اللہ اور اہلِ علم و دانش سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اصحابِ علم و فضل کی محفلوں میں شریک ہوتے اور آپنے ہاں بھی علمی اور صوفیانہ مجالس کا اہتمام کرتے جہاں صوفیاء اور فضلاء کی کتب پڑھی جاتیں اور سلوک کی منازل پر بحث ہوتی۔ علماء اور صوفیاء سے محبت کی وجہ سے شریعت اور طریقت دونوں کے رموز سے آگاہ تھے ان کی زِندگی تصوف' توکل اور یادِ خدا سے عبارت تھی۔ ان کے ہمعصر انہیں "ان پڑھ فلسفی" کہتے تھے۔

شیخ نور محمد سرخ و سپید رنگت اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ صوفیانہ طرزِ زِندگی کے پیروکار' شب بیدار' بردبار' عالی ظرف اور درگزر کرنے والے' نیک اور صلح جو' حلیم و متین اور سوز دروں سے مالا مال۔ اِقبال کی شخصیت کی تعمیر میں شیخ نور محمد کی شخصیت کے اِن اوصاف نے بنیادی کردار ادا کیا۔ شیخ صاحب خوش قسمت اِنسان تھے کہ آپنے عظیم فرزند کو عزت اور ناموری کے بلند ترین مقام پر دیکھ کر دُنیا سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں وفات پائی اور قبرستان امام صاحب میں آسودۂ خاک ہوئے۔

ننھیال:

جلالپور جٹاں کا قدیم قصبہ (جو پارچہ بافی کی صنعت کی وجہ سے اور اپنے منفرد دھسوں کی بنا پر مشہور ہے) شیخ نور محمد کا ننھیال تھا۔ بچپن میں وہ آپنے والدین کے ساتھ یہاں آتے رہے اور آپنے بڑھاپے میں جب اعوان شریف حاضری دیتے تھے تو بھی جلالپور جٹاں آیا کرتے تھے۔ لیکن لگتا ہے کہ شیخ نور محمد کے ننھیال اِسی دور میں معدوم ہو گئے تھے کیونکہ کسی کتاب، خط یا انٹرویو وغیرہ میں ان کا کوئی ذِکر نہیں ملتا۔

مرشد خانہ:

شیخ نور محمد گجرات کے ایک سرحدی قصبے اعوان شریف (یا آوان شریف) میں حضرت قاضی سلطان محمودؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے اور آخری عمر تک ان کے ہاں حاضری دیتے رہے۔ اگرچہ یہ بات اکثر قریبی ذرائع سے تصدیق شدہ ہے تاہم اِس سلسلے میں ایک اور بزرگ سائیں عبداللہ قادری (گوجرانوالہ) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

آیئے درج ذیل بیانات کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں:

(۱) ڈاکٹر نظیر صوفی (علامہ اِقبال کے بڑے بھائی کے داماد) لکھتے ہیں:

"علامہ علیہ الرحمتہ کے والد شیخ نور محمد نتھو مرحوم سلسلہ قادریہ میں منسلک تھے۔ ان کے مرشد سائیں عبداللہ قادری آپنے وقت کے سیف زبان، صاحب کرامت بزرگ تھے۔ وہ خواجہ عمر بخش گوجرانوالہ کے خلیفہ اول تھے۔ ان کا مزار دارا سائیں عبداللہ قادری (نزد لیڈی اینڈرسن گرلز ہائی سکول) میں ہے۔ (۳)

(۲) مولانا عبدالمجید سالک (۱۸۹۵-۱۹۵۹) لکھتے ہیں:

"پیر جماعت علی شاہ علی پوری نے مئی ۱۹۳۵ء میں بیان کیا کہ اِقبال نے راز داری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں آپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں۔ اِقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے۔ وہ اِنہی سے بیعت تھے۔ اِن کا سلسلہ قادریہ تھا" (۴)

(۳) صاحبزادہ میاں محمد بشیر قادری عباسی لکھتے ہیں:

"شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اِقبال کے والد ماجد شیخ نور محمد عرف شیخ نتھو سیالکوٹی حضرت سائیں عبداللہ قادری کی بیعت سے مشرف تھے۔ جن مجذوب درویش کا تذکرہ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری نے کیا ہے وہ

سائیں عبداللہ قادری ہی تھے" (۵)

(۴) "سیرت اِقبال" کے مصنف محمد طاہر فاروقی (م۔۱۹۷۸) لکھتے ہیں:

"حضرت (پیر جماعت علی شاہ) فرماتے ہیں کہ اِقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت سالک درویش آیا کرتے تھے' وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا (۶)

(۵) ڈاکٹر سعید نور الدین نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے "اِسلامی تصوف اور اِقبال" میں سیرت اِقبال کے مذکورہ بالا بیان کو نقل کیا ہے" (۷)

(۶) شیخ اعجاز احمد (برادر زادہ اِقبال) رقم طراز ہیں:

"(میری موجودگی میں علامہ نے) فرمایا کہ ان کے والد کو گوجرانوالہ ضلع کے ایک بزرگ سے عقیدت تھی اور وہ انہیں ملنے جایا کرتے تھے" (۸)

اِن بیانات میں سے پہلے پانچ بیانات کا اِنحصار ایک ہی شخص (پیر جماعت علی شاہ) کے بیان پر ہے کسی اور ذرائع سے اِس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اِسی بیان سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائیں عبداللہ قادری اگر مجذوب تھے تو بیعت نہیں کرتے ہوں گے۔ کیونکہ مجذوب اکثر و بیشتر کسی کو بیعت نہیں کرتے۔

یہ عین ممکن ہے کہ شیخ صاحب کو سائیں عبداللہ قادری (۱۸۳۷۔۱۹۱۲) سے عقیدت ہو اور وہ اِنہیں ملنے جایا کرتے ہوں۔ اِس اعتبار سے شیخ اعجاز احمد کا مذکورہ بیان زیادہ مبنی بر حقیقت لگتا ہے۔ صاحبزادہ میاں محمد بشیر قادری عباسی نے مزید لکھا ہے کہ شیخ نور محمد' سائیں عبداللہ قادری کو ماہ محرم میں سیالکوٹ لے جایا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ سائیں عبداللہ اور ان کے مرشد خواجہ عمر بخش کی دعا اور خواجہ عمر بخش کے لعاب دہن کی برکت سے اِقبال" حکیم الامت" بنے۔ اِن سب روایات کو ہم "عقیدت کا کرشمہ" تو کہہ سکتے ہیں مگر اِن کی حیثیت "زیب داستان" سے زیادہ اِس وقت تک کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے جب تک کہ اِن روایات کے حق میں مستند شواہد پیش نہ کئے جائیں۔

اب آیئے تصویر کے دوسرے رخ کی طرف۔ یعنی شیخ نور محمد کی بیعت بدست حضرت قاضی سلطان محمود رحمتہ اللہ علیہ:

(۱) حضرت قاضی صاحب کے برادر زادہ اور جانشین جناب قاضی محبوب عالم صاحب بیان کرتے ہیں:

"میں نے کئی دفعہ بابا نتھو ٹوپیاں والے کو قاضی صاحب" کے پاس ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان کے دربار پر حاضری دیتے دیکھا ہے" (۹)

(۲) جناب علی احمد خاں آپنے ایک مضمون "قاضی سلطان محمود" صاحب" میں بحوالہ مولانا روح اللہ قادری لکھتے ہیں:

"علامہ اِقبال کے والد محترم' قاضی صاحب کے مرید تھے" (۱۰)

(۳) محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

"اِقبال کے والد شیخ نور محمد اور اور خود اِقبال نے بھی قادری سلسلے کے ایک بزرگ قاضی سلطان محمود" کے دست حق پرست پر بیعت کی ہوئی تھی" (۱۱)

(۴) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اپنی کتاب "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" میں لکھتے ہیں:

"گجرات اعوان شریف کے حضرت سلطان محمود (م: ۱۹۱۹ء) جب کبھی سیالکوٹ تشریف لاتے تو اکثر چراغ شاہ کے ہاں قیام فرمایا کرتے۔ یہیں شیخ نور محمد کی آپ سے شناسائی ہوئی اور بیعت کی" (۱۲)

(۵) سید نور محمد قادری (جن کے دادا سید چراغ شاہ' میر حسن اور شیخ نور محمد کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور جن کے والد' قاضی صاحب کے خلیفہ تھے) آپنے ایک مضمون "سلسلہ قادریہ میں اِقبال کی بیعت" میں ٹھوس شواہد کے ساتھ اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شیخ نور محمد' قاضی صاحب کے ہاتھ پر بیعت تھے" (۱۳)

(۶) ڈاکٹر جاوید اِقبال رقم طراز ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد' سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار اعوان شریف کے مرید تھے جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے" (۱۴)

ڈاکٹر جاوید اِقبال نے نور محمد قادری کے اِستفسار پر بتایا:

"یہ بات ہمارے خاندان میں بیشتر کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ کے والد حضرت قاضی سلطان محمود صاحب آوان شریف والوں سے بیعت تھے" (۱۵)

پھر ایک ملاقات میں ڈاکٹر جاوید اِقبال صاحب نے مزید صراحت کے ساتھ' سید نور محمد قادری کو بتایا:

"اِس بات (مذکورہ بالا) کے" راوی میرے حقیقی پھوپھا غلام رسول صاحب مرحوم وزیر آبادی ہیں۔ جو بڑے متدین اور ثقہ بزرگ تھے۔ لیکن اِس بات کی تصدیق ان کی زبانی اِس وقت ہوئی جب "زِندہ رود" کا مسودہ ترتیب پا چکا تھا۔ اب کتاب "زِندہ رود" کے دوسرے ایڈیشن میں اِس کا مفصل ذِکر ہو گا" (۱۶)

اِن بیانات کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ:

ا۔ مختلف ذرائع سے ایک ہی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔
ب۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنے خاندان کے بیشتر افراد کو علم ہونے کا ذکر کرکے یہ بات طے کر دی ہے کہ "شیخ نور محمد' قاضی سلطان محمود رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت تھے"

شیخ نور محمد اور ڈاکٹر شیخ عطا محمد:

شیخ نور محمد اور ڈاکٹر شیخ عطا محمد ایک دوسرے کے سمدھی تھے اور تازیست ایک دوسرے کی بے حد عزت و تکریم کرتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں اقبال کی منگنی سے لے کر ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر عطا محمد کی وفات تک دونوں کے درمیان محبت کا جذبہ موجود رہا۔ جب اقبال نے دوسری شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو شیخ نور محمد نے از حد کوشش کی کہ میری بیاہی ہوئی بہو کے ساتھ یہ زیادتی نہ ہو مگر وہ بے بس تھے۔ اقبال کے پورے خاندان میں سے کریم بی بی کے ساتھ سب سے اچھا اور مشفقانہ برتاو شیخ نور محمد کا ہوتا تھا۔ آفتاب اقبال کی تربیت میں بھی ان کی خصوصی دلچسپی شامل تھی اور جب آفتاب اور اقبال کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو بھی انہوں نے فاصلوں کو بڑھنے سے روکنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی۔

شیخ نور محمد اور سید چراغ شاہ:

گجرات کے سید چراغ شاہ' شیخ نور محمد کے قریبی دوست تھے۔ سید چراغ شاہ اس حلقے میں شامل تھے جو شیخ نور محمد' سید میر حسن اور مولانا غلام حسن پر مشتمل تھا۔ شیخ صاحب کے دل میں علمائے حق کا جو مقام تھا اس کے پیش نظر سید چراغ شاہ کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

> "پھر ان (اقبال) کے گھر کی فضا کہ والد ماجد کو دیکھتے ان کے ہاں اہل دل جمع ہیں محمد اقبال نے اگرچہ صرف اتنا کہا ہے کہ اس حلقے میں کتب تصوف کا مطالعہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا یہ حلقہ کن بزرگوں پر مشتمل تھا۔ اتنا معلوم ہے کہ ان میں ایک سید چراغ شاہ بھی تھے۔ گجرات سے ترک وطن کرکے انہیں کے قریب محلہ کشمیریاں میں آباد ہوئے۔ مولوی غلام مرتضٰی کے جن کی میر حسن نے بڑی تعریف کی ہے۔ شاگرد تھے" (۱۷)

سید چراغ شاہ' گجرات کے ایک گاؤں "بوکن" میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید محمد شاہ سے حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچے تو سیالکوٹ میں مولوی غلام

مرتضٰی کے درس میں شامل ہو گئے جو کبوتراں والی مسجد میں قرآن و حدیث اور صرف و نحو کا درس دیتے تھے اور اِس مسجد کے خطیب و امام بھی تھے۔ آپ نے کچھ فقہی کتب مفتی صدر الدین آزردہ دھلوی سے بھی پڑھیں۔ دوران تعلیم آپ کی شادی اُستاد مکرم مولوی غلام مرتضٰی کی وساطت سے فیروز والا کے ایک ذی علم گھرانے میں ہو گئی۔ اِس کے بعد آپ ذاتی مکان خرید کر سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ مولانا غلام مرتضٰی کی وفات کے بعد اِن کے جانشین ہوئے۔ دور دراز سے لوگ فقہی مسائل کے حل کے لئے آپ سے رجوع کرتے۔

علمائے کرام اور صوفیائے عظام سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا حضرت قاضی سلطان محمودؒ جب سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو آپ کے ہاں قیام فرماتے۔ سید چراغ شاہ قاضی صاحب سے ملاقات سے قبل خواجہ خان عالم باؤلی شریف (گجرات) سے بیعت تھے لیکن قاضی صاحب سے اِسقدر متاثر ہوئے کہ آپنے دو بیٹوں عبداللہ شاہ اور نور اللہ شاہ کو آپ کے ہاتھ پر بیعت کرادیا۔

سید چراغ شاہ عظیم عالم، فقیہہ اور بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی شاعری کا غیر مطبوعہ مجموعہ "بیاضِ صحیح" آپ کے پوتے سید نور محمد قادری مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جو ان کی علمی و فنی عظمت کا غماز ہے۔ آپ نے شعبان ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۴ء) میں گجرات میں وفات پائی اور آبائی گاؤں "بوکن" میں دفن ہوئے۔ اِن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید عبداللہ گجرات آگئے جبکہ دوسرے صاحبزادے سید نور اللہ (بلند پایہ شاعر) اور سید ظہور اللہ (نامور طبیب) سیالکوٹ میں ہی رہے۔ (۱۸)

حوالہ جات و حواشی:۔

(۱) زِندہ رود جلد اول آز ڈاکٹر جاوید اِقبال ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور' ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۰ تا ۱۷
(۲) اِقبال کے حضور آز سید نذیر نیازی ۔ اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء' صفحہ ۹۴
(۳) "حیات و پیام علامہ اِقبال" آز ڈاکٹر نظیر صوفی صفحہ ۹۳
(۴) ذِکر اِقبال آز عبدالمجید سالک' بزم اِقبال لاہور ۱۹۸۳ء' صفحہ ۲۴۸
(۵) مجلّہ "مہک" گوجرانوالہ نمبر۔ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ' ۸۴۔۱۹۸۲ء صفحہ ۳۸۶
(۶) سیرت اِقبال آز محمد طاہر فاروقی ۔ قومی کتب خانہ لاہور' ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۰
(۷) اِسلامی تصوف اور اِقبال ۔ آز ڈاکٹر ابو سعید نورالدین' اِقبال اکادمی لاہور' ۱۹۷۷ء' صفحہ ۲۳۰
(۸) مظلوم اِقبال آز اعجاز احمد' کراچی ۱۹۸۵ء صفحہ ۳۶۵
(۹) قاضی محبوب عالم صاحب کے صاحبزادے قاضی مظہرالحق اور پوتے قاضی منصور صاحب نے راقم سے ملاقات میں اِس بات کا اِنکشاف کیا۔
(۱۰) ماہنامہ "آئینہ" لاہور ۔ بابت اپریل ۱۹۶۵ء
(۱۱) حیات اِقبال کی گمشدہ کڑیاں ۔ آز محمد عبداللہ قریشی ۔ بزم اِقبال لاہور' ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۶
(۱۲) اِقبال کی ابتدائی زِندگی آز ڈاکٹر سلطان محمود حسین ۔ اِقبال اکادمی لاہور' ۱۹۸۶ء' صفحہ ۲۵۳
(۱۳) ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور بابت اپریل ۱۹۷۵ء' صفحہ ۴۴۔ مضمون "سلسلہ قادریہ میں اِقبال کی بیعت" آز سید نور محمد قادری
(۱۴) زِندہ رود جلد اول صفحہ ۶۴
(۱۵) علامہ اِقبال کے دینی اور سیاسی افکار آز سید نور محمد قادری ۔ زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن گجرات ۱۹۸۲ء صفحہ ۴۴
(۱۶) ایضاً۔ ملاقات مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۰ء
(۱۷) دانائے راز آز سید نذیر نیازی ۔ اِقبال اکادمی لاہور' ۱۹۸۱' صفحہ ۴۷
(۱۸) درج ذیل سے مدد لی گئی ہے
ا :۔ اِقبال کی ابتدائی زِندگی' آز ڈاکٹر سلطان محمود حسین صفحہ ۳۔۲۵۲
ب :۔ تذکرہ اکابر اہلسنت جلد اول آز عبدالحکیم شرف قادری لاہور ۱۹۷۶ء' صفحہ ۶۲' ۶۱
ج :۔ روزنامہ "اِمروز" اِقبال نمبر۔ ۲۱ اپریل ۱۹۸۱ء' مضمون "سید چراغ شاہ اور شیخ نور محمد" از کلیم اختر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب دوم

گجرات: اِقبال کا مرشد خانہ

(بیعت بدست حضرت قاضی سلطان محمودؒ)

- اِقبال کا تصورِ تصوف
- اِقبال کا نظریۂ ضرورتِ شیخ و مرشد
- اِقبال کا تصورِ بیعت
- اِقبال کی صوفیائے کرام سے عقیدت
- سلسلۂ قادریہ میں اِقبال کی بیعت

☆ اِقبال کس کے ہاتھ پر بیعت تھے؟
☆ کیا اِقبال اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت تھے؟
☆ اِقبال کی بیعت بدست قاضی سلطان محمودؒ
☆ سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمودؒ

"واہ بھئی! قلندر کے پاس اِس (تصوف) کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ اصل چیز تو یہی ہے۔ باقی مصروفیات تو زِندگی کے لوازم ہونے کی وجہ سے دامن سے بندھی ہوئی ہیں"۔ اِقبال (۱)

اِقبال کا تصورِ تصوف:۔

اِقبال کے تصورِ تصوف کے متعلق متعدد کتب اور بیسوں مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ مختصراً ہم اِقبال کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں:
"میرے قالب میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں۔ بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کاروباری قسم کی ہے اور اندرونی شخصیت تخیل، تصوف اور تصور کا پیکر ہے" (۲) اِقبال ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جسکا تصوف سے گہرا تعلق تھا۔ اِن کے والد ماجد صوفیائے عظام سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور انکی زِندگی بھی صوفیانہ طرز سے عبارت تھی۔ خود اِقبال کی زِندگی میں بھی اِس طرزِ زِندگی اور فکر کا نمایاں عمل دخل تھا۔ لیکن وہ اِس تصوف کے قطعاً قائل نہ تھے جو ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتا ہو یا گدی نشینوں کے کاروبار کا ذریعہ ہو۔ ان کے نزدیک اصل تصوف اور خودی کی تعمیرو تکمیل ایک ہی شئے ہے۔ وہ ایسے تصوف کے ہر گز قائل نہ تھے جو، شریعت سے روگرداں ہو یا جس سے تکمیلِ خودی یا عرفانِ ذات کا بلند مقصد حاصل نہ ہوتا ہو۔

اِقبال کسی بھی معاشرے کی تعمیرو ترقی کے لیے صوفیاء کے طبقے کی جدوجہد کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے صوفیاء کو تزکیہ نفس، اصلاح باطن اور عرفان ذات کے حصول کے ساتھ ساتھ اَپنے مقلدین کی زِندگیوں کو مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ اِقبال اِس تصوف کے حق میں تھے جو اِسلام کے اصولوں کے مطابق ہو۔ کیونکہ اِسلام کے سنہری اور ابدی قوانین سے روگردانی کر کے کوئی بھی نظریہ کامیابی کی ضمانت کیسے دے سکتا ہے۔ اِقبال" اپنے ایک خط محررہ ۹ مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا سلیمان پھلواروی کو لکھتے ہیں۔

> "حقیقی اِسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ میں خود سلسلہ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے تصوف کرات سے دیکھا ہے۔ بعض لوگوں نے ضرور غیراِسلامی عناصراِس میں داخل کر دیے ہیں۔ جو شخص غیر اِسلامی عناصر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوف کا خیرخواہ ہے نہ کہ مخالف" (۳)

اِقبال ضرب کلیم میں کہتے ہیں

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر

جس فقر کی اصل ہے حجازی
مومن کی اِسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

اِقبال کا نظریۂ ضرورتِ شیخ و مرشد

زِندگی کے اصل مقصد کے حصول اور دینی و دینوی کامیابی کے لیے اِقبال ایک راہنما' ایک مرشد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں(۴):۔

"پیر یا مرشد کی ضرورت ہے۔ اِسکے بغیر اِنسان کوئی صحیح اور کامل راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ روحانی فائدہ تو اِن بزرگوں سے صرف اِنہی لوگوں کو ہو گا جو اہل دِل ہیں' جن کے دِل میں درد ہے۔ جن کے قلب میں گرمی اور جن کے روح میں تڑپ ہے۔ لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے' (بشرطیکہ پیر دکانداری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے اور جس کا اخلاق درست ہے' جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جسکے اعمال' اعمال حسنہ کہے جاسکتے ہیں اِس سے بڑھ کر اور کون بہترین اِنسان ہو سکتا ہے"۔

۱۹۰۴ء میں علامہ کے دوست منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷۔۱۹۴۵) نے لاہور کے صوفیاء کا تذکرہ "یادِ رفتگاں" کے نام سے لکھ کر شائع کیا۔ اِقبال نے یہ کتاب پڑھی تو فوق کو لکھا:۔

"اہلِ اللہ کے حالات جو آپ نے بنام "یادِ رفتگاں" تحریر فرمائے ہیں' مجھ پر بڑا اثر کیا اور بعض بعض باتوں نے' جو آپ نے اِس چھوٹی سی کتاب میں درج کی ہیں' مجھے اتنا رلایا کہ میں بے خود ہو گیا۔ خدا کرے آپکی توجہ اِس طرف لگی رہے۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نجات اِسی میں ہے کہ اِن لوگوں کے حیرت ناک تذکروں کو زِندہ کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل علت حسنِ ظن کا دور ہو جانا ہے۔ بھائی فوق! خود بھی اِس گوہرِ نایاب کی تلاش میں رہو' جو بادشاہوں کے خزانوں میں نہیں مل سکتا بلکہ کسی خرقہ پوش کے پاؤں کی خاک میں اتفاقیہ مل جاتا ہے" (۵)

اِسی کتاب سے متاثر ہو کر اِقبال نے وہ غزل لکھی تھی جس کے چند اشعار یہ تھے۔ (۶)

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اِن کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہل دِل کے سینوں میں
تمنا دردِ دِل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کی' ارادت ہو تو دیکھ اِنکو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

"اسرار خودی" میں ایک جگہ فرماتے ہیں

کیمیا پیدا کن از مشت گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے

مگروہ پیشہ ور "پیران طریقت" سے متنفر تھے۔ صوفیائے خام اور رسمی اور جاہلانہ تصوف کے بھی خلاف تھے۔ ایک خط میں اَکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں۔

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اِسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں.... صوفیہ کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اِسلامی کی متاع نہیں بکتی" (۷)

اِقبال کا تصورِ بیعت:۔

اِقبال کے ہاں "بیعت بدست مرشد" بھی مرشد کے تصور کا لازمی حصہ ہے کیونکہ اِن کے نزدیک مرشد سے فیض حاصل کرنے کے لیے اِس کے بتائے ہوئے رستوں پر چلنا ضروری ہے۔ اِسلامی تصوف کے پیرو مرشد کا بتایا ہوا رستہ قرآن و سنت کے علاوہ کچھ نہ ہو گا۔ گویا مرشد کی اطاعت دراصل اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت ہو گی۔ علامہ ایک خط محررہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔ ۱۹۵۳) کو لکھتے ہیں:۔

"یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں" (۸)

اِقبال کو اِن کے والد ماجد شیخ نور محمد نے ابتدائے بلوغت میں قاضی سلطان محمود کے دست حق پرست پر بیعت کروایا تھا۔ جب اِقبال کے صاحبزادے آفتاب اِقبال اِس عمر پر پہنچے تو خود اِقبال نے بھی ان کے لیے اِس ضرورت کو محسوس کیا۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد (۱۸۶۴۔ ۱۹۴۰) کے نام ایک خط مرقومہ ۷ مارچ ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں:

"لڑکا دھلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آجکل اِس فکر میں ہوں کہ اِس کو کہیں مرید کرا دوں یا اِسکی شادی کر دوں تاکہ اِس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے" (۹)

اِقبال کی صوفیائے کرام سے عقیدت:۔

اِقبال تمام عمر کسی "صاحبِ نظر" کی تلاش میں رہے جو اِن پر ایک نظر ڈال کر روحانی تکمیل کے تمام مراحل طے کرا دے۔ کسی "مردِ مومن" کی تلاش اِنہیں دور دور تک لے

گئی۔ دردِ دل کی تمنا لیے وہ بہت سے آستانوں پر حاضر ہوئے۔ اگرچہ وہ خود سلسلۂ قادریہ میں بیعت رکھتے تھے مگر انہوں نے ہر سلسلہ کے بزرگوں سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور ان سے فیض حاصل کیا۔ اِقبالؒ نے اِسلامی تصوف کو اپنے حکیمانہ اقوال و نظریات اور بصیرت افروز زِندگیوں سے پروان چڑھانے والے بزرگوں میں سے اکثر کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ ان لوگوں کے بے حد مداح و معترف تھے جنہوں نے ملت اِسلامیہ کے جسد میں نئی روح پھونکی اور زوال و اِنحطاط کے دور میں احیائے دین کے لیے کوشاں رہے۔ اِقبال ان بزرگوں سے بہت متاثر تھے جنہوں نے مسلمانوں کی دینی اور سماجی زِندگی کو سنوارنے اور اِسلامی معاشرے کا صحیح مزاج قائم رکھنے کے لیے انتھک محنت کی۔

اِقبال شریعت کے آئینے میں حقیقت کا جمال دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جس آئینہ گر کے آئینے میں یہ جمال ہم آہنگ ہو کر نظر آجاتا' وہ اِسکے والہ و شیدا ہو جاتے۔ ایسے اہلِ اللہ کو اِقبال نے نظم و نثر میں ہدیۂ تحسین پیش کیا اور ان کے مزارات پر حاضری دی اور علماء و مشائخ کے طبقہ میں سے جس کسی کی شہرت سنی اور اِسکی خدمت میں حاضر ہو کر اِستفادہ کیا۔

اِقبال' حضرت مجدد الف ثانی (۱۵۶۳-۱۶۲۴ء قادریہ' چشتیہ نقشبندیہ مجددیہ)' حضرت نظام الدین اولیا (م ۱۳۲۵ء چشتیہ) حضرت داتا گنج بخش (۱۰۰۹-۱۰۹۲ء جنیدیہ)' حکیم سنائی (م-۱۱۵۰ء) حضرت میاں میر (۱۵۳۱-۱۶۳۵ء قادریہ)' شیخ بو علی قلندر (۱۲۰۸-۱۳۲۴ء) شاہ محمد غوث (۱۵۰۱-۱۵۶۲ء قادریہ) اور سید گل حسن شاہ (م-۱۹۱۹ء قادریہ) کے مزارات پر حاضر ہوئے اور اِن میں سے اکثر کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ (۱۰)

حضرت بایزید بسطامی " (۷۷۷-۸۴۴ء لیفوریہ)' حضرت جنید بغدادی " (م-۹۰۹ جنیدیہ)' حضرت اویس قرنی (م-۲۲ھ یا ۳۷ھ) حضرت امام غزالی (۱۰۵۸-۱۱۱۱ء) شیخ فرید الدین عطار (۱۱۵۰-۱۲۳۰ء) حضرت ابو سعید ابوالخیر (۹۶۷-۱۰۴۸ء) حضرت سید احمد رفاعی (م-۱۱۸۳ء) حضرت خواجہ معین الدین اجمیری (۱۱۲۴-۱۲۳۶ء چشتیہ) حضرت شمس تبریز (م-۱۲۴۷ء) شیخ بو علی قلندر پانی پتی' امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء چشتیہ)' سید علی ہمدانی (م-۱۳۸۴ء کبرویہ سہروردیہ) مولانا جامی (۱۴۱۴-۱۴۹۲ء نقشبندیہ) حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (م-۱۳۸۴ چشتیہ صابریہ) کے حضور بھی اِقبال نے ہدیۂ تبریک پیش کیا۔ مولانا روم (۱۲۰۷-۱۲۷۳ء) کو تو وہ اپنا مرشدِ معنوی کہتے ہیں۔ باباتاج الدین ناگپوری (۱۸۵۱-۱۹۲۵ء) کی روحانی بزرگی سے بھی متاثر تھے۔ علمی اور صوفیانہ مسائل پر سید مہر علی شاہ (۱۸۵۹-۱۹۳۷ء قادریہ چشتیہ) اور شاہ سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹-۱۹۳۵ء

چشتیہ) سے مشورہ کرتے تھے۔ (۱۱)

گویا اِقبال کے نزدیک "رشد و ہدایت" اصل چیز تھی خواہ کسی بھی سلسلہ کے بزرگ سے حاصل ہو۔

سلسلۂ قادریہ میں اِقبال کی بیعت:۔

اِقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ اِس کا اقرار انہوں نے اَپنے قلم اور اپنی زبان سے مختلف اوقات میں کیا: ۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو شاہ سلیمان پھلواروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حقیقی اِسلامی تصوف کا میں کیونکر مخالف ہو سکتا ہوں کہ میں خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں" (۱۲)

سید سلیمان ندوی کو ایک خط محررہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں

"خواجۂ نقشبند اور مجددِ سرہند کی میرے دِل میں بہت بڑی عزت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین کا مقصود اِسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا" (۱۳)

اِن دو تحریری شواہد کے علاوہ خود علامہ کی زبان سے بھی اِس بات کے اقرار کی گواہی موجود ہے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے اِنتخابات کے دوران' مخالف امیدوار کی جانب سے اِقبال پر جب یہ دو الزامات لگائے گئے کہ وہ قادیانی ہیں اور وہ رشد و ہدایت کے کسی سلسلہ طریقت سے تعلق نہیں رکھتے تو انہوں نے موچی دروازہ کے باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ میں کلمہ طیبہ پڑھ کر حلفاً یہ وضاحتی بیان دیا۔

"دونوں (الزامات) کی نسبت میرا وضاحتی حلفیہ بیان یہ ہے کہ میں حنفی ہوں اور کٹر حنفی ہوں ...... میں اور میرے خاندان کی نسبت سلطان عرب و عجم حضرت شیخ سید عبدالقادر غوث الاعظم محی الدین جیلانیؒ سے ہے" (۱۴)

اِقبال کس کے ہاتھ پر بیعت تھے؟

اِقبال کس کے ہاتھ پر بیعت تھے؟ اِس سلسلے میں دو نام لیے جاتے ہیں۔ ایک ان کے والد شیخ نور محمد کا اور دوسرے حضرت قاضی سلطان محمود (اعوان شریف۔ گجرات) کا۔ اِن دونوں باتوں کے متعلق جو شواہد موجود ہیں اِن کی روشنی میں ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا اِقبال اَپنے والد کے ہاتھ پر بیعت تھے؟

اِقبال کے اَپنے والد ہاتھ پر بیعت ہونے کی بات پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے ایک بیان سے چلی۔ اِس کے علاوہ کسی اور نے اِس بات کو بیان نہیں کیا۔ چند مصنّفین نے اِس بیان کو نقل کیا ہے

"سیرت اِقبال" کے مصنف محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں

"عرصہ تک اِس امر کا کسی کو علم نہ تھا کہ علامہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا گیا تھا کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے لیکن سب سے پہلے اِس راز کی عقدہ کشائی امیرِ ملت، اعلیٰ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری رحمتہ اللہ علیہ نے مئی ۱۹۳۵ء میں فرمائی تھی۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ "اِقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اَپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں"۔ (۱۵)

اِسی بیان کو عبدالمجید سالک نے "ذِکرِ اِقبال" میں (۱۶) اور ڈاکٹر ابو سعید نورالدین نے اپنی کتاب "اِسلامی تصوف اور اِقبال" میں (۱۷) نقل کیا ہے

۱۷، اگست ۱۹۳۰ء کو علامہ کے والد محترم نے وفات پائی۔ علامہ نے قطعۂ تاریخِ رحلت کہا جسکا پہلا مصرع تھا۔ "پدر و مرشد اِقبال ازیں عالم رفت"۔ اِس سے بھی یہی تاثر ملتا ہے کہ وہ اَپنے والد کو مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اصل صورت حال اِس سے مختلف ہے۔ شیخ اعجاز احمد (۱۸۹۹۔۱۹۹۴ء) جنہیں اَپنے دادا شیخ نور محمد کے قریب رہنے کا موقع کافی عرصہ میسر رہا، اِس بارے میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے، میاں جی باقاعدہ بیعت لے کر کسی کو مرید نہیں بناتے تھے اِس لیے یہ روایت کہ چچاجان (علامہ اِقبال) اَپنے والد سے بیعت تھے، لفظاً تو نہیں، ہاں معنوی رنگ میں درست ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اِنکی نظر میں میاں جی کا وہی مرتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر میں مرشد کا ہوتا ہے" (۱۸)

شیخ نور محمد کے دوسرے پوتے ڈاکٹر جاوید اِقبال لکھتے ہیں:

"شیخ نور محمد باقاعدہ بیعت لیکر کسی کو مرید نہ بناتے تھے۔ اِنکی لوح مزار پر اِقبال کے تحریر کردہ قطعۂ تاریخ میں انہیں "پدر و مرشد اِقبال" (۱۹) کہا گیا ہے۔ مگر اِس روایت میں کوئی صداقت نہیں کہ اِقبال اپنے والد سے بیعت تھے۔ البتہ معنوی رنگ میں اِقبال کی نگاہ میں اَپنے والد کا وہی رتبہ تھا جو ایک مرید کی نظر

میں مرشد کا ہوتا ہے" (۲۰)

رحیم بخش شاہین اپنے ایک مضمون "شیخ نور محمد۔ پدر و مرشد اقبال" میں بیان کرتے ہیں

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ (شیخ نور محمد) سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ لیکن خود آپ نے کسی کو مرید بنانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ بلکہ اِس طرح زندگی بسر کی کہ کسی کو ان کی روحانی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے۔ البتہ علامہ اِقبال کو انہوں نے روحانی فیض ضرور پہنچایا اور اِسکا اعتراف خود علامہ اِقبال نے بھی فرمایا" (۲۱)

اِن بیانات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ اپنے والد سے بیعت نہیں تھے۔ علاوہ ازیں کچھ اور نکات سے بھی ہمیں اِس نتیجے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

ا:۔ تصوف کا یہ اصول ہے کہ بیعت کرنے کے لیے باقاعدہ مرشد کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ یہ اجازت ہر مرید کو حاصل نہیں ہوتی بلکہ خاص مقرب مریدین کو عطا کی جاتی ہے جنہیں خلافت سے نوازا جاتا ہے۔ شیخ صاحب کو یہ اجازت کس نے دی؟ انکا نام حضرت قاضی سلطان محمودؒ کے خلفاء میں شامل نہیں ہے۔ (نہ عبداللہ قادری کے خلفاء میں آپ شامل ہیں اور ویسے بھی مجذوب نہ بیعت کرتا ہے نہ کرنے کی اجازت دیتا ہے)

ب:۔ اگر شیخ صاحب کو ایسی اجازت حاصل تھی تو کسی عزیز، رشتہ دار، دوست نے اِسکا ذِکر نہیں کیا بلکہ تردید کی ہے۔

ج:۔ اگر یہ بھی فرض کرلیں کہ انہوں نے اِقبال کو بیعت کیا تھا تو اکیلے اِقبال کو ہی کیوں کسی اور کو کیوں نہیں؟ اِقبال کی والدہ اور بہن نے شیخ نور محمد کی روحانی صلاحیتوں سے متعلق واقعات کا ذِکر کیا ہے۔ اگر اِن واقعات کا ذِکر ہو سکتا ہے تو بیعت کرنے کا کیوں نہیں۔

اِس بحث سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اِس روایت میں کوئی صداقت نہیں کہ اِقبال اپنے والد سے بیعت تھے۔

اِقبال کی بیعت بدست قاضی سلطان محمودؒ:۔

علامہ نے عام طور پر اِس بات کا اظہار نہیں فرمایا کہ وہ کس بزرگ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ ان کا اِس بارے میں خیال یہ ہے کہ:۔

"سلسلہ بیعت کا عام اظہار اِس لحاظ سے سوءِ ادب کا باعث بنتا ہے اگر مرید

سلسلہ کے اندر اِس خانوادہ کے روحانی کمالات موجود نہ ہوں۔ میرے خیال میں اگر مرید سلسلہ میں سرخیل سلسلہ کی صفات اور رنگ نہ پایا جاتا ہو تو وہ سرخیلِ سلسلہ کو بدنام کرنے کا باعث بنتا ہے" (۲۲)

مگر چند متدین اور ثقہ روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ علامہ حضرت قاضی سلطان محمودؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ آیئے اِن روایات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

۱) جناب علی احمد خان (سابق جنرل منیجر پاکستان میوچل انشورنس کمپنی لاہور) آپنے ایک مضمون "حضرت قاضی سلطان محمود صاحب" میں بحوالہ مولانا روح اللہ قادری لکھتے ہیں:

"علامہ اِقبال کے والد محترم' قاضی صاحب کے مرید تھے۔ آپنے فرزند کو لیکر آستانہ عالیہ (آوان شریف) پر حاضر ہوئے اور دعائے خیر کے لیے معروض ہوئے۔ قاضی صاحب نے ننھے محمد اِقبال کے لیے دعا فرمائی اور کہا کہ یہ لڑکا حضرت رسالت مآب ﷺ کا سچا پیرو ہو گا۔ محمد اِقبال سِن شعور کو پہنچے تو ان کے والد نے قاضی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کرائی" (۲۳)

(۲) مذکورہ بالا مضمون پڑھکر سید نور محمد قادری نے علی احمد خان صاحب سے مزید معلومات کی درخواست کی۔ چنانچہ انہوں نے جوابی مکتوب محررہ ۸ دسمبر ۱۹۶۵ء میں لکھا:

"پروفیسر سید عبدالقادر صاحب مرحوم (متوفی جنوری ۱۹۵۶ء) نے کہ جن سے مجھے شرفِ تلمذ بھی تھا' ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا کہ علامہ اِقبالؒ نے ان (سید عبدالقادر) سے خود اِس بارے میں تذکرہ کیا تھا کہ میں قاضی صاحب کے ارشاد کے مطابق پہلے تو سلطان جی کے ہاں حاضر ہوا اور وہاں رویا میں حضرت قاضی صاحب نے ارشاد کیا کہ تمہارا فیض حضرتِ مجدد کے پاس ہے۔ چنانچہ علامہ اِقبال سرہند پہنچے اور فیضیاب ہوئے" (۲۴)

(۳) محمد عبداللہ قریشی "حیات اِقبال کی گمشدہ کڑیاں" میں رقمطراز ہیں:۔

"اِقبال کے والد شیخ نور محمد اور خود اِقبال نے بھی قادری سلسلے کے ایک بزرگ قاضی سلطان محمود کے دستِ حق پرست پر بیعت کی ہوئی تھی" (۲۵)

اِسی کتاب میں قریشی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"اِقبال خود بھی لڑکپن سے سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود صاحب دربار آوان شریف (م: ۲ مئی ۱۹۱۹ء) کے مرید تھے جو سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے" (۲۶)

(۴) سید نور محمد قادری نے قریشی صاحب سے اِس بات کا ماخذ دریافت کیا تو انہوں نے بتایا

"اِس (روایت) کے راوی میرے محترم بزرگ مولانا حکیم محمد روح اللہ قادری ہیں۔ چونکہ مولانا روح اللہ نہایت ہی ثقہ اور متدین بزرگ تھے اِس لیے اِس روایت کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں" (۲۷)

(۵) سید نور محمد قادری سے ایک ملاقات میں مولانا روح اللہ(۱۸۶۶-۱۹۶۹ء) نے بھی اِس بیعت کی تصدیق کی مگر بڑھاپے کے سبب صرف اشاروں سے ہی یہ تصدیق ہو سکی کیونکہ ان کی قوت گویائی اور قوت سماعت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ (۲۸)

(۶) سید نور محمد قادری لکھتے ہیں:-

"حضرت قاضی صاحب" کے حافظ عبداللہ شاہ (ابن سید چراغ شاہ) سے بہت گہرے مراسم تھے۔ قاضی صاحب جب بھی مزارات عالیہ کی زیارت کے لیے سیالکوٹ تشریف لے جاتے تو حافظ صاحب کے گھر بھی ضرور تشریف لے جاتے جہاں اِن کے عقیدت منداور اہلِ محلہ زیارت کے لیے جمع ہو جاتے۔ حضرت علامہ اِقبال کے والد ماجد صوفی نور محمد صوفیائے کرام کے ازحد معتقد تھے۔ جب بھی گردونواح میں کسی بزرگ کے ورود فرمانے کا سنتے تو زیارت کے لیے ضرور حاضر ہوتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب جیسے عظیم بزرگ اور صوفی اِن کے اَپنے محلے میں تشریف لاتے ہوں اور وہ کسبِ فیض کے لیے حاضر نہ ہوتے ہوں۔ یہ بات قرینِ قیاس ہی نہیں بلکہ یقینی ہے کہ وہ اِن ملاقاتوں میں حضرت قاضی صاحب کی زبردست شخصیت سے متاثر ہو کر بیٹے سمیت حضرت سے بیعت ہو گئے ہوں" (۲۹)

(۷) سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:-

"محمد اِقبال ابھی لاہور نہیں آئے تھے کہ شیخ نور محمد انہیں آوان شریف لے گئے۔ قاضی سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قیاس یہ ہے کہ اِسی سفر میں محمد اِقبال قاضی صاحب سے بیعت ہوئے اور سلسلۂ قادریہ میں شامل ہو گئے" (۳۰)

(۸) ڈاکٹر جاوید اِقبال نے سید نور محمد قادری کے دریافت کرنے پر بتایا:

"یہ بات ہمارے خاندان میں بیشتر کو معلوم ہے کہ حضرت علامہ کے والد' حضرت قاضی سلطان محمود صاحب آوان شریف والوں سے بیعت تھے اور بچپن میں حضرت علامہ اِقبال کو بھی آوان شریف انکے بیعت کے لیے لے گئے" (۳۱)

ڈاکٹر صاحب نے "زِندہ رود" میں لکھا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نور محمد' سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار آوان شریف کے مرید تھے جو سلسلۂ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اِسی بناپر اِقبال بھی بچپن سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کئے ہوئے تھے" (۳۲)

پھر ایک ملاقات میں سید نور محمد قادری کے مزید اِستفسار پر ڈاکٹر جاوید اِقبال نے بتایا۔

"اِس (روایت) کے راوی میرے حقیقی پھوپھا شیخ غلام رسول صاحب مرحوم وزیر آبادی ہیں جو بڑے متدین اور ثقہ بزرگ تھے۔ لیکن اِس بات کی تصدیق ان کی زبانی اِس وقت ہوئی جب "زِندہ رود" کا مسودہ ترتیب پا چکا تھا۔ اب اِس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اِسکا مفصلاً ذِکر ہوگا" (۳۳)

اِن شواھد کی روشنی میں ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اِقبال' قاضی سلطان محمود کے ہاتھ پر بیعت تھے۔

تاہم اِس سلسلے میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(1) کیا یہ بیعت بچپن یا لڑکپن کی تھی؟

۲) اِقبال نے قاضی صاحب کا ذِکر کھل کر کیوں نہ کیا؟

۳) اِقبال کو تجدید بیعت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

پہلے سوال کا سیدھا جواب ہے "نہیں"۔ اِقبال نے یہ بیعت بچپن یا لڑکپن میں نہیں کی بلکہ سِن شعور کی بیعت تھی (جیسا کہ علی احمد خان نے اپنے مضمون میں لکھا ہے) کیونکہ کوئی بچہ یا لڑکا (سِن شعور سے قبل) بیعت سے متعلقہ اسرار و رموز' مرشد کا مقام' آداب و احکامات کی بجاآوری کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور یہ بنیادی نوعیت کی بات کیا شیخ نور محمد جیسا واقفِ اسرارِ تصوف نہیں سمجھتا تھا۔ اگر وہ فرطِ عقیدت سے اِقبال" کو لڑکپن میں بیعت کے لیے لے بھی گئے تھے تو کیا حضرت قاضی صاحب اِس بات سے بے خبر تھے! یہ بات ابتدائے بلوغت کی ہو سکتی ہے کیونکہ اِقبال اپنی فطانت اور گھر کے ماحول کی وجہ سے عام لڑکوں کی نسبت کم عمری میں تصوف کے بنیادی امور سے واقف ہو چکے ہونگے۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ قاضی صاحب نے اِقبال کو بچپن میں بیعت کر لیا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شیخ نور محمد' اِقبال کو بچپن سے اپنے مرشد خانے لے جاتے ہوں لیکن بیعت اِسی وقت کرایا ہو جب وہ اِس قابل ہو گئے ہوں۔

دوسرے سوال کا جواب گزشتہ سطور میں خود اِقبال کی زبان میں گزر چکا ہے۔ کہ اگر مرید میں مرشد کی صفات کا عکس نظر نہ آئے تو مرشد کی بدنامی کا باعث ہوتا ہے۔

تیسرے سوال کے سلسلے میں یوں تو بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں لیکن سب سے اہم یہ ہے کہ جب اِقبال اور کریم بی بی میں علیحدگی کی بات چلی تو اِقبال کے سسر نے قاضی صاحب سے صلح کی درخواست کی مگر اِن کی کوشش سے حالات سدھر نہ سکے۔ اور مرشد کی شفقت اور مرید کی ارادت پر بدگمانی کا سایہ پڑ گیا اور قاضی صاحب کی وفات (مئی ۱۹۱۹ء) کے بعد اِقبال نے تجدیدِ بیعت کی ضرورت محسوس کی۔ (۳۴)

اِسی سلسلے میں ایک اور قیاس کا اظہار ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے کیا ہے (۳۵) کہ قاضی صاحب اور اِن کے جانشین چونکہ "وحدت الوجود" کے قائل تھے اور اِقبال اِس کے مخالف! چنانچہ ممکن ہے کہ اِس وجہ سے کچھ اختلافات پیدا ہو گئے ہوں! مگر یہ امر واقعی نہیں کیونکہ وحدت الوجود سے جزوی اختلاف رکھنے کے باوجود اِقبال بہت سے "وحدت الوجودیوں" کے ارادتمند تھے۔ مولانا روم جنہیں اِقبال روحانی پیشوا مانتے تھے، کیا وحدت الوجودی نہیں تھے؟ مولانا جامی اور فرید الدین عطار کیا وحدت الوجود کے ماننے والے نہیں تھے؟ کتنے ہی وحدت الوجودی اِقبال کے ممدوح تھے!

سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود:۔

حضرت قاضی سلطان محمود عصرِ حاضر کے عظیم قادری بزرگ تھے۔ وہ ضلع گجرات کے ایک سرحدی گاؤں "آوان شریف" میں ۱۲۵۶ھ کے آخر، (بمطابق ۱۸۴۰ء) میں پیدا ہوئے اِن کے والد کا نام غلام غوث (م۔ ۱۸۸۵ء) تھا جو تمام مروجہ علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ آوان شریف (جو پہلے "محمد پور آوان" کہلاتا تھا) گجرات شہر سے ۳۵ کلومیٹر شمال میں اس سڑک پر واقع ہے جو آزاد کشمیر کے قصبہ "برنالہ" کو جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم آپنے والد سے حاصل کی۔ پھر تکمیل تعلیم کے لیے ضلع گجرات کے دیہات حاجیوالہ، ملکہ اور چنن گکھڑ وغیرہ میں اِس دور کے جید علماء سے کسبِ فیض کیا۔ مزید حصول تعلیم کے لیے جہلم، کیمبل پور اور پشاور کا سفر کیا اور مختلف عالمانِ دین سے اکتسابِ علم کرتے رہے۔ پچیس چھبیس سال کی عمر تک آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، اَدب، ہندسہ، منطق، ہیت اور فلسفہ میں کمال حاصل کر لیا۔ پھر آپنے گاؤں میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور طالبانِ علمِ دین کے اِستفادہَ کے لیے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا۔ آپ کے تبحرِ علمی، اندازِ تدریس، شفقتِ پدری اور نورانی شخصیت کا کرشمہ تھا کہ دور دور سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے آپ کے پاس کھنچے چلے آتے۔

قاضی صاحب کو علم سے لگاؤ نہیں عشق تھا۔ اِس کے حصول کے لیے کٹھن سے کٹھن مراحل خندہ پیشانی کے ساتھ طے کیے۔ تبحرِ علمی ملا' یگانہ روزگار بنے' مگر ابھی اپنے علم سے مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا محبوبِ حقیقی نے یہ معاملہ کیا کہ علم کے اِس بطلِ عظیم کو ایک کوہِ علم اور بحرِ عرفان کی مجلس میں لا بٹھایا۔ یہ عظیم ہستی حضرت اخوند عبدالغفور قدس سرہ (۱۷۸۴۔۱۸۷۷ء) کی تھی جو سیدو شریف میں روحانیت کے بھی صاحبِ تاج و نگین تھے اور علوم ظاہری میں بھی ترکستان تک حجت مانے جاتے تھے۔ حضرت قاضی صاحب نے اِن کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر مرشد کے دربار میں حاضری اور حضوری کو اپنا ایمان بنا لیا۔ ۱۲۸۲ھ سے ۱۲۹۰ھ تک آپ نے دس مرتبہ سیدو شریف حاضری دی اور مرشد کے حسبِ حکم مقامات و احوال سے گزر کر مقامِ قبولیت حاصل کیا۔ ۱۲۹۰ھ میں آپ کو درجۂ خلافت عطا ہوا اور ساتھ ہی شاہدولہ گجراتی (م۔۱۶۷۵ء) کے مزار پر حاضر ہونے کی تلقین کی گئی۔ چنانچہ آپ شاہدولہ کے مزار پر حاضری دیتے رہے اور گوہرِ مقصود حاصل کیا۔

حضرت قاضی صاحب نہایت بلند درجہ کے عالم اور بہت عظیم المرتبت سالک تھے۔ مولوی شیخ عبداللہ (۱۸۳۴۔۱۹۲۱ء) ساکن چک عمر (گجرات) جو خود بھی عظیم عالم تھے' کہتے ہیں:

"اگر حضرت قاضی صاحب قدس سرہ پوری توجہ سے علومِ باطنی کی طرف متوجہ نہ ہو جاتے تو ہمیں کوئی بھی نہ پوچھتا اور سب لوگ اِنہیں کی طرف رجوع کرتے" (۳۶)

حضرت قاضی صاحب دورانِ تعلیم ہی میں اپنی ذہانت اور محنت کی بدولت اپنے اساتذہ کی نظر میں بلند مقام رکھتے تھے۔ آپ کے ایک اُستاد نے آپ کی علمی بصیرت' دقت نظر اور اصابت رائے کو دیکھ کر آپ کو "قاضی" کے معزز خطاب سے نوازا تھا۔

ہیت' منطق اور فلسفہ کی طرف آپ کا خصوصی رجحان تھا اور اِن علوم کی درسی کتب پر آپ نے حواشی بھی لکھے تھے۔ فارسی' عربی' اُردو اور پنجابی زبانوں پر برابر عبور تھا۔ حافظہ بلا کا تھا اور بہت سی کتب آپ کو زبانی یاد تھیں۔ بہت سے علمائے کرام اپنے علمی مسائل کے حل کے لیے آپ سے رجوع کرتے اور خط و کتابت کے ذریعے بھی اپنے علمی شکوک رفع کرتے۔ آپ کے نزدیک علم ہی کے ذریعے اِنسان اپنے بلند مرتبہ کا حقدار ہو سکتا ہے اور نفس اِنسانی کی تہذیب کی بنیاد بھی علم پر ہی ہے۔ علم کے بغیر خود شناسی ممکن ہے نہ خدا شناسی! علم کی اِس عظمت کے سبب آپ نے درس و تدریس کو وظیفۂ حیات بنا لیا تھا اور یہ بھی گویا آپ کی ریاضت کا حصہ تھا۔ آپ نے علم آموزی کو اپنی ذات پر خدائی فرض سمجھا

اور تا زیست اِسے کمال خوبی اور بے مثال لگن کے ساتھ ادا کیا۔

آپ کو شہرت سے نفرت تھی اور دنیوی اعتبار سے بڑے لوگوں سے میل ملاقات کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اتباع نبوی کے نشہ میں ہمہ تن مخمور اور شریعت محمدی کے نور سے ہمہ تن معمور تھے۔ سب سے نہایت مروت اور شفقت سے پیش آتے۔ تحمل اور شفقت آپ کی نمایاں صفات تھیں۔

ساٹھ سال کی عمر میں آپ کو مختلف بیماریوں نے لاغرو کمزور کر دیا تھا۔ وفات سے تین سال قبل آپ اپنے مکان سے اٹھ کر گاؤں کے باہر اس جگہ منتقل ہو گئے تھے جہاں آپ کے آباؤ اجداد کی قبور تھیں۔ یہیں آپ نے یکم شعبان ۱۳۳۷ھ بمطابق ۲ مئی ۱۹۱۹ء بروز جمعہ کو اِنتقال فرمایا۔ "کل نفس ذائقتہ الموت" سے سنِ رحلت (۱۹۱۹ء) برآمد ہوتا ہے

" آپکا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے اور ملحقہ مسجد میں آج بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ خلفاء میں صاحبزادہ محبوب عالم(۱۸۹۱۔ ۱۹۸۲ء) سید عبداللہ شاہ(م۔۱۹۴۱ء) مولوی نیاز محمد جالندھری' مولوی سراج الدین قادری لاہور' مولانا عبدالرحمٰن(م۔ ۱۹۵۳ء) کیمبلپور شامل ہیں۔ مریدین میں علامہ اِقبال' شیخ نور محمد(۱۹۳۰ء) نواب معشوق یار جنگ بہادر(۱۸۸۰۔۱۹۷۱ء) میاں غلام جیلانی منصف' چوہدری غلام غوث صمدانی(۱۸۸۹۔۱۹۷۲ء) میاں عبدالباری (۱۸۹۵۔۱۹۶۸ء سابق صدر' پاکستان مسلم لیگ) مولوی نور اللہ شاہ سیالکوٹی(م۔۱۹۴۹) غلام احمد خان' نواب غلام حیدر خاں آف کھلابٹ (ہزارہ) مولوی صفی اللہ (پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی) وغیرہم شامل ہیں۔ معتقدین میں میاں محمد بخش (م۔۱۹۰۷ء کھڑی شریف) نواب فخر یار جنگ(۱۸۸۲۔ ۱۹۵۲ء) مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان(۱۸۶۸۔۱۹۲۷ء) مولوی نبی بخش حلوائی(۱۸۵۰۔ ۱۹۴۴ء) پیر جماعت علی شاہ علی پوری(۱۸۴۱۔۱۹۵۱ء) شامل ہیں۔ (۳۷)

حوالہ جات و حواشی:۔

(۱) اِقبال جب بھوپال گئے تو انکی خاطرمدارت کرنے والوں میں اِقبال حسین خان ندیم پیش پیش تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بھوپال آتے ہی علامہ نے دریافت کیا کہ کسی درویش کا پتہ بتایئے۔ میں (ندیم) نے عرض کیا' مجھے کیا معلوم آپ کو درویشوں سے بھی لگاؤ ہے۔ علامہ نے جواباً یہ بات کہی تھی (یادِ اِقبال از صابر کلوروی' شاہکار کتب لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۱)

(۲) ذکرِ اِقبال از عبدالمجید سالک' بزمِ اِقبال لاہور' ۱۹۸۳ء صفحہ ۴۹

(۳) اِقبال کے محبوب صوفیاء از اعجاز الحق قدوسی۔ اِقبال اکادمی لاہور' ۱۹۷۷ء' صفحہ ۵۱۸ .

(۴) حیات اِقبال کی گمشدہ کڑیاں از محمد عبداللہ قریشی۔ بزم اِقبال لاہور، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۸۴
(۵) ایضاً صفحہ ۳۸ تا ۴۰
(۶) ایضاً
(۷) اِقبال کے محبوب صوفیاء صفحہ ی (مقدمہ)
(۸) حیات اِقبال کی گمشدہ کڑیاں صفحہ ۳۶
(۹) ذکر اِقبال صفحہ ۲۴۸
(۱۰) اِقبال کے محبوب صوفیاء مختلف صفحات
(۱۱) ایضاً
(۱۲) ایضاً
(۱۳) اِقبالنامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ صفحہ ۷۹
(۱۴) ماہنامہ "ضیائے حرم" اپریل ۷۵ء، مضمون "زندہ رود اِقبال کی ایک وضاحتی تقریر" از ڈاکٹر محمد اِقبال ایم بی بی ایس۔
(۱۵) "سیرت اِقبال" از محمد طاہر فاروقی۔ طبع پنجم۔ قومی کتب خانہ لاہور ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۱، ۲۰
(۱۶) ذکر اِقبال صفحہ ۲۴۸
(۱۷) "اِسلامی تصوف اور اِقبال" از ڈاکٹر ابو سعید نورالدین۔ اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء
(۱۸) روزگار فقیر حصہ اول۔ از فقیر سید وحیدالدین۔ اِسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور س۔ ن۔ صفحہ ۲۸
(۱۹) زِندہ رود جلد اول صفحہ ۶۴ پر "پدر و مرشد" کی بجائے "پیرو مرشد" لکھا ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔
(۲۰) زِندہ رود جلد اول صفحہ ۶۴
(۲۱) صحیفہ اِقبال مرتبہ یونس جاوید۔ بزم اِقبال لاہور ۱۹۸۶ء صفحہ ۲۹۷
(۲۲) "ضیائے حرم" بابت اپریل ۱۹۷۵ء
(۲۳) ماہنامہ "آئینہ" لاہور، اپریل ۱۹۶۵ء صفحہ ۴۴
(۲۴) ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۴
(۲۵) "حیات اِقبال کی گمشدہ کڑیاں" از عبداللہ قریشی صفحہ ۳۶
(۲۶) ایضاً صفحہ ۲۸۷
(۲۷) ماہنامہ "ضیائے حرم" اپریل ۷۵، صفحہ ۴۵
(۲۸) ایضاً
(۲۹) ایضاً صفحہ ۴۶
(۳۰) دانائے راز از سید نذیر نیازی صفحہ ۱۹
(۳۱) علامہ اِقبال کے دینی و سیاسی افکار از سید نور محمد قادری صفحہ ۴۴

(۳۲) زندہ رود جلد اول صفحہ ۶۴
(۳۳) علامہ اقبال کے دینی و سیاسی افکار صفحہ ۴۴
(۳۴) مکتوب اقبال بنام شاد محررہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء (اقبال کے محبوب صوفیاء صفحہ ۵۱۰)
(۳۵) "اقبال اور گجرات" از مظفر حسن ملک، مطبوعہ "اقبالیات" جنوری مارچ ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۲۴
(۳۶) مقالات محمود از نواب معشوق یار جنگ بہادر صفحہ ۶۴
(۳۷) درج ذیل سے استفادہ کیا گیا ہے
ا : مقالات محمود از نواب معشوق یار جنگ بہادر۔ جہلم، ۱۹۸۳ء
ب : تذکرہ مشائخ قادریہ از محمد دین کلیم۔ مکتبہ بنویہ لاہور، ۱۹۸۵ء
ج : اقبال کے دینی و سیاسی افکار از سید نور محمد قادری۔ گجرات، ۱۹۸۲ء

باب سوم

گجرات۔ اِقبال کا سسرال

حصہ اول:۔ "ہو گیا اِقبال قیدی محفل گجرات کا"

- رابطہ اور سلسلہ جنبانی
- انٹرنس کا امتحان۔ گجرات سنٹر سے
- بارات و نکاح
- کریم بی بی سسرال میں
- اِقبال گجرات میں
- ازدواجی زِندگی کے پہلے پندرہ سال
- کشیدگی (دورِ اضطراب)
- دوسری اور تیسری شادی
- علیحدگی اور کفالت
- اِقبال کی وفات کے بعد مہر و وراثت کا مسئلہ
- اِقبال کی پہلی شادی کا افسوسناک اِنجام

چند وجوہات کا جائزہ۔

"ایسی شخصیات کی زِندگیوں کے متنازعہ فیہ حصے بھی اِس قدر اہم ہوتے ہیں جس قدر کوئی اور۔ ایسی شخصیات کے معاملے میں ذاتی اور غیرذاتی کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان کی ذات 'غیرذات کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ ان کے مشاغل' معمولات' دِلچسپیاں اور ذاتی سطح کی سرگرمیاں۔ یہ تمام معاملات معنی خیزی کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کی خامیاں اور عیوب بھی کسی نوع کی جھجک یا شرمندگی کا باعث نہیں بنتے کہ عیوب سے پاک کیا کوئی بشر ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے عہد کا استعارہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی ذات اور ذاتی زِندگی کے معاملات تک کا مطالعہ اِس عہد کا مطالعہ کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے" (۱)

رابطہ اور سلسلہ جنبانی:۔

اِقبال اور کریم بی بی کی شادی کے لیے دونوں خاندانوں میں رابطہ کیسے ہوا اور دونوں کی نسبت کب طے پائی' اِس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیوں سے کام لیا گیا۔

وہ مضحکہ خیز فقرہ جسے اکثر سوانح نگاروں مثلاً خالد نظیر صوفی (۲) عبدالسلام خورشید (۳) صابر کلوروی (۴) محمد حنیف شاہد (۵) مظفر حسن ملک (۶) نے بلا سوچے سمجھے' اور بغیر کسی تحقیق کے نقل کر دیا' درج ذیل ہے۔

> "اِقبال جب انٹرنس کا امتحان دینے گجرات گئے' وہاں انھیں خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد نے دیکھا اور اپنی صاجزادی کے لیے پسند کر لیا"

اِس رابطے کی اصل حقیقت کی طرف آنے سے پہلے' اِس بیان پر ایک حقیقت افروز نظر ڈالی جاتی ہے۔

انٹرنس کے امتحان کے لیے اِقبال ۱۹ مارچ ۱۸۹۳ء کو دیگر ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ گجرات آئے۔ ڈاکٹر عطا محمد اِس وقت پنڈ دادن خاں' ڈسپنسری کے اِنچارج تھے اور وہیں اَپنے اہل خانہ کے ساتھ سکونت پذیر تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کیسے خبر ہوئی کہ سیالکوٹ سے کچھ لڑکے گجرات آئے ہیں' جنہیں دیکھنے کے لیے وہ گجرات آتے؟ اور کیا وہ سکولوں میں گھوم پھر کر اپنی صاجزادی کے لیے رشتہ تلاش کر رہے تھے؟ اور کیا دوسرے شہر سے آئے ہوئے سولہ سالہ لڑکے کو ایک نظر دیکھ کر اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا جاتا ہے؟ یا پھر انہوں نے سب لڑکوں کو قطار میں کھڑا کر کے' ایک ایک کو دیکھ کر' آخر اِقبال کو پسند کر لیا گیا ہوگا؟ اِقبال سے پوچھا ہوگا بیٹا کیا تم ہونہار ہو؟ کیا تم کشمیری' شیخ برادری سے تعلق رکھتے ہو؟ کیا تمہارا خاندان شریف ہے؟ اور اِقبال نے اِن سب باتوں کا مثبت جواب دیا ہوگا بلکہ یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں بڑا ہو کر "حکیم الامت" بننا چاہتا ہوں۔ چنانچہ شیخ عطا محمد اِقبال کو گھر لے گئے ہوں گے' سب نے پسند کیا ہوگا اور انہوں نے اِقبال سے کہا ہوگا "جاؤ بیٹا! اگلے مہینے کی ۴ تاریخ کو بارات لے کر آجاؤ!!

درج بالا فقرہ سب سے پہلے خالد نظیر صوفی نے "اقبال درونِ خانہ" میں لکھا تھا جو ۱۹۷۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔

> "گجرات کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد صاحب نے انہیں دیکھا تو اپنی صاجزادی کے لیے پسند کر لیا اور خود ہی سلسلہ جنبانی شروع کر دی" (۷)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صوفی صاحب نے ایک خطاب یافتہ سرجن کو جو عزت و امارت کے

اعتبار سے عروج پر تھا' کتنا بے بس دکھایا ہے کہ انہوں نے جونہی اقبال کو دیکھا اپنی بیٹی کے لیے نہ صرف پسند کر لیا بلکہ خود ہی سلسلہ جنبانی شروع کر دی کہ اگر یہ موقع گزر گیا تو شاید پھر کبھی انکی بیٹی کے لیے کوئی رشتہ نہ آئے!۔

بعد کے سوانح نگاروں نے اس فقرے کو من و عن نقل کرنے کو ہی تحقیق کا کمال سمجھا۔ کاش وہ اتنا سوچ لینے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ اقبال" اس وقت ڈاکٹر تھے نہ سر' حکیم الامت تھے نہ دانائے راز' شاعر مشرق تھے نہ مصور پاکستان' صرف "محمد اقبال متعلم جماعت وہم" تھے۔ ایک نظر دیکھنے سے کسی کی خاندانی شرافت اور ذاتی کردار بھی کھل کر سامنے نہیں آجاتا۔ اور کیا ڈاکٹر عطا محمد اتنے بے بس اور لاچار تھے کہ خود ہی سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ کیا ان کی بیٹی معذور تھی یا اس کی عمر ڈھل رہی تھی؟ صوفی صاحب اور دیگر مذکورہ بالا مصنفین یہ بھول گئے کہ خان بہادر کے مقابلے میں شیخ نور محمد کی مالی حالت اور سماجی حیثیت کیسی تھی۔ اس موقع کو خان بہادر نے نہیں بلکہ شیخ نور محمد نے "زریں موقع" جانا ہو گا۔ پھر شاید ان محققین کو یہ علم بھی نہیں کہ اس دور میں لڑکی والے نہیں بلکہ لڑکے والے "سلسلہ جنبانی" کرتے تھے۔

خان بہادر کی باقی چار بیٹیاں جن خاندانوں میں بیاہی گئیں وہ سب اقبال کے خاندان سے مالی لحاظ سے مستحکم تھے۔ ان میں سے دو (حمیدہ بیگم اور شہزادہ بیگم) سید خاندان میں بیاہی گئیں۔ درج بالا بحث کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ ڈاکٹر شیخ عطا محمد اتنے بے بس نہیں تھے کہ امتحان کے لیے آنے والے لڑکے کو اپنی بیٹی کے لیے پسند کر کے خود ہی بات چیت شروع کر دیتے۔ اور پھر صرف ایک ماہ بعد شادی بھی کر دیتے۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ ان کے دادا اور والد معاشرے میں معزز ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔

(۲) سید نذیر نیازی نے مسئلے کو مزید قیاسی بنا کر الجھا دیا ہے انہوں نے ایک گمان کو یقین کا رنگ دیتے ہوئے ایک ایسی بات لکھی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں:

"اگر شیخ صاحب (عطا محمد) نے ۱۸۹۸ء کے بعد سیالکوٹ میں بھی ملازمت کا کچھ وقت گزارا تو یقینی بات ہے کہ میر حسن کے علم و فضل کی شہرت انہیں میر حسن کی خدمت میں لے گئی ہو گی۔ ان سے نیاز مندانہ روابط ہو گئے ہوں گے۔ یوں شیخ نور محمد صاحب سے بھی ملاقات کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ان سے روابط بڑھے تو میر حسن کے توسط سے رشتہ طے پا گیا یا ان کے بزرگوں نے خود ہی بات شروع کر دی" (۸)

☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی تو ۱۸۹۸ء کا کیا مطلب؟

☆ پھر یہ کہ ڈاکٹر عطا محمد کبھی بھی سیالکوٹ میں بسلسلہ ملازمت قیام پذیر نہیں رہے۔

☆ تیسری بات یہ کہ ایک خطاب یافتہ سول سرجن ' مصروف بھی ہو' ایک سکول ماسٹر کے پاس کیا لینے جائے گا؟ (یاد رہے کہ اِس وقت تک مولوی سید میر حسن ایک اچھے سکول ماسٹر سے زیادہ کوئی مقام نہ رکھتے تھے)

☆ یہاں "ان کے بزرگوں" سے کس کے بزرگ مراد ہیں؟

(۳) ایک قیاس یہ بھی بیان کیا گیا کہ شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد چونکہ دونوں حضرت قاضی سلطان محمود کے ارادتمند تھے' یہ رشتہ اِن کے توسط سے طے ہوا ہو گا۔

(۴) ایک اور گمان یہ ہے کہ یہ رشتہ شیخ نور محمد صاحب کے ننھیالی خاندان (جلالپوجٹاں) کی وساطت سے طے پایا۔ مگر اس بات کی حیثیت بھی ایک قیاس سے زیادہ نہیں۔

اب آیئے اصل حقیقت کی طرف جسکی تصدیق اکثر قریبی ذرائع (۹) نے کی ہے مثلاً اِقبال کی ہمشیرہ کریم بی بی' اِقبال کے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد اور ڈاکٹر جاوید اِقبال وغیرہم۔

"اِقبال کی کریم بی بی سے نسبت ۱۸۹۲ء کے آغاز میں طے پائی جب وہ نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ یہ رشتہ ایک ایسے شخص کی وساطت سے طے ہوا جو سیالکوٹ میں ملازم تھا اور اِسکے دونوں خاندانوں سے مراسم تھے۔ اِس شخص کی تحریک پر لڑکے والوں نے سلسلہ جنبانی کی۔ جب خان بہادر کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ خاندان شریف ہے' کشمیری شیخ برادری ہے اور لڑکا ہونہار ہے' نیز یہ کہ شیخ نور محمد صاحب کی شرافت' صوفیانہ مزاج کی وجہ سے دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ پھر ڈاکٹر عطا محمد کی جاہ و حشم' شرافت اور دینداری نے شیخ نور محمد صاحب کو بہت متاثر کیا اور یوں یہ رشتہ طے پا گیا"

انٹرنس کا امتحان۔ گجرات سنٹر سے:۔

اِقبال نے انٹرنس کا امتحان گجرات مرکز سے دیا۔ اس زمانے میں سیالکوٹ امتحانی سنٹر نہیں تھا۔ پنجاب یونیورسٹی یہ امتحان لیتی تھی اور لاہور' راولپنڈی' گجرات' ملتان' ڈیرہ اسماعیل خان' دہلی' لدھیانہ اور امرتسر میں امتحانی مرکز ہوتے تھے۔ گجرات چونکہ سیالکوٹ سے قریب تھا چنانچہ اِس کا اِنتخاب ہوتا تھا۔

یہ امتحان ۲۰ مارچ ۱۸۹۳ء کو شروع ہوا۔ اِقبال اَپنے ہم جماعتوں کے ساتھ مشن ہائی سکول سیالکوٹ کی جانب سے اِس امتحان میں شریک ہوئے۔ اِقبال کا رولنمبر ۸۸۰ تھا۔ وہ ریل گاڑی کے ذریعے دیگر ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ گجرات پہنچے۔ سکاچ مشن ہائی سکول

گجرات میں دیگر لڑکوں کے ساتھ قیام پذیر رہے۔ کھانے پینے کا اِنتظام سب لڑکوں نے ملکر کیا۔ اِقبال نویں جماعت میں خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی دختر سے منسوب ہو چکے تھے۔ مگر اِس دور کی روایت کی رو سے شادی سے قبل سسرال والوں کے ہاں قیام کرنا مناسب خیال نہ کیا جاتا تھا۔ امتحان کے سلسلے میں اِقبال تقریباً دو ہفتے گجرات کے مشن سکول میں قیام پذیر رہے۔ یہ سکول، گجرات شہر کے مغرب میں سرکلر روڈ پر واقع ہے۔ گجرات میں مشن سکول کی بنیاد سکاچ مشن کے پادری پیٹرسن نے مئی ۱۸۶۵ء میں رکھی تھی۔ اور وہ عمارت جہاں اِقبال قیام پذیر رہے اور امتحان دیا وہ ۱۸۹۱ء کے قریب تعمیر ہوئی تھی۔

یکم مئی ۱۸۹۳ء کو انٹرنس کے اِس امتحان کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اِقبال کو کامیابی کی اطلاع بذریعہ تار ۴ مئی کو ملی تھی۔ اِقبال نے ۶۷۰ نمبروں سے ۴۲۴ نمبرز حاصل کر کے فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی اور میرٹ کے لحاظ سے یونیورسٹی میں آٹھویں پوزیشن پائی۔ حکومت نے بارہ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا(۱۰)

بارات و نکاح:۔

۴ مئی ۱۸۹۳ء کا دِن شیخ نور محمد، امام بی اور ان کے خاندان کے لیے خوشیوں کا سندیسہ لے کر طلوع ہوا۔ شیخ نور محمد کا نور نظر، امام بی کی آنکھوں کا تارا، عطا محمد کا پیارا بھائی، بہنوں کا لاڈلا ویر، سید میر حسن کا چہیتا شاگرد، اور نقی اور تقی کا جگری یار، سر پر سہرا سجائے گھوڑے پر سوار ہے۔ والدین برسوں بعد یہ خوشی دیکھ رہے ہیں کہ بڑے بیٹے کی ایسی خوشی کئی برس پہلے دیکھی تھی۔ پھر یہ بات اِس خوشی کو دوبالا کر رہی ہے کہ ان کا لخت جگر جس گھر کا داماد بن رہا ہے وہ شرافت اور امارت دونوں میں سربلند ہے۔ بہنیں خوشی کے شادیانے بجا رہی ہیں۔ سب کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں۔ ایسے میں دولہا کی انٹرنس میں کامیابی کی خبر خوشیوں کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ شیخ نور محمد اپنے "اِقبال" پر نازاں ہیں۔ مولوی میر حسن اپنے ہونہار شاگرد کی کامیابی پر شاداں ہیں۔ باراتیوں نے شیخ نور محمد، شیخ عطا محمد اور سید میر حسن کو مبارک باد دی ہے۔ ادھر عورتیں اِقبال کی "بے جی" اور بہنوں کو مبارک باد دے رہی ہیں۔ دولہا کے گورے چہرے پر شرم اور شادمانی کی سرخی نمایاں ہے۔ بارات گجرات روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ بارات میں کوئی ساٹھ ستر افراد شامل ہیں۔ گھر کے افراد کے علاوہ، اِقبال کے بہنوئی، سید میر حسن اور ان کے صاحبزادے سید نقی اور سید تقی، حکیم سید حسام الدین، سید حامد شاہ، سید عمر شاہ، حاجی نور محمد ولد حاتم میر، حکیم کرم

دین وزیر آبادی' شیخ میراں بخش اور کچھ دیگر عزیز و اقارب' اِقبال کی بہنوں کے سسرال سے' اِقبال کے ننھیال سے اور محلے کے کچھ اور لوگ بھی بارات میں شریک ہیں۔ اِقبال کے ایک بہنوئی نے پسرور کی مشہور کنچنی پیراندتی کو بھی بلا رکھا ہے۔ بارات ریل گاڑی پر گجرات روانہ ہوتی ہے۔

ادھر خان بہادر اور اِنکے دوست اَحباب' رشتہ دار' اور معززین شہر بارات کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے ہیں۔ تقریباً ۴ بجے بارات پہنچتی ہے۔ بارات کا شاندار اِستقبال کیا جاتا ہے۔ شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد فرطِ محبت سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ دولہا سے ملا جاتا ہے اور بارات کے ساتھ آنے والے بزرگوں سے معانقہ کیا جاتا ہے۔ شیخ عطا محمد متفکر ہیں کہ باراتیوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رہ جائے اور خوش بھی کہ آج اپنی دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد رسمِ نکاح ادا کی گئی ہے۔ محمد اِقبال اور کریم بی بی کا نکاح' دربار شاہدولہ کے خطیب و پیش امام حافظ غلام احمد نے پڑھایا۔ جنہیں قاضی سلطان محمود کا ارادتمند ہونے کی وجہ سے خصوصی طور پر بلایا گیا۔ ورنہ قریب کی مساجد کے امام اور نکاح خواں بھی موجود تھے۔ نکاح کے دوران دونوں طرف کے بزرگ موجود تھے۔ دولہا کی طرف سے سید میر حسن نے بطور گواہ دستخط کیے جبکہ لڑکی کی طرف سے نامور شاعر میاں محمد بوٹا نے دستخط کیے۔ اِس نکاح کی یہ خصوصیت تھی کہ مستقبل کے عظیم ترین شاعر و فلسفی کے نکاح میں حال کی دو عظیم علمی شخصیات بطور گواہ موجود تھیں۔

دیگر گواہوں میں حکیم کرم دین ولد عبد الغفار ساکن وزیر آباد (اِقبال کی بڑی بہن کے خسر)' حاجی نور محمد ولد حاتم میر کشمیری سکنہ سیالکوٹ (شیخ نور محمد کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد کی نواسی کے میاں فضل دین میر کے چچا) اور گجرات سے شیخ الہ بخش شامل تھے۔ نکاح نامہ محمد الدین ساکن گجرات نے تحریر کیا۔

حق مہر دو ہزار روپے مقرر کیا گیا جس میں سے ایک ہزار اِسی وقت ادا کیا گیا جبکہ ایک ہزار روپے موجل قرار پایا۔ اِس دور کے لحاظ سے حق مہر کی یہ رقم' خاصی خطیر تھی۔

نکاح اور کھانے کے بعد بارات نے رات کو وہیں قیام کیا۔ رات کو بزرگوں نے جن میں شیخ نور محمد اور سید میر حسن بھی شامل تھے' ایک بند کمرے میں بارات کے ساتھ آنے والی کنچنی پیراندتی سے اساتذہ فارسی' خصوصاً حافظ شیرازی اور مولانا روم کا کلام سنا۔ یہ بات اِس دور کی محفلوں کا ثقافتی پہلو تھی اور اکثر گانے والیاں فارسی' اُردو کا اچھا ذوق رکھتی تھیں اور اساتذہ کا کلام بڑے سلیقے سے سناتی تھیں۔ اور اہلِ ذوق کا ان سے کلام

سنتا عار نہ سمجھا جاتا تھا۔ (۱۱) (۱۹۰۹ء میں جب کریم بی بی کی چھوٹی بہن فاطمہ بی بی کی شادی خواجہ فیروز الدین سے انجام پائی تب بھی ایسا انتظام موجود تھا)۔ (۱۲) بہت سے جہیز اور دعاؤں کے ساتھ کریم بی بی کو رخصت کیا گیا۔

نکاح نامہ :۔

"من کہ محمد اقبال ولد نور محمد المعروف شیخ نتھو قوم شیخ ساکن سیالکوٹ کا ہوں جو کہ اس وقت عقد نکاح من مقرر ہمراہ مسماہ کریم بی بی دختر شیخ عطا محمد صاحب ڈاکٹر رئیس گوجرات بمقابلہ مہر مبلغ دو ہزار روپیہ کہ نصف آں مبلغ ایک ہزار روپیہ صرف ملکہ معظمہ قیصر ہند دام اقبالہا ہوتے ہیں۔ نصف آں معجل و نصف آں موجل منعقد ہوا ہے۔ لہٰذا این چند کلمہ بطریق نکاح نامہ کے یعنی کابین نامہ کے بالمشافہ گواہان لکھ دیے کہ آیندہ کے واسطے سند رہے۔ مورخہ ۴ ماہ مئی ۱۸۹۳ء

العبد

محمد اقبال ولد نور محمد......(۱۳) سیالکوٹ

گواہ = محمد بوٹا ممبر کمیٹی ساکن گجرات بقلم خود (دستخط)

گواہ = مولوی میر حسن ولد محمد شاہ سید ساکن سیالکوٹ (دستخط)

گواہ = حکیم کرم دین ولد عبدالغفار ساکن وزیر آباد (دستخط)

گواہ = شیخ الہ بخش ولد حاجی پیر بخش بیگم مسجد (دستخط) (۱۴)

گواہ = حاجی نور محمد ولد حاتم میر قوم کشمیری سکنہ سیالکوٹ (دستخط)

بقلم محمد الدین بمقام گوجرات تحریر یافت

مہر عدالت

العبد

بقلم خود حافظ غلام احمد امام مسجد دربار شاہدولہ صاحب (۱۵)

(اصل نکاح نامہ کا عکس دستاویزات کے حصے میں شامل ہے)

کریم بی بی سسرال میں :۔

شادی کے بعد جب کریم بی بی اپنے سسرال میں آگئیں تو نہ صرف سسرالی خاندان بلکہ پورے محلے کی توجہ کا مرکز تھیں۔ وہ ایک بہت بڑے خاندان کی بیٹی تھیں۔ اقبال کی والدہ ان کا بڑا خیال رکھتیں اور شیخ نور محمد بھی نہایت شفقت سے پیش آتے۔ انہیں یہ بھی

احساس تھا کہ کریم بی بی بہت ناز و نعم میں پلی ہے اور یہاں وہ سب کچھ موجود نہیں۔ تاہم انہیں یہ بھی یقین ہو گا کہ ان کی محبت و شفقت دُنیاوی آسائشوں کی کمی کو پورا کردے گی۔
ادھر اِقبال کے لیے یہ خوشیوں کا زمانہ تھا۔ شادی سے اگلے روز انہوں نے سکاچ مشن کالج کی فرسٹ ایئر کلاس میں داخلہ لیا(۱۶)۔
کریم بی بی کی تربیت ایک سلجھے ہوئے' دینی رجحان رکھنے والے گھر میں' ایک پڑھے لکھے' باشعور حافظ قرآن باپ نے کی تھی۔ کریم بی بی نے اپنے خسر اور ساس کی خدمت کی سعادت حاصل کی اور انکے دِلوں میں اپنی جگہ بنای۔ شیخ نور محمد کا گھر مجموعی طور پر ایک غریب گھرانہ تھا اور خود اِقبال ابھی زیرِ تعلیم تھے اِس لیے ضروریات زِندگی کے معیار میں تبدیلی کا احساس ایک قدرتی امر تھا۔
اِقبال ستمبر ۱۸۹۵ء تک یعنی ایف اے کا نتیجہ آنے تک سیالکوٹ میں ہی اپنے والدین کے ساتھ رہے۔ پھر لاہور چلے گئے۔ اِقبال کے لاہور چلے جانے کے بعد' کریم بی بی کچھ عرصہ سیالکوٹ اور کچھ گجرات میں گزارتیں یا جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں تعینات ہوتے۔

اِقبال گجرات میں:۔

شادی کے بعد سے لے کر ۱۸۹۹ء تک اِقبال اکثر گجرات آیا کرتے تھے جب تک سیالکوٹ میں تھے تو چھٹیوں میں کریم بی بی کے ساتھ گجرات آتے۔ جب تعلیم کے سلسلے میں لاہور چلے گئے تو گرمیوں کی چھٹیوں میں سیالکوٹ آتے "اور کبھی کبھار چند ہفتوں کے لیے اپنے سسرال گجرات چلے آتے" (۱۷) اِس کے علاوہ سسرال والوں کی غمی خوشی میں بھی شریک ہوتے۔
کٹڑہ شالبافاں میں جس گھر میں خان بہادر کا خاندان رہائش پذیر تھا وہ "خان بہادر دی حویلی" یا "ڈاکٹر عطا محمد دی حویلی" کہلاتا تھا' یہ ایک محل نما کوٹھی تھی جسے خان بہادر نے خود تعمیر کرایا تھا۔ اِس دور میں یہ گجرات کی سب سے شاندار کوٹھی تھی اور اَپنے وقت کی تمام جدید آسائشوں سے مزین تھی۔ ڈاکٹر عطا محمد اور ڈاکٹر غلام محمد کی وفات کے بعد یہ کوٹھی شیخ محمد مسعود کے حصے میں آئی' وہ جب لاہور چلے آئے تو اِسے اپنی پھوپھی نواب بی بی کے داماد شیخ بشیر کے ہاتھوں ۱۴۰۰۰ روپے میں فروخت کر دیا۔ پھر جب شیخ بشیر صاحب کراچی منتقل ہوئے تو یہ گھر اصغر بٹ کے ہاتھ بیچ دیا۔ اصغر بٹ نے اِسے گرا کر جدید طرز کی مختصر کوٹھی تعمیر کی جس پر "رضی ہاؤس" کی تختی آویزاں کی اور ساتھ چند دکانوں پر مشتمل "رضی

مارکیٹ" بنا دی (۱۸) اب یہ گھر اور مارکیٹ جہاں کبھی خان بہادر کی حویلی ہوا کرتی تھی ایک مرتبہ پھر خرید و فروخت کے عمل سے گزر چکا ہے۔ اِس مکان کے مشرق میں میاں محمد بوٹا شاعر اور مغرب میں سائیں فیروزالدین کا گھر ہوا کرتا تھا۔ یہی وہ مکان تھا جسے برسوں اِقبال نصیب ہوتا رہا۔ اِس کے علاوہ دوسرا گھر جہاں اِقبال' قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے' ابو صاحب' یعنی سردار عبدالغفور خان درانی کا گھر تھا۔ ابو صاحب' اِقبال کے شاگرد' دوست' اور عقیدتمند تھے اور اِن کا گھر مسلم بازار سے متصل تھا۔ یہ گھر' جو اب بھی موجود ہے' خان بہادر کے گھر سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر ہو گا۔ یہاں اِقبال کی آمد و رفت ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی جب ابو صاحب سے مراسم قائم ہوئے۔

گجرات میں قیام کے دوران' اِقبال کی مصروفیات کے بارے میں بتانے والا کوئی بھی شخص آج زِندہ نہیں۔ تاہم اِس دور میں گجرات کی علمی و اَدبی مجالس میں اِقبال کی شرکت کے شواہد ملتے ہیں۔ اِن اَدبی محافل کا کوئی تذکرہ محفوظ نہیں اور اِن کا سراغ لگانا' اب آسان نہیں تاہم ایسی دو مجالس کے کچھ دھندلے سے آثار ملتے ہیں۔

ایک محفل "بونگا کلب" کے نام سے قائم تھی' جسے گجرات کے زِندہ دِلوں نے قائم کیا تھا۔ اِس کلب کے روحِ رواں چودھری خوشی محمد ناظر تھے۔ (۱۹) اِس کلب کا مقصد "اَدبی تفریح" ہوتا تھا جیسے بعد میں کشمیر میں بھی چودھری صاحب نے "انجمن مفرح القلوب" قائم کی تھی۔ اِس کلب میں اس دور کے گجرات کے سبھی اہلِ دِل اور اہلِ ذوق شامل تھے اور اِس کا اجلاس مولوی عبدالقادر (م۔۱۸۸۹ء) رئیس گجرات' حاکم اعلیٰ عدالت جموں کی کوٹھی میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ یہ کوٹھی رحمان شہید روڈ پر واقع ہے' یہ گجرات کی سب سے قدیم کوٹھی تھی اور اِسے انگریز حکومت نے تعمیر کرایا تھا۔ (اب اِسے گرا کر جدید طرز کی عمارت میں بدل دیا گیا ہے) "بونگا کلب" میں دوستوں کی تفریح کے لیے ہلکے پھلکے موضوعات پر نظمیں ہوا کرتی تھیں' اور کبھی کبھی موسیقی کی محفل بھی جمتی تھی۔ اِقبال بھی اِس کلب کے ممبر تھے اور اِنہیں "گجرات کا داماد" اور مہمان ہونے نیز اِن کے علمی مرتبے کے اعتبار سے بہت عزت دی جاتی تھی۔

"بونگا کلب" کے ممبران "بونگے" کہلاتے تھے۔ چودھری خوشی محمد ناظر نے اِن پر ایک نظم لکھی تھی جس کے چند شعر پیشِ خدمت ہیں۔ (۲۰)

مست الست سدا متوالے سیدھے سادے بھولے بھالے
زید کی ہو یا عمر کی گٹھڑی اَپنے سر پہ اٹھانے والے
آ کے کسی روباہ کے دم میں شیر سے آنکھ لڑانے والے

چھوڑ کے اپنی ناؤ بھنور میں بیڑے پار لگانے والے
ہونگے ہیں اللہ کے پیارے سیدھے جنت جانے والے

اِس کے علاوہ اِس دور میں ایک دینی مجلس "انجمن تعلیم القرآن" کے نام سے قائم تھی۔ اِس انجمن میں مولوی امام الدین اور شیخ عطاء اللہ وکیل جیسے اہل علم اصحاب شامل تھے اور اِس انجمن کا مقصد قرآن فہمی کو فروغ دینا تھا۔ شیخ عطاء اللہ سے علامہ کے مراسم اور خط و کتابت بھی تھی اور وہ ان کی اِس خدمت کے بہت مداح تھے۔ اِس انجمن کی محافل میں اِقبال" کی شرکت کا بھی امکان ہے۔

گجرات، جو علم و آدب کے لحاظ سے زمانہ قدیم سے بہت زرخیز رہا ہے، انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی علم و آدب کے اعتبار سے نمایاں تھا۔ اِس دور میں گجرات میں اور بھی علمی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ گجرات کے ہی ایک مشاعرے کی یادگار ایک غزل 'باقیات اِقبال میں شامل ہے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہاں کے مشاعروں میں بھی شمولیت کیا کرتے تھے۔

ابتدائی دور کی یہ غزل اِقبال کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ "انوار اِقبال" مرتبہ بشیر احمد ڈار (صفحہ ۳۱۳) میں اِس غزل کا ایک شعر اس نوٹ کے ساتھ دیا گیا ہے۔

"ہو گیا اِقبال قیدی محفل گجرات کا
کام کرتے ہیں یہاں اِنسان بھی صیاد کا

جناب خواجہ عبدالرشید منتظم علی جناح سنٹرل ہسپتال کراچی بروایت لیفٹیننٹ جنرل جناب محمد افضل فاروقی بیان کرتے ہیں کہ اِقبال کی پہلی شادی خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد وائس کونسل جدہ ساکن کٹڑہ شالبافاں گجرات کی دختر سے ہوئی تھی۔ اِقبال شادی کے بعد اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر اِقبال نے یہ شعر پڑھا۔ یہ شعر غالباً ۱۸۹۸ء کا ہے"

"روزگار فقیر" جلد دوم (صفحہ ۳۰۰) پر یہ ساری غزل درج ہے۔ جو ابتدائی نوٹ کے ساتھ ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

"یہ ابتدائی غزل غالباً گجرات کے مشاعرے کے لیے کہی گئی"

کام بلبل نے کیا ہے مانی و بہزاد کا
برگِ گل پر اِس نے فوٹو لے لیا صیاد کا
پہلے یہ بیگانگی ہم کو نظر آئی نہ تھی
سبزۂ گلشن پہ سایہ پڑ گیا صیاد کا

چلتے چلتے باغ میں بلبل نے یوں گل سے کہا
تجھ کو گلچیں کا مبارک، مجھ کو گھر صیاد کا
کچھ کدورت ہے دلوں کی کچھ دھوآں آہوں کا ہے
یہ زمین و آسمان ہے خانہ صیاد کا
یادِ گلشن ہے زباں پر، لب پہ ذکر آشیاں
داغِ ہجرِ گل جگر میں، دل میں ڈر صیاد کا
بیکسوں کے پاس کون آئے قفس میں ہمصفیر
یادِ گل آتی ہے یا آتا ہے ڈر صیاد کا
ہائے کس کس لطف سے ظالم نے بتلایا مجھے
بھول کر گلچیں سے پوچھا تھا پتہ صیاد کا
چلتے چلتے خارِ گل سے کیوں اٹک جاتا ہے یہ
دل کسی بلبل کا ہے، دامن، مگر صیاد کا
قتل کرتا ہے مجھے، آتا نہیں ہے دل میں رحم
آہن مقراض کا ہے دل مگر صیاد کا
ہوں کبھی اِس شاخ پر میں اور کبھی اِس شاخ پر
ناک میں آخر کو دم آیا مرے صیاد کا
ہو گیا اِقبال قیدی محفلِ گجرات کا
کام کیا اخلاق کرتے ہیں مگر صیاد کا

خواجہ عبدالرشید (۱۹۱۲ـ۱۹۸۳ء) کے درج بالا بیان، بروایت جنرل افضل فاروقی، میں اِنہیں نہ صرف شعر کا دوسرا مصرع ٹھیک طرح یاد نہ رہا بلکہ وہ یہ بھی بھول گئے کہ صرف ایک شعر نہیں بلکہ مشاعرے میں پوری غزل سنائی گئی تھی۔ اِنہیں زمانہ بھی یاد نہیں رہا۔ یہ غزل ۱۸۹۸ء کی نہیں بلکہ ۱۸۹۳ء کی ہے کیونکہ اِسی زمین میں اِقبال کی ایک غزل رسالہ "زبان" دہلی کی نومبر ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اِس رسالے نے ایک تحریری مشاعرہ کروایا تھا جسکا طرح مصرع تھا (۲۱)

خوب طوطی بولتا ہے اِن دِنوں صیاد کا

اِقبال کی ارسال کردہ غزل کا مطلع تھا

کیا مزہ بلبل کو آیا شیوہ بیداد کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے، اڑ اُڑ کے جو گھر صیاد کا

گجرات کے مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں: (۲۲)

"۱۸۹۸ء تو بہت آگے کی بات ہے۔ یہ غزل جس کے ہر شعر میں بالا التزام صیاد کا قافیہ باندھا گیا ہے اور جسکے تمام اشعار میں نہایت بے لطف مضمون بندی اور قافیہ پیمائی کے سوا اور کچھ نہیں' یقیناً سیالکوٹ کی ابتدائی غزلوں میں سے ہو گی۔ لاہور کی محفلوں کا رنگ دیکھنے کے بعد اِقبالؒ سے ایسی بد مذاقی کی توقع نہیں جا سکتی"

اِقبال کو کبوتروں کا شوق بچپن سے تھا۔ قیام لاہور کے دوران بھی یہ شوق کافی عرصہ قائم رہا۔ اور اِقبال گجرات سے بھی کبوتر منگواتے رہے اور جب گجرات آتے تو التزام سے چند ایک کبوتر بازوں سے ملتے جو ان کے سسرالی محلے میں رہتے تھے۔ خان نیازالدین خان (۱۸۶۵۔۱۹۲۹ء) کے نام اِقبال کے خطوط میں کثرت سے کبوتروں کا ذِکر ملتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: (۲۳)

"اِس میں شک نہیں کہ آپ کے کبوتروں کے برابر میں تجربے میں کوئی نسل کبوتروں کی نہیں آئی۔ میں نے لدھیانہ' ملتان' سیالکوٹ' گجرات' شاہجہانپور سے کبوتر منگوائے مگر اتنی تعداد اچھے خواص کی کسی نسل میں جمع نہیں جتنی آپ کے کبوتروں میں۔

افسوس کہ اِقبال کی کبوتربازی میں مدد دینے والے کسی گجراتی کا سراغ نہیں مل سکا۔

اِنہی ایام گجرات کی یادگار ایک لطیفہ ہے جو اِقبال سے منسوب چلا آتا ہے۔ کہ ایک مرتبہ اِقبال نہانے کے لیے غسل خانے میں گئے تو اچانک پھسل کر گر پڑے۔ اَحباب میں سے کسی نے پوچھا' "حضرت خیر تو ہے" اندر سے جواب ملا' کچھ نہیں' بنیان گری ہے" "ارے صاحب' بنیان گرنے سے ایسا دھاکہ!" تھوڑی دیر بعد جب اِقبال باہر نکلے تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے' "بنیان اِقبال سمیت گری تھی' مگر گھبرایئے نہیں آپ کا اِقبال بال بال بچ گیا ہے"

اِسی دور کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ گجرات کے چند احباب اِقبال سے ملنے سیالکوٹ گئے۔ خوب محفل جمی۔ اِقبال بہت لطف اندوز ہوئے اور آئندہ پیر دوبارہ ملنے کے وعدے پر محفل برخاست ہوئی۔ شدید بارش آڑے آئی اور گجراتی احباب مقررہ دِن ملاقات کے لیے سیالکوٹ نہ جا سکے۔ چند روز بعد ملاقات کے لیے یہ اَحباب حاضر ہوئے تو اِقبال نے اِن سے حسب وعدہ نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ اِنہوں نے شدید بارش کا ذکر کیا۔ "جناب گوڈے گوڈے پانی تھا" یہ سن کر اِقبال نے کہا "میں تہانوں گجراتیا نئیں منداؔ'

گجرات دیاں لوکاں واتے گوڈے گوڈے پانی کوئی گل نئیں۔ نیت ہووے تے اوہ کچے گھڑے تے دریا وچ وی ٹھل پیندے نیں" اور محفل زعفران زار بن گئی۔ پھر کہنے لگے: تساں تے سوہنی کولوں وی سبق نئیں سکھیا' جے کچے گھڑے کولوں ڈر لگدا سی تے لوہے دیاں مٹاں تے تر آؤندے" پھر ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور فرمایا' "جو قومیں اپنے اندر احساسِ زیاں پیدا نہیں کرتیں وہ ہمیشہ غلام رہتی ہیں" (۲۴)

گجرات آمد ورفت کا سلسلہ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۵ء تک مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ پردیس میں گزرا۔ واپسی (جولائی ۱۹۰۸ء) پر اپنے سسرال والوں سے ملنے ضرور آئے ہوں گے۔ اِس کے بعد وفات تک ان کے گجرات آنے میں سسرال والوں سے کشیدہ تعلقات رکاوٹ بنے رہے البتہ دو تین بار ان کے یہاں ورود کے شواہد موجود ہیں مثلاً ۱۹۰۹ء میں جب اِن کی خواہر نسبتی فاطمہ بی بی کی شادی ہوئی تو وہ گجرات آئے تھے اور بارات کا اِستقبال کرنے والوں میں شامل تھے (۲۵) اِسی طرح ۱۹۲۵ء میں سردار عبدالغفور درانی کے والد سردار محمد حسین خان کی وفات پر بھی اِقبال گجرات آئے تھے۔

ازدواجی زِندگی کے پہلے پندرہ سال:۔

یومِ نکاح (۴ مئی ۱۸۹۳ء) سے لے کر لندن روانگی (یکم ستمبر ۱۹۰۵ء) تک اور پھر اِقبال کی وطن واپسی (جولائی ۱۹۰۸ء) تک اِنکی ازدواجی زِندگی میں کوئی غیر معمولی اختلاف نظر نہیں آتا۔ شادی کے بعد دو سال اِقبال سیالکوٹ میں رہے۔ پھر قیام لاہور کے دوران چھٹیوں میں سیالکوٹ آتے اور اپنے والدین اور اہل و عیال کیساتھ وقت گزارتے۔ ۱۸۹۶ء میں معراج بیگم پیدا ہوئیں اِقبال لاہور میں ہوسٹل میں رہتے تھے چنانچہ کریم بی بی اور بچوں کو ساتھ نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ کریم بی بی کا زیادہ تر وقت اپنے میکے میں گزرتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں آفتاب اِقبال پیدا ہوئے۔ گویا اِقبال دورانِ تعلیم ہی دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔

مئی ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد اِقبال' اورنٹیل کالج میں میکلوڈ عربیک ریڈر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے مگر اب بھی وہ اِس قابل نہ ہوئے تھے کہ خاندان کو ساتھ رکھ سکتے۔ ۱۹۰۱ء میں ایک اور بچہ پیدا ہوا مگر پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو گیا۔ اِس دور میں اِقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے عارضی اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ وہ لندن جانے تک گورنمنٹ کالج میں ہی انگریزی اور فلسفہ کے اُستاد کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے اور ساتھ ساتھ لاہور کے ادبی حلقوں میں بھی متعارف ہوتے گئے۔

اِس دور (۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۵ء) تک میاں بیوی میں ناچاقی کو کوئی بات نظر نہیں آتی۔
سید حامد جلالی لکھتے ہیں: (۲۶)

"جب تک علامہ سیالکوٹ میں رہے آپنے بیوی بچوں کے ساتھ محبت کرتے رہے۔ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک میاں بیوی میں ناچاقی کا کوئی شخص ثبوت نہیں دے سکتا"

تاہم سید نذیر نیازی لکھتے ہیں (۲۷)

"۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک دوران ملازمت میں جب بھاٹی دروازہ میں قیام تھا' والدہ آفتاب اِقبال اِن کے ساتھ لاہور نہیں آئیں۔ سیالکوٹ میں ہی رہیں یا پھر گجرات۔ گجرات سے سیالکوٹ آنا جانا رہتا۔ محمد اِقبال بھی لاہور سے اکثر سیالکوٹ جاتے بلکہ گجرات بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی سے کشیدگی کی ابتداء اِنہی دِنوں میں ہو گئی تھی"

مگر نیازی صاحب نے اِس بات کی وضاحت نہیں کی۔ بہرطور اگر ایسی کوئی بات تھی تو اِسکا کوئی اظہار نہیں ہوا۔ اور مجموعی طور پر ازدواجی زِندگی کے یہ پندرہ سال بظاہر نارمل نظر آتے ہیں۔ اِس دور کے کسی خط یا نظم وغیرہ سے بھی ایسی کسی بات کا اشارہ نہیں ملتا۔ اِس دور کی ایک نظم بعنوان "زہد و رندی" میں جہاں اِقبال نے اپنی وسیع مشربی' راگ پسندی' حسن دوستی اور بے داغ جوانی کا ذِکر کیا ہے' وہاں ایسی کسی بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اِقبال اپنے گردوپیش سے یا اپنی گھریلو زِندگی سے ناخوش یا غیر مطمئن تھے۔ اور نہ ہی حسن و عشق کی کسی واردات کا اظہار ہوتا ہے۔

۱۹۰۷ء کے لگ بھگ ڈاکٹر عطا محمد اپنی بیٹی فاطمہ بی بی کے لیے لڑکے کے اِنتخاب کے لیے اِقبال سے بیرون ملک رابطہ کرتے ہیں اور ان کی رائے پر ایک ایسے لڑکے سے اپنی بیٹی بیاہنے پر رضامند ہو جاتے ہیں جسے وہ خود تعلیمی میدان میں کمزور ہونے کی وجہ سے مسترد کر چکے تھے۔ (۲۸)

کشیدگی (دورِ اضطراب)

اِقبال اور کریم بی بی میں کشیدگی کی ابتداء ۱۹۰۸ء میں ان کی وطن واپسی کے بعد ہوئی۔ اس سے پہلے اگر کوئی اندرونی اختلاف تھا بھی تو اس کا کہیں اظہار نہیں ملتا تاہم ۱۹۰۸ء کے بعد ہمیں اس کا واضح اظہار خطوط کے ذریعے ملتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ ۳۲ سال عمر ہو چکی تھی لیکن اب وہ اپنی ازدواجی

زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ یہ زمانہ اِن کے لیے ذہنی کرب کا زمانہ تھا۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:

"۱۹۰۸ء کے وسط میں چچا جان انگلستان سے واپس آئے اور لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ اِن ایام میں بھی وہ لاہور میں تنہا رہتے تھے۔ چونکہ بیگم سے تعلقات خوشگوار نہ تھے اِس لیے آپنے والدین اور بڑے بھائی سے دوسری شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میاں جی (شیخ نور محمد) اور ابا جی (شیخ عطا محمد) نے بہت کوشش کی کہ دوسری شادی کی نوبت نہ آئے اور میاں بیوی میں موافقت ہو جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی میں اختلافات گہرے تھے اِس لیے مفاہمت کی کوشش کامیاب نہ ہوئی' یہ ۱۹۰۹ء کی بات ہے" (۲۹)

اِس زمانہ میں اِقبال ذہنی اذیت اور جذباتی ہیجان کے جس دور سے گزر رہے تھے اِسکا اظہار ہمیں چند خطوط میں ملتا ہے جو انہوں نے اِس دور (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۱ء) میں آپنے کچھ قریبی دوستوں کو لکھے: عطیہ فیضی (۱۸۸۱-۱۹۶۷ء) کے نام ان کے درج ذیل خط میں کس قدر اذیت کا اظہار ہے کہ وہ ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے' شراب نوشی میں پناہ لینے اور کسی قادر مطلق شیطان پر ایمان لے آنے کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں: ۹' اپریل ۱۹۰۹ء کے اِس خط میں اِقبال لکھتے ہیں: (۳۰)

"ہاں! میں نے علی گڑھ میں فلسفہ کی پروفیسری سے اِنکار کر دیا ہے اور چند روز قبل میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی اِنکار کر دیا ہے۔ میں کسی قسم کی ملازمت میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں جلد از جلد اِس ملک سے بھاگ کر کہیں چلا جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو اُسکی وجہ معلوم ہے۔ میں آپنے بھائی کا ایک طرح سے اخلاقی قرضدار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔ میری زِندگی اِنتہائی اجیرن بنی ہوئی ہے۔ وہ میری بیوی کو مجھ پر ٹھونس رہے ہیں۔ میں نے آپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ اِنہیں میری شادی ٹھہرانے کا حق نہیں تھا خصوصاً جب میں نے اِس قسم کے تعلق میں پڑنے سے اِنکار کر دیا تھا۔ میں اِسکی کفالت کو تیار ہوں لیکن اِسے ساتھ رکھ کر اپنی زِندگی کو اجیرن بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ایک اِنسان ہونے کے ناتے مجھے آسودگی کے حصول کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا قدرت مجھے یہ حق دینے سے اِنکاری ہوئے تو میں دونوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دونگا۔ اِسکا

یہی علاج ہے کہ میں اِس بد بخت ملک کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جاؤں یا پھر شراب میں پناہ لوں جو خود کشی کو آسان بنا دیتی ہے۔ کتابوں کے یہ مردہ' بنجر اوراق مجھے مسرت نہیں دے سکتے۔ میری روح میں کافی آگ موجود ہے جو اِن (اوراق) اور تمام سماجی رسوم کو جلا سکتی ہے۔ آپ کہیں گی ایک اچھے خدا نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر اِس زندگی کے حقائق ایک مختلف نتیجہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ فکری طور پر کسی اچھے خدا کی بجائے کسی قادر مطلق شیطان پر یقین رکھنا زیادہ آسان لگتا ہے۔ براہ کرم اِن خیالات کے اظہار پر معاف کیجئے گا۔ میں ہمدردی کا خواستگار نہیں۔ میں تو صرف اپنی روح کے بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں اِسی وجہ سے میں نے اَپنے خیالات کے اظہار کی جرات کی ہے"

چند ہفتے بعد ۱۷' اپریل ۱۹۰۹ء کو دوبارہ لکھتے ہیں: (۳۱)

"آج کل میں دوسروں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی بدنصیب ذات مصیبت انگیز خیالات کی کان بنی ہوئی ہے جو سانپ کی طرح میرے روح کے گہرے اور تاریک غاروں سے نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرا بن جاؤں گا اور گلیوں میں پھرتا نظر آوں گا اور متجس لڑکوں کی ایک جماعت میرے پیچھے ہو گی۔

یہ خیال نہ کیجئے گا کہ میں یاس پسند ہوں۔ میں آپکو بتاؤں کہ غم بہت ہی لذیذ چیز ہے اور میں اپنی بد قسمتی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو سمجھتے ہیں کہ میں خوش و خرم ہوں"

عطیہ ہی کے نام ایک اور خط سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ اذیت کا یہ دور ابھی جاری تھا۔ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو لکھتے ہیں: (۳۲)

"میرے دِل میں اب شاعری کا کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میری شاعری کی خوبصورت دیوی کو قتل کر دیا ہے اور مجھ سے میرا سارا تخیل چھین کر مجھے رنڈوا بنا دیا ہے"

یہ ذہنی کیفیت اِس سے اگلے سال بھی جاری رہی۔ سید اَکبر حسین اَکبر الہ آبادی (۱۸۴۶۔۱۹۲۱ء) کے نام ایک خط محررہ ۶' اکتوبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں: (۳۳)

"لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اِس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس

سے دِل کھول کر اَپنے جذبات کا اظہار کیا جاسکے:

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سے مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں "جتنا بڑا شہر ہو اتنی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔" سو یہی حال میرا لاہور میں ہے"
یہ خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ اِس دور میں اِقبال جیسا مضبوط شخصیت کا مالک' مرد بکسقدر دکھ اور اذیت کا شکار تھا۔ دوسری طرف کریم بی بی جو ایک عورت تھی کے لیے یہ زمانہ کتنے کرب اور تکلیف کا ہو گا۔ جسے شادی کے بعد آسودگی کا شاید ہی کوئی لمحہ نصیب ہوا تھا۔ جس نے ۱۵ سال بے سرو سامانی میں گزار دیئے اور اب اچھا وقت آنے والا تھا تو اِقبال نے اِسے قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔

دوسری اور تیسری شادی:۔

جب مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور اِقبال دوسری شادی پر بضد رہے تو انکے بزرگوں کو آمادگی ظاہر کرنا پڑی۔ چنانچہ لاہور کے ایک کشمیری خاندان کی ایک دوشیزہ سے رشتہ طے ہوا اور نکاح پڑھا گیا۔ رخصتی کچھ عرصہ بعد ہونا قرار پایا۔ مگر ابھی اِقبال کی متاہل زِندگی کا ستارہ گردش میں تھا۔ اِس دوران اِقبال کو چند گمنام خطوط موصول ہوئے جن میں دُلہن (سردار بیگم) کے چال چلن پر حرف زنی کی گئی تھی۔ اِقبال پر مزید مایوسی طاری ہو گئی۔ رخصتی التواء میں پڑ گئی اور انہوں نے طلاق کے انتہائی قدم کا فیصلہ کر لیا۔
کچھ عرصہ بعد علامہ کے ایک دوست لدھیانہ کے ایک دولتمند خاندان کی لڑکی کا رشتہ لائے۔ رشتہ طے ہو گیا اور وہاں علامہ کی شادی بھی ہو گئی۔ اِقبال دُلہن کو لیکر سیالکوٹ اور پھر لاہور آ گئے۔ نئی دُلہن کیساتھ کریم بی بی کو بھی لاہور چل کر رہنے کو کہا گیا۔ چنانچہ دونوں بیگمات کچھ عرصہ انار کلی والے مکان میں رہیں لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور کچھ مہینے بعد کریم بی بی پھر اَپنے میکے واپس آ گئیں۔ (۳۴)
ادھر لاہور والی بیگم کا معاملہ ابھی معلق تھا۔ انہوں نے اِقبال کو ایک خط لکھا کہ میرا نکاح تو آپ کے ساتھ ہو چکا ہے اب خواہ آپ طلاق دے دیں میں اِسی حالت میں زِندگی بسر کروں گی اور روز حشر اِس بے اِنصافی پر آپ کی دامن گیر ہونگی۔ چنانچہ اِقبال نے گمنام خطوط پر تحقیق کروائی تو پتہ چلا کہ یہ خطوط ایک وکیل نبی بخش نے لکھے تھے جو سردار بیگم سے اَپنے بیٹے کی شادی کروانا چاہتا تھا۔ پھر خواتین نے بھی پوچھ گچھ کی تو لڑکی کا دامن ہر اعتبار سے بے داغ ثابت ہوا۔ چنانچہ اب اِقبال نے سردار بیگم کو بھی رخصت کرا کے گھر لانے کا

ارادہ کرلیا۔ لیکن چونکہ ایک وقت میں انہوں نے طلاق کا ارادہ بھی کرلیا تھا چنانچہ دوبارہ نکاح پڑھوایا گیا۔ یہ نکاح گجرات کے مولوی محمد حسین نے پڑھایا تھا(۳۵) ۔ اور دُلہن کو گھر لے آئے۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔

اِقبال ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو سر کشن پرشاد کو لکھتے ہیں: (۳۶)

"تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی۔ ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اِقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اِس کے لیے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں اِسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے بیشتر یہ حال معلوم ہوتا"

علیحدگی اور کفالت:۔

۱۹۱۳ء سے کچھ عرصہ بعد تک کریم بی بی لاہور میں رہیں مگر وہ خوش نہ تھیں۔ آفتاب اِقبال بیان کرتے ہیں۔ (۲۷)

دوسری اور تیسری شادی کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے میری والدہ مرحومہ سے دوسری شادی کرنے کی اجازت مانگی تھی اور لکھا تھا کہ: "تمہاری حق تلفی قطعاً نہیں ہوگی بلکہ دوسری بیوی تمہارا احترام کریگی اور امور خانہ داری میں تمہارے مشوروں پر عمل کریگی۔ گھر کی اصل مالکہ تم ہوگی۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تم معراج اور آفتاب کی والدہ ہو"

"اِن کی تیسری شادی کے بعد تینوں بیویاں اِنکے انارکلی والے مکان میں کچھ عرصہ اکٹھی رہیں۔ میری والدہ صاحبہ وہاں خوش نہیں تھیں۔ میری عمر اِس وقت ۱۲ یا ۱۳ سال تھی۔ میں بھی کچھ عرصے کے لیے وہاں تھا۔ چونکہ میری والدہ بہت خوددار خاتون تھیں' دوسری بیویوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اِس لیے ۱۹۱۷ء میں نانی جان آکر انکو اپنے ساتھ ریاست مالیر کوٹلہ لے گئیں جہاں میرے نانا جان خان بہادر حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد صاحب گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چیف میڈیکل آفیسر تھے"

مفاہمت کی کوششیں جاری رہیں مگر بے سود! سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:۔

"طرفین نے اِس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ محمد اِقبال نے لاکھ

کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدہ آفتاب کا اندازِ طبیعت دوسرے اِقبال کی روش' حالات بگڑتے چلے گئے۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ کی کوششیں بھی کہ اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نکل آئے ناکام رہیں۔"

"ایک دوسرے سے کشیدگی بڑھتی گئی تا آنکہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آگئی۔ بغیر طلاق کے چارہ کار نہ رہا۔ لیکن والدہ آفتاب کی عزتِ نفس نے گوارا نہ کیا۔ محمد اِقبال کفاف کے ذمہ دار ٹھہرے۔ فرمایا "شرعاً میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ طلاق یا کفاف کی ذمہ داری۔ والدہ آفتاب طلاق پر راضی نہ ہوئیں۔ میں نے بخوشی کفاف کی ذمہ داری قبول کرلی" (۳۸)

صابر کلوروی صاحب اپنی کتاب "یادِ اِقبال" صفحہ ۶۴ پر رقمطراز ہیں:۔

"یہ اختلافات اتنے معمولی نہیں تھے یا اگر تھے تو طرفین کے رویے نے انہیں اِس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں نہ آگے بڑھنے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی اور جسکا علاج محض طلاق تھا۔ لیکن علامہ کی طبیعت نے اِسے گوارا نہ کیا اور انہوں نے صرف علیحدگی کو کافی سمجھا"

درج بالا دونوں اِقتباسات میں کچھ نکات حقیقت کے برعکس ہیں۔ نیازی صاحب نے لکھا کہ اِقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے۔ حقیقت یہ تھی کہ علامہ کریم بی بی سے ہر حال میں چھٹکارا چاہتے تھے: عطیہ کے نام خط مورخہ ۹ اپریل ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں "میں اس کی کفالت کو تیار ہوں لیکن اسے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں"۔ کلوروی صاحب نے لکھا کہ علامہ نے طلاق کو گوارا نہ کیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ تو طلاق دینا چاہتے تھے' کریم بی بی نے گوارا نہ کیا۔ اِس سلسلے میں اِقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے: (۳۹)

"بڑی چچی جان (کریم بی بی) نے جیسا کہ انکی نجابت کا تقاضہ تھا' شرعی قطع تعلق پسند نہ فرمایا۔"

"مظلوم اِقبال" میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اِقبال اور کریم بی بی میں علیحدگی' دوسری اور تیسری شادی کے چند ماہ بعد ہو گئی تھی حالانکہ مکمل علیحدگی ۲۱-۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہوئی۔ کریم بی بی ۱۹۱۷ء تک وقفے وقفے سے لاہور اور سیالکوٹ میں رہیں۔ اِس کے بعد مکمل علیحدگی کی بات کا آغاز ہوا جیسا کہ خود اِقبال کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اپنے والد ماجد کو لکھتے ہیں (۴۰)

"باقی رہا قصور اِس کا یا اِسکی والدہ کا' سو میرے نزدیک کسی کا نہیں۔ امرِالٰہی ہر طرح ہو جاتا ہے۔ قطع تعلق جو میں نے اِن لوگوں سے کیا ہے اِسکا مقصد سزا نہیں ہے اور نہ میں اِن سے کوئی اِنتقام لینا چاہتا ہوں۔ جتنا میرا حصہ موجودہ صورت کے پیدا کرنے میں ہے اِس کا مطلب صرف اِس قدر ہے کہ عقلمند آدمی ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا۔ ہر اِنسان کو حق ہے کہ وہ اپنی عزت و آبرو بچانے اور اِسے محفوظ رکھنے کے لیے تدبیر اختیار کرے خواہ اِس تدبیر کو اختیار کرنے میں کسی اور تکلیف ہی کیوں نہ ہو"

اِس سے ثابت ہے کہ قطع تعلق اِقبال نے کیا۔ ۶' مارچ ۱۹۲۰ء کو بڑے بھائی کو لکھا (۴۱)

"میرا ارادہ تو یہ تھا کہ حافظ صاحب (ڈاکٹر عطا محمد) سے اِس بارے میں خط و کتابت کی جاتی۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کی لڑکی کا حق مہر ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے ذمہ ماہواری رقم رکھنی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ بہرحال اگر یہی خیال ہے کہ اسکو ماہواری تنخواہ دی جائے تو میں حاضر ہوں کہ اسکو تیس روپیہ مہینہ دے دیا کروں بشرطیکہ میرے ساتھ اور کوئی تعلق ان کا نہ رہے اور نہ وہ مجھے کبھی خط وغیرہ لکھے۔ جس قدر عرصہ وہ اپنے والدین کے ہاں رہی ہے اسکی تنخواہ کی وہ کسی طرح مستحق نہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور باوجود ہمارے روکنے کے وہ سیالکوٹ میں نہ رہی لیکن میں وہ رقم بھی دے دونگا اگر مذکورہ بالا شرط پر وہ قائم رہیں' میرے خیال میں تو آپ حافظ صاحب کو اِس بارے میں خط لکھیں تا کہ کوئی قابل عمل فیصلہ ہو جائے۔ اور آئندہ کے لیے اِس خلش سے رہائی ہو۔ باقی شرعی قطع تعلق کا طریق اور اِسکا علاج اِنشاء اللہ ہو جائے گا۔ مختصر طور پر میرا ارادہ یہ ہے

۱) اگر وہ حق مہر لینا چاہے تو پھر شرعی طور پر قطع تعلق ہو جائے

۲) اگر وہ ایسا کرنا پسند نہ کرے تو میں اسے تیس روپے ماہوار جب تک زِندہ رہوں دے دیا کروں گا۔ جتنا عرصہ وہ اپنے والدین کے ہاں رہی ہے اس کے الاؤنس کی وہ مستحق نہ ہوگی کیونکہ وہ خود چلی گئی تھی"

"میرے خیال میں یہ معاملہ کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے طے ہونا چاہیے"

اِسکے بعد بھی یہ صورت حال چلتی رہی۔ ۱۲ جون ۱۹۲۲ء کو بڑے بھائی کو لکھتے ہیں (۴۲)

"کچھ عرصہ ہوا آفتاب کی ماں نے مجھے خط لکھا تھا کہ پانچ سال کی تنخواہ مجھے پیشگی دے دی جائے مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ آج اسکا خط کئی دنوں کے بعد آیا ہے وہ لکھتی ہے کہ اگر آپ مجھے پیشگی روپیہ نہیں دے سکتے تو میرا حق مہر دے دیا جائے۔ چونکہ یہ اسکا شرعی حق ہے اِس واسطے اسکی ادائیگی میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔

مہر کا کاغذ غالباً گھر میں ہو گا۔ ایک نقل اسکی ضرور وہاں ہو گی اور ایک حافظ صاحب کے پاس۔ پیشتر اِس کے کہ میں ان کو اِس خط کا جواب دوں۔ میں کاغذ مہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اِس واسطے آپ مہربانی کر کے کاغذات میں تلاش کر کے وہ کاغذ بذریعہ رجسڑی بحفاظت تام میرے نام بھیج دیجئے۔ والد مکرم کو بھی یہ خط سنا دیجئے"

پھر ۱۵ جون ۱۹۲۲ء کو آپنے بھتیجے اعجاز احمد کو لکھتے ہیں: (۴۳)

"مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ حق مہر طلب کریں گے بلکہ یہ میری خواہش تھی کہ وہ ایسا کریں۔ اِس واسطے میں نے اسکے پہلے خط کا جواب نہ دیا تھا جس میں اِس نے دو ہزار روپیہ بطور قرض طلب کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ روپیہ نہ دیا گیا تو وہ اپنا حق مہر طلب کرے گی"

(جیسا کہ اِقبال کے پہلے خط سے ظاہر ہے کریم بی بی نے یہ رقم بطور قرض نہیں بلکہ ماہانہ خرچ پیشگی طلب کیا تھا۔ اور اِس تقاضا کیوجہ یہ تھی آفتاب اِن دنوں لندن میں زیر تعلیم تھے اور مالی مشکلات کا شکار تھے)

درج بالا بیانات' اِقتباسات اور خطوط سے درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) اِقبال نے دوسری شادی کے وقت پہلی بیوی کو طلاق دینے یا چھوڑنے کی بات نہیں کی بلکہ کریم بی بی سے اجازت طلب کی تھی اور انہیں یقین دلایا کہ انکی حق تلفی نہیں ہو گی اور گھر میں ان کی حیثیت برتر ہو گی۔

(۲) دوسری اور تیسری شادی کے بعد کریم بی بی کو حسب وعدہ جائز حیثیت نہ مل سکی تو وہ میکے آگئیں۔ کیونکہ دو نوبیاہتا دلہنوں کے ہوتے ہوئے انہیں وہاں رہنا اچھا نہ لگا۔

(۳) اِس کے بعد اِقبال کی طرف سے قطع تعلق ہو گیا۔

(۴) اِقبال طلاق دینا چاہتے تھے مگر کریم بی بی نے علیحدگی اور کفاف کو پسند کیا۔ چنانچہ اِقبال باقاعدگی سے ماہانہ رقم بھیجتے رہے۔

۲۱۔۱۹۲۰ میں جب علیحدگی ہو گئی تو اِقبال باقاعدگی سے رقم بھیجتے رہے۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے

ہیں۔ (۴۴)

"اپنی وفات تک چچا جان باقاعدہ ماہوار رقم ادا کرتے رہے۔ جو اِس رقم کے علاوہ تھی جو وہ ماہوار آفتاب بھائی کو کالج کی تعلیم کے لیے دیتے تھے۔ نان نفقہ کی رقم جہاں تک مجھے یاد ہے پہلے ۳۰ روپے ماہوار تھی پھر ۵۰ روپے ماہوار کر دی گئی اور آخری سالوں میں تو ۱۰۰/ روپے ماہوار بھی ادا ہوا"

اِس بیان میں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) شیخ صاحب نے لکھا کہ آفتاب اور والدہ آفتاب کو ساتھ ساتھ رقم ملتی رہی۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ آفتاب کو کالج میں ایف اے تک ۳۵ روپے ماہوار ملتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ایف اے کرنے کے بعد اِنہیں کبھی اِقبال کی جانب سے رقم نہیں ملی جبکہ کریم بی بی کو ماہانہ خرچہ ۱۹۲۰ء کے بعد ملنا شروع ہوا۔

(۲) آخری سالوں میں ماہانہ خرچ بڑھایا نہیں بلکہ کم کیا گیا تھا۔ ملاحظہ ہو سید نذیر نیازی صاحب کا یہ بیان: (۴۵)

"(اِقبال) ایک مقررہ رقم ہر مہینے بھیج دیتے۔ حتیٰ کہ آخری علالت کے دوران بھی یہ رقم باقاعدہ روانہ کی جاتی۔ پھر جب علالت نے طول کھینچا اور مالی دشواریاں بڑھیں تو اِس میں تخفیف کرنا پڑی۔ لیکن رقم کی ترسیل میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری منی آرڈر میرے ہاتھوں سے ہوا۔"

اِقبال کی وفات کے بعد مہر و وراثت کا مسئلہ:۔

اِقبال کی وفات کے بعد جب اِن کا وصیت نامہ اور ہبہ نامہ دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے اپنی زوجۂ اولیٰ' کریم بی بی کا بقیہ مہر (مہر موجل) ادا کرنے کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ علاوہ ازیں کریم بی بی اور آفتاب اِقبال کو وراثت میں ان کے شرعی اور قانونی حق سے محروم رکھا ہے اور وصیت و ہبہ نامہ میں کہیں ان کا ذِکر تک نہیں کیا۔

اِقبال' آفتاب سے نالاں تھے۔ انہوں نے نہ صرف بدانستہ آفتاب کو جائیداد سے محروم رکھا بلکہ اپنی زِندگی میں ہی ایسا بندوبست کر دیا کہ آفتاب کو ان کی جائیداد سے کچھ نہ مل سکے۔ اِقبال خود ماہر قانون تھے' انہوں نے ایسا اِنتظام کر دیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد آفتاب اگر عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹاتے تو شاید انہیں کچھ نہ ملتا: کیونکہ شیخ عطا محمد (برادر بزرگ) کے خطوط (۴۶) سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) اِقبال نے جب "جاوید منزل" کے لیے زمین خریدی تو اِسے والدہ جاوید کے نام لکھوایا۔ زمین کی مالیت چوبیس ہزار روپے تھی۔ جاوید کے نام جمع شدہ رقم سے تعمیر کے اخراجات (جو تقریباً ۲۰ ہزار روپے تھے) پورے کیے گئے۔ تقریباً دس ہزار روپے فرنیچر وغیرہ پر صرف ہوئے۔ یوں تقریباً پچپن ہزار روپے میں یہ کوٹھی تیار ہوئی۔ اِس کے سازو سامان برائے تعمیر کی رسیدیں بھی جاوید اِقبال کے نام سے بنوائی گئیں۔ والدہ جاوید نے وفات سے کچھ روز قبل زمین جاوید کے نام ہبہ کر دی اور اِقبال بطور کرایہ دار رہنے لگے!

(۲) اِقبال نے اپنی نقد جمع پونجی جاوید اور منیرہ بانو کے نام جمع کرا رکھی تھی جو تقریباً چالیس ہزار روپے تھی۔

(۳) گھر کی باقی اشیا بھی جاوید کے نام تھیں۔

(۴) قیمتی کتابیں بھی جاوید کے نام ہبہ ہوئیں اور اپنی تصنیفات کی رائلٹی بھی اِقبال نے جاوید کے نام ہبہ کر دی تھی۔

یوں انہوں نے اپنی زِندگی میں ہی آفتاب کو محروم الارث کر دیا تھا۔ کوئی بھی چیز، جائیداد اگر اِقبال کے نام پر موجود ہوتی تو آفتاب اِسکے ورثاء میں قانوناً شامل ہوتے۔ اِقبال نے نہ کوئی چیز اَپنے نام چھوڑی نہ آفتاب کچھ حاصل کر سکے۔ مگر حنفی فقہ اِسلامی کی رو سے (جس کے اقبال پیرو تھے) ان کا یہ عمل درست نہ تھا کیونکہ اِسلامی فقہ کی رو سے بیٹے کو صرف دو صورتوں میں محروم الارث کیا جا سکتا ہے۔

(۱) بیٹا، باپ کا قاتل ہو۔

(۲) وہ باپ کا مذہب (اِسلام) چھوڑ دے۔

اِن دو صورتوں کی عدم موجودگی میں باپ کا بیٹے کو محروم الارث کرنا غلط تھا (عام خیال کے برعکس اِسلام میں عاق کرنے کی کوئی حیثیت اور روایت نہیں ہے اور نہ اِس سے حق وراثت پر کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ اِقبال نے ایسا کیا تھا)

اِقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد (۱۸۵۹۔۱۹۴۰ء) اَپنے ایک خط محررہ ۳۱ اگست ۱۹۳۸ء، میں آفتاب اِقبال کو لکھتے ہیں: (۴۷)

"یہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے کیا محض تمہارا حق زائل کرنے کو کیا۔ یہ سب اِسلام کے خلاف کیا گیا۔ شریعت کو چھوڑ کر قانونِ فرنگ میں پناہ لینا سچے مسلمان کا کام نہیں۔ دو چار دس ہزار کی خاطر اَپنے ایمان میں رخنہ ڈالنا درست نہ تھا۔ اِسلامی عملداری میں وہ ایسا نہ کر سکتے تھے۔ اِسی کفرستان میں یہ جائز ہوا۔ تمام عمر کا اندوختہ تھوڑی بات کے واسطے ڈبو دیا"

کریم بی بی کے بقیہ نصف حق مہر کی بابت وصیت نامہ اور ہبہ نامہ میں خاموشی اختیار کی گئی تھی اور وراثت میں سے ان کے آٹھویں حصے کے ادائیگی کے بارے میں بھی کوئی ذکر نہیں کیا تھا حالانکہ قانوناً یہ قرض تھا جسکی ادائیگی سب سے پہلے ہونا ضروری تھا اور بعد میں بقیہ جائیداد اور نقدی تقسیم یا ہبہ ہونا چاہئے تھی۔ شیخ عطا محمد آفتاب اِقبال کے نام ایک خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۸ء میں لکھتے ہیں:

"تمہاری والدہ کے حق مہر کے واسطے میں نے محمد حسین کو لکھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی جائیداد قالین وغیرہ مرنے سے چند روز اول بچوں کے نام ہبہ کیے لیکن اپنی بیوہ کے حق مہر خواہ غلطی سے خواہ دیدہ دانستہ ادا کرنے کو کچھ نہ لکھا۔ شرعاً ہبہ کرنے سے اول بیوہ کا قرض ادا ہونا چاہیے تھا۔ ایسے اِنسان سے جس کو پبلک مجدد اور علامہ اور ترجمانِ حقیقت کا خطاب دیتی ہے۔ ایسی غلطی کا ہونا اِسکی شہرت کے واسطے شرعی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ لٰہذا وہ ضرور ادا ہونا چاہیے ورنہ مرحوم قرضہ ادا نہ کرنے کے عذاب سے بری نہ ہو سکے گا اور اِس عذاب کو اللہ تعالٰی بھی معاف نہ کرے گا تاوقتیکہ قرض خواہ معاف نہ کرے"

۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء کے خط میں دوبارہ لکھتے ہیں:

"بقایا مہر تمہاری والدہ کا حق ہے اور اپنا حق وصول کرنا ہر طرح سے جائز ہے۔ اِس میں کوئی گناہ یا بدنامی نہیں بلکہ بدنامی نہ دینے والوں کی ہوگی۔ ملامت کا نشانہ وہی لوگ ہونگے۔ بیوہ کے ساتھ ہمدردی عام ہوگی"

ایک اور خط میں رقمطراز ہیں:۔

"تمہارے باپ کی دو تین ہزار کی جائیداد تھی جس کو انہوں نے مرنے سے تین چار روز اول ہبہ کرا دیا تھا۔ بیوہ کا مہر اور اسکا گزارہ تازیست شرعی نقطہ نگاہ سے خاوند کے ذمہ قرض ہوتا ہے جسکا اقرار بوقت نکاح وہ کرتا ہے۔ البتہ طلاق کی صورت میں وہ اِس قرض سے آزاد ہو جاتا ہے لیکن مہر پھر بھی اِسے دینا پڑتا ہے"

۱۶ جون ۱۹۳۸ء کو شیخ عطا محمد نے یہ مسئلہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کو ارسال کیا اور اِن سے فتویٰ کی درخواست کی۔ ۱۸ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ کو مسعود احمد نائب مفتی دارالعلوم دیوبند نے مفتی کفایت اللہ گنگوہی (م۔ ۱۹۵۳ء) کی تصدیق سے درج ذیل فتویٰ ارسال کیا (۴۸)

"یہ ہبہ صحیح نہیں ہوا اور جائیداد موہوبہ ملکیت واہب سے خارج نہیں ہوئی۔ اور بعد مرنے واہب کے اول اِس جائیداد سے دین مہر ادا کرنا واجب ہے"

دیگر مفتیوں نے بھی اِسی بات کی تصدیق کی تھی۔ شیخ عطا محمد ۲۹ جولائی کو لکھتے ہیں

"شریعت کا فتویٰ تمہاری والدہ اور تمہارے حق میں ہے۔ میرے پاس علمائے دین کے فتوے آگئے ہیں"

اِسی سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:۔

"تمہاری والدہ کا بقایا حق مہر لینے کا حق ہے۔ میرے خیال میں تمہارے والد نے جو ڈھائی ہزار روپیہ آپنے کفن دفن کے واسطے علیحدہ منشی طاہردین کو دیا تھا اِن میں ایک ہزار بقایا مہر کا بھی شامل تھا۔ گو انہوں نے طاہردین کو اِس کے واسطے واضح طور پر ہدایت نہ کی ہو۔ لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ کفن دفن میں ڈھائی ہزار خرچ ہوا تھا یا کوئی خاص ہدایت خرچ کی تھی۔ تمہارے والد کی نیت نصف مہر دینے کی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے طاہردین کی زبانی دریافت بھی کرایا تھا کہ بقایا مہر بھی لے لو لیکن تمہاری والدہ نے لینے سے اِنکار کیا تھا جبکہ ان کی نیت اِس قدر نیک تھی کہ وہ بقایا نصف بھی دینے کو تیار تھے تو یہ ناممکن ہے کہ ڈھائی ہزار میں بقایا مہر شامل نہ ہو۔ افسوس ہے کہ تمہاری والدہ عدالت کے ذریعے بقایا مہر وصول کرنے کے لیے مجبور ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ چاہے تو بخش بھی سکتی ہے۔ اگر ٹرسٹی بقایا مہر دینے سے حجت کرتے ہیں تو اس کا گناہ انکے آگے آئے گا۔ قدرت ان سے بدلہ لے گی کہ انہوں نے ایک حقدار کا حق ادا کرنے میں تغلب کیا۔ اعجاز کو تو پورا پورا یقین تھا کہ اگر تم بذریعہ عدالت چارہ جوئی کرو تو ڈگری ضرور مل جائیگی"

اِن حالات میں شیخ عطا محمد کی ہمدردیاں بھی کریم بی بی اور آفتاب کے ساتھ تھیں۔ حالانکہ اِس سے پہلے ان کا رویہ مناسب نہ ہوتا تھا جس کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ آفتاب کے نام ایک خط محررہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء میں لکھتے ہیں:

"بیوہ سے بھی اِس وقت ہمدردی ہے۔ مرحوم کی زِندگی میں جو کچھ میرا خیال تھا اس کو چھوڑ کر اِس وقت کی حالت کا خیال کرتے ہوئے ہر ایک اِنسان کو بیوہ سے ہمدردی ہونی چاہیے"۔

۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اور مہلت دے دی ہے تاکہ جوانی دیوانی کے عالم میں

جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں میں اِس عرصہ میں اِس کمی کی تلافی کر لوں۔
میری زِندگی کی آسودگی اب تمہاری آسودگی اور خوش زِندگی پر منحصر ہے"

شیخ عطا محمد کے مشورے اور تعاون کی یقین دہانی کے باوجود کریم بی بی نے آفتاب اِقبال کو عدالت میں جانے سے سختی سے روک دیا۔ آفتاب لکھتے ہیں: (۴۹)

"میری والدہ بڑی شاندار عورت تھیں۔ صحیح معنوں میں خان بہادر عطا محمد کی بیٹی اور علامہ اِقبال کی بیوی تھیں۔ اَپنے پدری سرمایہ کا ایک ایک پیسہ اِنہوں نے میری تعلیم پر خرچ کر دیا اور تکلیفِ مالی سے دو چار ہونے کے باوجود جب میرے چچا اور بہت سے لوگوں نے ہمیں سمجھایا کہ تم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹاؤ' یہ وصیت وہبہ غیر قانونی ہے ٹوٹ جائے گا تو میری والدہ نے اِس تجویز کو اَپنے شوہر کی توہین و رسوائی کا سبب جان کر مجھے ہمیشہ نصیحت کی کہ "اگر تم نے اِس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا' میں تمہارا دودھ نہ بخشوں گی" خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرے دِل میں بھی ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی اِس قسم کا خیال نہیں آیا۔ اِس لیے نہ آج تک کسی سے کچھ کہا اور نہ کچھ کیا"

"علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" میں موجود درج بالا معلومات کے مطالعہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اپنی بیوی کا بقیہ نصف حق مہر ادا نہ کرکے علامہ نے زیادتی کی۔ لیکن شاید حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیوں کہ حال ہی میں راقم کی نظر سے ایک ایسی تحریر گزری ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے کریم بی بی کو بقیہ نصف حق مہر ادا کر دیا تھا۔ محترمہ بلقیس عابد علی اپنے ایک مضمون "لیڈی اقبال" (مطبوعہ "ہفت روزہ صادق" لاہور بابت ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۷) میں لکھتی ہیں۔

"سن ۱۹۳۲ء یا ۳۳ء کا ذکر ہے کہ علامہ مرحوم میکلوڈ روڈ پر ایشر داس بلڈنگ کے سامنے ایک کوٹھی میں مقیم تھے۔ ساتھ ہی یعنی دیوار بیچ میرے بھائی کی اقامت تھی۔ ایک روز علامہ نے میرے بھائی کو بلا بھیجا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آفتاب کی والدہ کا حق مہر اپنی زندگی میں ادا کر دوں کہ یہ مجھ پر شرعی قرض ہے۔ آپ والدۂ آفتاب سے اجازت لے کر یہ رقم انہیں دے دیجئے اور ان کے ہاتھ کی رسید مجھے لا دیجئے۔ چنانچہ بھائی صاحب نے رقم مقررہ لا کر اماں کو دے دی اور ان کے ہاتھ کی رسید علامہ کو پہنچا دی۔ رسید پر صرف ان کے دستخط تھے اور کوئی تحریر نہ تھی کیونکہ مرحومہ اپنا نام لکھنے کے سوا پڑھنا لکھنا

بالکل نہ جانتی تھیں۔"

اِقبال کی وفات کے بعد ریاست حیدر آباد دکن کی طرف سے کریم بی بی کے لیے پچاس روپے ماہوار تازیست اور جاوید اِقبال کے لیے پچاس روپے ماہوار تا تکمیل تعلیم اور منیرہ بانو کے لیے پچاس روپے ماہوار تا کتخدائی وظائف مقرر ہوئے۔ (۵۰)

اِقبال کی پہلی شادی کا افسوسناک اِنجام

چند وجوہات کا جائزہ

کسی بھی عظیم اور مقبول شخصیت کی ذاتی زِندگی پر لکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ یہ بات بذات خود ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ ایسی شخصیات کی نجی زِندگی کو زیر بحث لانا بھی چاہیے یا نہیں۔ پھر یہ امر بھی ابھی تصفیہ طلب ہے کہ ایسی نابغۂ روزگار ہستیوں کی زِندگی کو ذاتی اور غیرذاتی کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ان کی عوامی اور نجی زِندگی میں حد فاصل کا تعین بھی ایک مشکل کام ہے۔ یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ذاتی زِندگی کی تفصیلات میں جانے کا فائدہ کیا ہے۔ ایک سوانح نگار کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ مشاہیر کی زِندگیوں کے صرف وہ پہلو اُجاگر کرے جن سے انکے خیالات اور تعلیمات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہو یا پھر ان کی شخصیت کے تعین میں کسی بہتری کی توقع ہو۔ اِس سے آگے بڑھنا گستاخی اور تشہیر پسندی کے سوا کچھ نہیں۔ مشاہیر کی نجی زِندگی کے واقعات اور انکی تفصیلات کو کرید کرید کر نکالنا' انہیں مزے لے لے کر بیان کرنا ایک بیکار مشغلہ ہے۔ بائرن' شیلے کی زِندگیوں کے اِنکشافات لوگ کیسے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں حالانکہ ان کی تصنیفات کو سمجھنے میں اِن سے ذرا مدد نہیں ملتی۔ ازدواجی زِندگی کی ناکامیوں کی مثالیں کیا کم ہیں' غالب' ٹالسٹائی' آگسٹ کومٹ جیسے بہت سے نامور لوگ ازدواجی زِندگی کی آسودگی سے محروم رہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم اِن سب کی سراسر ذاتی زِندگیوں کے بارے میں متجسس رویہ اختیار کریں۔ رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷ء) تو یہاں تک کہتے ہیں (۵۱)

"جس طرح شرفاء کے محلے میں بعض اوباش ہوا کرتے ہیں جن کا کام تاکنا جھانکنا ہوا کرتا ہے اِسی طرح کچھ اَدبی اوباش ہوتے ہیں جنکی ساری دلچسپی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی خالص شخصی زِندگی کا کھوج لگایا جائے اور اِسے مزے لے لے کر نمک مرچ لگا کر بیان کیا جائے۔"

لیکن اِس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے: اگر افراط و تفریط سے بچ کر خلوص اور دیانت

کے اصول پر چلتے ہوئے ذاتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو اس سے مثبت نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں اگر ہم اپنے مشاہیر کے حالات سے دلچسپی نہیں رکھیں گے تو وہ محض ذہنی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔ دیو مالائی صفات سے انسان متاثر و مرعوب تو ہو سکتا ہے' محبت نہیں کر سکتا۔ مشاہیر اول انسان ہوتے ہیں' بالکل ہماری طرح' اور پھر مصنف' موٴرخ' فنکار و شاعر و سیاستدان! وہ گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں اور ہم انہیں اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں انسانی خوبیوں اور خامیوں سمیت دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر ہماری تصوریت چاہتی ہے کہ ہمارے ممدوحین تمام ممکن اور غیر ممکن خوبیوں سے مزین ہوں اور ان میں کسی قسم کی انسانی کمزوری نام کو بھی نہ ہو۔ یہ تصور گمراہ کن ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے ایک مضمون میں خوب لکھا (۵۲)

"اپنی عظمت اور زریں (بعض اوقات سیاہ) کارناموں کی بنا پر عوامی شخصیات کے تمام پہلو سامنے نہیں آتے۔ انہیں آئس برگ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کہ سطح آب سے اوپر نظر آنے والے حصے سے کئی گنا زیادہ زیر آب ہوتا ہے۔ عوام صرف سطح سے بلند کرنے والے کاموں کے حوالے سے کسی شخصیت کا اچھا یا برا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن اصل انسان کو کتنے جانتے ہیں؟ آئس برگ کی حقیقت دیکھنے کے لیے کتنے غوطے لگا سکتے ہیں؟ عوام کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا لیکن شخصیت نگار کے لیے یہ لازم ہے۔ ورنہ اسکے بغیر اسکی سوانح عمری نامکمل' خام اور بعض صورتوں میں تو گمراہ کن بھی ہو سکتی ہے"

مولانا حالی (م۔ ۱۹۱۴ء) نے جب "حیات جاوید" لکھی تو سر سید احمد خان کی شخصیت کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ لوگوں نے ان کی اس کوشش کو "مدلل مداحی" "کتاب المناقب" اور "یک رخی تصویر" قرار دیا۔ مولانا حالی کو خود اس بات کا احساس تھا کہ:

"ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیو گرافی کرٹیکل طریقے سے لکھی جائے۔ اس کی خوبی کے ساتھ اس کی برائیاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں..... لیکن!..... ایسی بائیو گرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی" (۵۳)

عبد المجید سالک ایک اچھی سوانح عمری کے متعلق لکھتے ہیں۔ (۵۴)

"وہی سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہو اور ان تمام جزئیات کا تذکرہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیت کا بولتا چالتا تصور پڑھنے والے کے

ذہن میں آجائے۔"

شیخ محمد اکرام(۱۹۰۸-۱۹۷۳ء) نے ایک اور پہلو کی جانب توجہ دلائی ہے:(۵۵)

"نجی معاملات اور شخصی زِندگی کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ دُنیا میں کون اِنسان ہے جو کبھی نہ کبھی اَپنے کمزور لمحوں میں ایسی حرکتوں کا مرتکب نہ ہوا ہو جسے دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے۔ اور اِس میں شک نہیں کہ نجی حالات کو بے نقاب کرنے میں بڑی احتیاط اور ذوقِ سلیم اور خدا ترسی کی ضرورت ہے۔ عام طور پر سترِعیوب ہی قومی فلاح اور ذوقِ پسندیدہ کا راستہ ہے. لیکن ایک شخص کی تعلیمات اور شخصی زِندگی کو بالکل جدا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایک شخص قومی رہنمائی کا ادعا کرتا ہے تو اِسکے نجی معاملات بھی قوم کی املاک ہو جاتے ہیں۔ اِسکی شخصیت ایک عقبی سرزمین ہوتی ہے' اِس کے خیالات و افکار کے لیے اور اِسے جانے بغیر اِسکی تعلیمات کا کامل اندازہ لگانا اور اِس کی صحیح قدر و قیمت پہچاننا امرِ محال ہے"

اِسی بارے میں ڈاکٹر گیان چند کی رائے سنئے۔(۵۶)

"عظیم اِنسانوں اور عظیم ادیبوں کی زِندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل ہماری دِلچسپی کا موضوع ہوتی ہے۔ شہرت و عظمت کی اتنی قیمت تو دینی پڑتی ہے کہ بڑوں کا درون خانہ عوام کی سیرگاہ ہوتا ہے۔ اِسکا ہر نجی قول و فعل پنچایت کی ملک ہوتا ہے۔"

درج بالا اقتباسات کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ عظیم اِنسانوں کی زِندگیوں کے کمزور پہلوؤں کا مطالعہ بھی بے معنی نہیں ہوتا بلکہ اِنکی تعلیمات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اِقبال کی زِندگی میں بھی چند ایسے امور ہیں جنہیں بیان کرنے سے عموماً اجتناب کیا جاتا ہے۔

اِقبال کو اِسی زاویے سے دیکھتے ہوئے اِنکے قدیم دوست مرزا جلال الدین نے بڑے پتے کی بات بیان کی ہے۔(۵۷)

"جس شخص کو ذرا نمود حاصل ہوتی ہے اِس کے متعلق اکثر دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک اِسکے اتقاء اور پرہیزگاری کا دعویدار ہوتا ہے دوسرا اِسکی لغزشوں کو نمایاں کر کے اِسکو متہم کرتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ حال ہی کی پیداوار ہیں۔ دوسرا گروہ ڈاکٹر صاحب کے ایام جوانی سے چلا آتا ہے۔ اِقبال آخر اِنسان تھے' پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہ تھے۔ اِس

لیے اِن کو ایسی باتوں سے معرا سمجھنا جو بشریت کا لازمہ اور اِنسانیت کا خاصہ ہیں ایک ایسا تمسخر انگیز دعویٰ ہے جس میں نہ تو حقیقت کو دخل ہے نہ خود ڈاکٹر صاحب کی روح کے لیے مسرت کا سامان موجود ہے۔ دوسرا گروہ بھی اپنی بے خبری اور تنگ نظری کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب پر الزامات کی بوچھاڑ کرتا ہے۔ اِس میں کلام نہیں کہ عالمِ شباب میں عام طرزِ معاشرت کے خلاف تھوڑی سی بے راہ روی ضرور موجود تھی لیکن محض اِسکے پیش نظر کوئی حتمی نظریہ قائم کرنا اِن پر بہت بڑا ظلم ہے۔ ہر جینئس کی زِندگی کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اِس امر کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ عام لوگوں سے اَپنے اِستعداد اور ادراک میں مختلف ہونے کی وجہ سے فطری طور پر وہ اپنے اصول اور میلانات میں بھی عوام سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اِس کے ہر فعل کو ایک خاص مقررہ اصول' ایک خاص مجوزہ ضابطے سے پرکھنا ستم ظریفی ہے۔ وہ اَپنے ہم جنسوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے یقیناً مختلف معیارِ نقد کا مستحق ہے"۔

علامہ اِقبال ایک عظیم اِنسان تھے مگر انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ لغزشیں اِن سے بھی ہوئیں ہوں گی مگر اِن لغزشوں کا احتساب' خلوص' نیک نیتی اور احتیاط سے کیا جائے تو اِن کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ خوبیوں اور خامیوں سمیت ایک اِنسان کے روپ میں ہم اِنہیں اَپنے زیادہ قریب محسوس کریں گے۔

اِقبال کی پہلی شادی کا موضوع بھی آج تک شجرِ ممنوعہ ہی رہا ہے۔ اگر کسی سوانح نگار نے اِس پہ بات کی بھی تو محض سرسری نظر سے۔ تفصیل میں جانے سے سبھی اجتناب کرتے رہے۔ وجہ وہی خوف تھا کہ وہ لوگ جو اِقبال کو تمام بشری کوتاہیوں سے پاک سمجھتے ہیں' ناراض ہو جائیں گے کیونکہ وہ کوئی ایسی تصویر برداشت نہیں کر سکتے جس میں اِقبال کو ایک اِنسان کے روپ میں دکھایا گیا ہو۔ دراصل ہم ایک ایسی قوم ہیں جو شخصیت پرستی میں افراط و تفریط کا شکار ہیں اور ذہنی طور پر ہم ابھی اتنے باشعور نہیں ہوئے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیں۔ ہم حقیقت پسندی کے ریگستان سے گزر کر کسی منزل کی آسودگی حاصل کرنے کی بجائے سدا خوابوں کے نخلستانوں میں رہنا پسند کرنے والی قوم ہیں:۔

اِقبال کی سوانح لکھنے والوں میں سے کسی نے اِس موضوع پر تفصیلی بات نہیں کی جن لوگوں نے کسی حد تک اِس موضوع کو چھیڑا اِنکی تین قسمیں ہیں:۔

(ا) وہ لوگ جو حقیقت سے واقف تھے مگر خاموش رہے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

جو لوگ چاند ہیں وہ داغ دار بھی ہوں گے
نہو قریب، حقیقت کی جستجو مت کر

(۲) وہ لوگ جو حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور اِقبال کے دفاع کا خود عائد کردہ فرض نباہتے رہے۔

(۳) وہ لوگ جو حقیقت سے واقف نہیں تھے لیکن قیاس آرائی کے رستے پر چلے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

چند مثالیں ملاحظہ ہوں

اِقبال کے برادر زادہ جناب شیخ اعجاز احمد مرحوم لکھتے ہیں۔ (۵۸)

"کیا ضروری ہے کہ چونکہ علامہ مشاہیر قوم سے ہیں اِن کے ذاتی معاملات کی بھی چھان بین کی جائے"۔

سید نذیر نیازی کا موقف ہے: (۵۹)

"اِس قسم کے نجی بلکہ اِنتہائی نجی معاملات میں بے جا تجسّس، قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں سے احتراز ہی واجب ہے۔"

خالد نظیر صوفی، مصنف "اِقبال درون خانہ" لکھتے ہیں۔ (۶۰)

"دراصل اِنکی مزید دو شادیوں کی وجوہات کچھ اور تھیں جن کا اظہار ضروری نہیں"

کیا ہی بہتر ہوتا یہ لوگ حقیقت کا اظہار کر دیتے جس سے قیاس آرائیوں اور بدگمانیوں کا رستہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا۔ مگر ایسے بیانات سے مسئلے کی پیچیدگی، تجسّس اور قیاسات سب میں اضافہ ہوتا ہے۔

راقم الحروف حقیقت شناس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے نہ اپنی بات کے حتمی اور فیصلہ کن ہونے کا۔ یہ ایک کوشش ہے اور بس! اِس کوشش میں نیک نیتی سے اِن "ظاہری اِسباب اور عوامل" کا جائزہ لیا گیا ہے جو اِس شادی کی ناکامی کا موجب ہوئے۔ غالب امکان ہے کہ اِنہی عوامل میں سے کوئی ایک یا زیادہ کشیدگی کا باعث ہوئے۔ یوں تو بقولِ اِقبال "امرِ الٰہی ہر حال میں ہو جاتا ہے" لیکن اِس مسئلے پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اِس شادی میں وہ سارے عوامل ابتداء ہی سے موجود تھے جو ایک ناکام ازدواجی زِندگی کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔ گویا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

آج تک جو اِسباب و علل سامنے آئے ہیں' ہم اِن کا باری باری تجزیہ کر کے اِن کے صحیح یا غلط ہونے کے امکان کی نشاندہی کریں گے۔

(ا):۔ کیا رشتہ عجلت میں طے ہوا؟:۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اِقبال جب میٹرک کا امتحان دینے گجرات آئے اِنہیں پسند کر لیا گیا اور تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد انکی شادی ہو گئی تو پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ رشتہ عجلت میں طے ہوا۔ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ کیونکہ اِقبال کی منگنی ۱۸۹۲ء کے آخری مہینوں میں اِس وقت ہوئی جب وہ نویں کے طالب علم تھے (۶۱)۔ شادی مئی ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ گویا ڈیڑھ سال کا عرصہ تھا جسے ہم عجلت نہیں کہہ سکتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شادی یا منگنی سے قبل جو چھان بین ضروری تھی وہ نہ کی گئی ہو۔ رہن سہن اور گھر کے ماحول کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی ہو حالانکہ اِن سب کی اہمیت مسلمہ ہے۔

(۲) کیا اِقبال شادی کے لیے تیار تھے؟

ایک نہایت اہم ضرورت جسے آج بھی بہت سی شادیوں میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے' زوجین کی رضامندی ہے۔ ماضی میں تقریباً سبھی شادیاں والدین کی مرضی سے ہوا کرتی تھیں۔ بچوں سے مشورہ کیا جاتا تھا نہ ان کے مشورے کی کوئی اہمیت ہوتی تھی بلکہ اِن کا زبان کھولنا ہی سوئے اَدب سمجھا جاتا تھا۔ اور بزرگوں کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی سعادت اور خوش بختی سمجھا جاتا تھا۔ اِقبال بھی اِسی صورت حال کا شکار ہوئے۔ گو شادی سے پہلے اِقبال کے اِنکار کی کوئی شہادت نہیں ملتی لیکن بعد میں جب کشیدگی کا آغاز ہوا تو اِقبال نے اِسکا برملا اظہار کیا۔ عطیہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ (۶۲)

> "میں نے اَپنے والد کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ خصوصاً اِس صورت میں کہ جب میں نے اِس قسم کے کسی تعلق میں پڑنے سے اِنکار کر دیا تھا"۔

مگر اِنہیں بزرگوں کی خواہش کے آگے سر جھکانا پڑا' مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ مجبوری کی سعادت مندی کسی کے لیے بھی مفید ثابت نہ ہو سکی اور حالات اِس قدر تلخ ہو گئے کہ اِقبال جیسے فرمانبردار فرزند کو اَپنے باپ کو اتنے سخت الفاظ لکھنا پڑے۔ اور خود برسوں اذیت اور کرب سے گزرنا پڑا۔ عطیہ بیگم نے اِسی صورت حال سے متاثر ہو کر لکھا تھا:۔

> "ہندوستان کی معاشرتی رسوم کا اگرچہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم ہندوستانی زِندگی میں وہ نہایت اہمیت رکھتی ہیں اور ایک شخص مجبور ہو جاتا

ہے کہ خاندان کی مرضی' خواہش اور احکام کی پابندی کرے۔ اِس چیز کی وجہ سے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے بہت سے مردوں اور عورتوں کی زِندگیاں تباہ و برباد ہو گئی ہیں۔ اِقبال کی مثال ایک نہایت ظالمانہ ٹریجڈی کی حیثیت رکھتی ہے جو اِسی قسم کی خاندانی ضد کا نتیجہ تھی۔"(۶۳)

(۳) کم سنی کی شادی:۔

شادی کے وقت اِقبال کی عمر ۱۶ سال تھی اور شادی کے دِن ہی اِنہیں میٹرک میں کامیاب کا تار ملا تھا۔ یہ وقت شادی کے لیے موزوں نہ تھا کیونکہ وہ طالب علم تھے' ابھی اور پڑھنا چاہتے تھے۔ اِقبال کے اِنکار کی بھی شاید یہی وجہ تھی کیونکہ وہ خود کو ابھی اِس قابل نہیں سمجھتے تھے۔ سولہ سال کا نوجوان جو ابھی زیرِ تعلیم ہو اور آپنے والد اور بھائی کا دست نگر ہو' بیوی کو کیونکر خوش رکھ سکتا ہے۔ یوں تو وہ بالغ تھے لیکن ذہنی طور پر ابھی اتنے پختہ نہیں تھے کہ شادی کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتے۔ پھر گھر کے مالی حالات بھی اِس قدر آسودہ نہ تھے۔ عورت ایک مشکل مضمون ہے اور اور مرد کا اِس حد تک باشعور ہونا ضروری ہے کہ وہ عورت کو سمجھ سکے اور تحفظ کا احساس دِلا سکے۔

(۴) عمروں کا معکوس فرق:۔

ہمارے معاشرے کی روایات کے مطابق شادی کے وقت لڑکے کی عمر' لڑکی سے چند سال زیادہ ہونا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اِقبال اور کریم بی بی کی شادی کے وقت عمروں کے بارے میں مختلف بیانات ہیں مثلاً

شیخ عطا محمد (برادر بزرگ اِقبال) کے بیان کے مطابق کریم بی بی اِقبال سے دو تین برس بڑی تھیں۔ (۶۴) اِقبال کی بہنوں نے بھی ایسے ہی فرق کی نشاندہی کی ہے۔ (۶۵)

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب' اِقبال کی ایک ہم عمر اور ہم جماعت کرم بی بی کے بیان کو نقل کرتے ہیں کہ شادی کے وقت اِقبال کی عمر ۱۹ سال اور کریم بی بی کی عمر ۱۷ برس تھی۔ (۶۶)

کرنل خواجہ عبدالرشید نے ایک تحریر (۶۷) میں شادی کے وقت اِقبال کی عمر ۱۶ سال بیان کی جبکہ دوسری تحریر (۶۸) میں کریم بی بی کے حوالے سے کریم بی بی کی عمر ۱۵ سال اور اِقبال کی ۲۰ سال لکھی دوسری طرف آفتاب اِقبال کے بیان کی رو سے کریم بی بی اِقبال سے ایک برس چھوٹی تھیں۔ (۶۹)

کریم بی بی کی چھوٹی بہن فاطمہ بی بی کے بیان کے مطابق کریم بی بی' علامہ کی ہم عمر تھیں۔ (۷۰)

مگر اِن سب بیانات کو ایک طرف رکھتے ہوئے کمیٹی ریکارڈ کے مطابق کریم بی بی کی تاریخ پیدائش ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء اور علامہ کی (اکثریت کی تسلیم کی ہوئی) تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ یوں کریم بی بی اِقبال سے ساڑھے تین برس بڑی قرار پاتی ہیں۔

عمروں کے اِس اختلاف کا ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا کرنا بعید از قیاس نہیں۔ لڑکا اگر ذہنی اور جسمانی لحاظ سے لڑکی سے پختہ ہو تو بہتر ہوتا ہے۔ پھر ہمارے معاشرے میں لڑکی کا لڑکے سے زیادہ عمر کا ہونا' لڑکے کے لیے ایک نوع کی شرمندگی کا باعث بنتا ہے۔ ۱۶' ۱۷ سال کی عمر میں لڑکا جس جسمانی اور نفسیاتی ہیجان سے گزر رہا ہوتا ہے' شادی اِس میں مزید اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔

(۵) مالی حیثیتوں کا تفارق:۔

شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد دونوں کشمیری شیخ تھے' شرافت اور دینداری میں سربلند تھے' خدا ترس تھے' دونوں صوفیانہ طرز فکر کے پیرو تھے مگر دونوں کی مالی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ایک طرف خان بہادر حاجی حافظ ڈاکٹر شیخ عطا محمد تھے جو نسل در نسل معزز سماجی اور مستحکم مالی حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے دادا اجناس کشمیر کے تاجر' والد داروغہ جیل اور وہ خود سول سرجن' وائسرائے ہند کے اعزازی سرجن' "خان بہادر" خطاب یافتہ' وائس کونسل آف برٹش انڈیا تھے اور "رئیس گجرات" کہلاتے تھے۔ گویا سماجی اور مالی ہر دو اعتبار سے نہایت معتبر مقام کے مالک تھے۔

دوسری طرف شیخ نور محمد تھے جو ٹوپیاں سی کر اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے۔ اور اِقبال اِس وقت صرف جماعت نہم کے ایک ہونہار طالب علم تھے اور بس! ان کے بڑے بھائی بھی کسی بڑے عہدے پر فائز نہ تھے۔ جب شیخ نور محمد نے بیٹے کا رشتہ بھیجا تو ڈاکٹر عطا محمد نے سنت نبوی کے پیش نظر مالی حیثیت کی کمزوری کو نظرانداز کرتے ہوئے خاندان کی دینداری اور شرافت کو ترجیح دی۔

لیکن شاہانہ ماحول میں پلی بڑھی کریم بی بی کے لیے ایسے ماحول میں گزارہ اتنا آسان نہ تھا۔ اِقبال خود طالب علم تھے اور شادی کے ۶ سال بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ شیخ نور محمد کی اپنی آمدنی قلیل تھی۔ شیخ عطا محمد ملٹری انجنیئرنگ سروس میں اوورسیر تھے اور خود بال بچے دار تھے۔ ایسے حالات میں وہ سہولتیں کیسے میسر آ سکتی تھیں جو کریم بی بی کو اپنے میکے میں دستیاب تھیں۔ میکے میں دولت کی فراوانی تھی' نوکر چاکر' گاڑی' محل نما حویلی تھی۔

کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ والد بہت مشفق اور نرم مزاج تھے۔ سسرال میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں کریم بی بی کو بلاشبہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

۱۸۹۹ء میں اگرچہ اِقبال کمانے لگ گئے تھے لیکن ابھی اِس قابل نہیں تھے کہ بیوی بچوں کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ طالب علمی میں ہی دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ ملازمت کے دوران گھر بھیجنے کے لیے شاید اِن کے پاس کچھ نہ بچتا ہو۔ بیرون ملک جانے کا خواب بھی سامنے تھا اِس کے لیے بھی کچھ جمع کرنا تھا۔ ایسے میں اِن کے بیوی بچے شیخ عطا محمد (برادر بزرگ) کے دست نگر ہونے پر مجبور تھے جن کی اپنی آمدنی محدود تھی۔ عورت اگر دوسروں کے رحم و کرم پر ہو اور اپنے خاوند سے دور بھی ہو تو اِس کے احساسات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

(۶) شیخ عطا محمد کی سخت طبیعت:۔

اِقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مزاجاً بہت سخت اور غصیلے آدمی تھے۔ بقول اعجاز احمد وہ "دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" قسم کے آدمی تھے اور اولاد کی تربیت میں جسمانی سزا کے قائل تھے۔ شیخ اعجاز احمد نے "مظلوم اِقبال" میں چند واقعات بیان کیے ہیں جن میں آفتاب اِقبال" کا شیخ عطا محمد کے ہاتھوں پیٹا جانا تفصیلاً لکھا ہے۔ (۷۱)
سید حامد جلالی لکھتے ہیں۔ (۷۲)

> "عطا محمد صاحب موصوف کا رویہ علامہ کے بیوی بچوں کے ساتھ ہمیشہ سے نہایت سخت اور معاندانہ تھا۔ آفتاب اِقبال کو زدوکوب کرنا، سب و شتم سے پیش آنا اِنکا معمول تھا۔ عطا محمد صاحب کا ظالمانہ سلوک والدہ آفتاب اور اِنکی اولاد کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ شیخ نور محمد صاحب دیکھتے تھے اور دکھ پاتے تھے لیکن عطا محمد کی درشت طبیعت کے آگے مجبور تھے۔ عطا محمد اپنے گھر والوں پر بے طرح چھائے ہوئے تھے۔"

مزید لکھتے ہیں۔ (۷۳)

> "اب تاریخ جہاں یہ بتائے گی کہ علامہ اِقبال اپنی پہلی بیوی سے بیزار تھے، وہاں بے زاری کے وجوہ میں عطا محمد صاحب کا کردار بھی لوگوں کے سامنے آئے بغیر نہ رہے گا جو اِس غمناک داستان کے سبب اصلی بلکہ بانی کی حیثیت کے مالک ہیں اور علامہ اِقبال سے ۱۶، ۱۷ سال بڑے ہونے کی وجہ سے علامہ اِقبال کی گھریلو زِندگی پر ایک دیو کی طرح مسلط تھے"۔

مصنف نے شاید مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے لیکن وہ واقعات سے ثابت کرتے ہیں کہ شیخ عطا محمد نے کس طرح اِقبال کی گھریلو زِندگی کو درھم برھم کیا تھا۔

"عطا محمد صاحب کی سختی کا اِس سے اندازہ کیجئے کہ ایک بار معراج بیگم نے اَپنے باپ علامہ اِقبال کو براہِ راست خط لکھ دیا۔ بس یہ وہ جرم قبیح تھا جسکی بنا پر عطا محمد صاحب ایسے بگڑے کہ سخت باز پرس معصوم لڑکی سے کی کہ ہمارے ہوتے ہوئے تجھے کیا حق تھا کہ باپ کو براہِ راست خط لکھے۔

علی بخش ملازم نے بتایا کہ عطا محمد بہت سخت مزاج آدمی تھا۔ علامہ نے یورپ روانگی کے وقت مجھ کو انکے پاس بھیج دیا تھا لیکن میں چند روز بھی اِن کے پاس گزارہ نہ کر سکا۔ عطا محمد محلّہ والوں سے لڑتا رہتا تھا۔ باپ منع کرتے تھے' لیکن وہ اِن کی بات نہ سنتا تھا"۔ (۷۴)

(تاہم یہاں یہ یاد رہنا چاہیے کہ شیخ عطا محمد ملازمت کے سلسلے میں اکثر و بیشتر گھر سے باہر رہتے تھے اِس لیے تمام تر ذمہ داری ان پر ڈالنا زیادتی ہو گی)۔

اِن حالات میں ہم کریم بی بی کی حالت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور اِس اذیت کے رد عمل کو سمجھنا بھی مشکل نہیں جو اِن حالات میں کریم بی بی کا مقدر تھا۔ اِقبال کے قیام یورپ کے دوران اِن مشکلات اور مسائل میں مزید اضافہ ہوا اور کریم بی بی کے احساس محرومی اور عدم تحفظ میں بھی شدت آئی۔

(۷) طبیعتوں میں ہم آہنگی کا فقدان:۔

اِقبال اور کریم بی بی کے درمیان کشیدگی کی وجوہات میں سے طبیعتوں میں ہم آہنگی کے فقدان پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اِقبالؒ کی ایک ہمشیرہ بیان کرتی ہیں (۷۵)

"اِقبال کی بیوی عمر میں اِن سے بڑی تھی اِس لیے شروع ہی سے طبیعت نہ مل سکی"۔

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں۔ (۷۶)

"زوجین کے مزاجوں میں ہم آہنگی نہ تھی۔ مزاجوں کا اختلاف دِن بدن بڑھتا گیا.... معلوم ہوتا ہے اختلافات گہرے تھے اِس لیے مفاہمت کی کوشش کامیاب نہ ہوئی"۔

سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں۔ (۷۷)

"اِس کی ایک وجہ طبائع کی عدم مناسبت اور علیٰ ہذا خاندانی حالات میں

تفاوت....."۔

ڈاکٹر جاوید اِقبال صاحب لکھتے ہیں۔(۷۸)

"راقم کے قیاس کے مطابق شادی کی ناکامی کا اصل سبب زوجین کی طبائع کی عدم مناسبت تھا"

اگر ہم دونوں کی طبیعتوں کا انداز دیکھیں تو دو طرح کے تفارق ممکن ہیں:۔

۱۔ جبلی اور بنیادی خصلتوں میں عدم مناسبت

۲۔ تربیت' ماحول اور حالات سے متاثر ہونے والی خصلتوں کا تفاوت

ایک ہی ماحول اور حالات میں رہتے ہوئے یکساں تربیت کے باوجود جو فرق رہ جاتے ہیں وہ جبلی اور بنیادی کہلاتے ہیں۔ اِن میں زیادہ تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ دوسری قسم کا رویہ ہم تربیت حالات اور مشاہدات و تجربات سے سیکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ رویہ اور مزاج حالات اور ماحول متعین کرتے ہیں۔

کریم بی بی بنیادی طور پر جذباتی خاتون تھیں' اور ان کا مزاج کسی حد تک پیچیدہ بھی تھا۔ باقی تمام تبدیلیاں اور تلخیاں حالات' ماحول اور "بے مہری ایام" کی پیدا کردہ تھیں۔ عورت کی نفسیات میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اپنے جذبات کو مخفی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ (کامیاب ہو یا نہ ہو) جبکہ مرد سے وہ جذبات کا برملا اظہار چاہتی ہے جبکہ اِقبال بقول خود:

"میں بدقسمتی سے ایسا شخص ہوں جو اپنی دِلی محبتوں کو ظاہر نہیں کیا کرتا لیکن ظاہر نہ کیے جانے کے باجود ان کی شدت اور گہرائی کم نہیں ہوتی اور عدم اظہار کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بے حس ہوں"۔(۷۹)

ایسی طبیعت غلط فہمیاں پیدا کر سکتی ہے۔ خاص طور پر اِس صورت میں جب افہام و تفہیم کے لیے مواقع ہی بہت کم ہوں۔ عطیہ فیضی جیسی بلند ذہنی صلاحیتوں کی مالک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون جو اِقبال کے ذہنی طور پر بھی قریب تھیں' بھی اِقبال کو سمجھنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک خط میں اِقبال' عطیہ کو لکھتے ہیں۔(۸۰)

"مجھے بے پرواہ یا ریاکار نہ کہیئے! کنا۔تاً بھی نہیں۔ اِس لیے کہ اِس سے میری روح کو تکلیف پہنچتی ہے اور میں اِس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ آپ میری فطرت سے ناواقف ہیں"

"کریم بی بی' عین ممکن ہے کہ اِقبال کے مزاج کو پوری طرح نہ سمجھ سکی ہو کیونکہ اِقبال کی شاعری ہی نہیں اِقبال کی شخصیت بھی ایک مشکل چیز ہے۔ ایک سیدھی سادی' غیر تعلیم یافتہ

عورت کے لیے اِقبال کو سمجھنا مشکل ہو تو کیا اچنبھا! مگر اِقبال کے لیے ایک سادہ سی عورت کو سمجھنا اور اِس سے نباہ کرنا' خدا جانے' کیوں اتنا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر انہیں یہ بھی علم تھا کہ کریم بی بی جس ماحول میں پلی بڑھی ہے اس کا اور ان کے ماحول کا بہت زیادہ فرق' طبیعت میں کچھ ایسی ناگوار تبدیلیوں کا باعث بن سکتا ہے جو دونوں کے درمیان ہم آہنگی کو مشکل بنا دے۔

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ تھوڑا بہت اختلاف تو زوجین میں قدرتی طور پر ہوتا ہی ہے۔ مگر اسے حد سے زیادہ شدید بنانے میں درج بالا اور درج ذیل عوامل بھی شامل تھے۔

(۸) اِقبال کی عدم دستیابی:۔

۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک کے بیس سالوں میں سے صرف پہلے دو سال اِقبال اپنی بیوی کے پاس رہے۔ قیام لاہور کے دوران کبھی کبھار سیالکوٹ آتے اور یورپ سے واپسی پر بھی تنہا رہے۔ اندریں حالات مسائل کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ قریب رہنے سے ایک دوسرے کو سمجھنے سے مدد ملتی ہے۔ دور رہنے سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

اِقبال کی مجبوری تھی کہ وہ لاہور میں بیوی کو ساتھ رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری طرف کریم بی بی' دو بچوں کے ساتھ دوسروں کی محتاج تھی۔ اگر اسے تکلیف ہوتی' کوئی مسئلہ ہوتا تو کس سے کہتی؟ بہت سی باتیں صرف شریک حیات ہی سے کی جا سکتی ہیں اور شوہر اگر مہینے میں ایک آدھ بار گھر آئے تو ایسی باتوں کے بیان سے اجتناب ہی کیا جاتا ہے کہ ایک تو مسئلے کی نوعیت ایسی کہ فوری حل ممکن نہیں' دوسرے' شوہر کے اِس بھائی کے سخت رویے کی شکایت کیسے ہو جو دونوں کا کفیل ہو۔

ایک معالج ہونے اور نفسیاتی امراض و مسائل میں کچھ سوجھ بوجھ رکھنے کی بنا پر راقم کے ذاتی مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ جن خواتین کے شوہران سے دور مثلاً بیرون ملک رہ رہے ہوں ان میں نفسیاتی مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ نفسیاتی مسائل جسمانی مسائل کا باعث بنتے ہیں جو مالی اور دیگر پریشانیوں کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی بیویوں سے دور رہنے والے مردوں کے اَپنے رویوں میں مختلف درجات کی تبدیلیوں کو سمجھنا بھی مشکل نہیں۔

(۹) اَپنے گھر کا خواب:۔

ہر عورت اَپنے گھر کا خواب ضرور دیکھتی ہے' ایک ایسا گھر جہاں اِس کی حکومت ہو' جہاں وہ اَپنے بال بچوں اور شوہر کے ساتھ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق زِندگی گزار سکے۔

جہاں وہ کسی کی دست نگر نہ ہو' جہاں اِسے کوئی ہر بات پہ ٹوکنے والا نہ ہو اور جسے وہ "اپنا گھر" کہہ سکے۔

نفسیاتی نقطہ نظر سے یہ بات ثابت ہے کہ عورت دو چیزوں میں بہت Possessive ہوتی ہے۔ ایک اَپنے شوہر کے سلسلے میں اور دوسرے اَپنے گھر کی بابت۔ وہ اِن دونوں میں اشتراک کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ مشترکہ خاندانی نظام یا متحدہ خاندان کے نظام (Combined Family System) میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ کوئی عورت' جب وہ بہو کے روپ میں ہو' اِس نظام کو پسند نہیں کرتی۔ اور نہ وہ اِس میں خوش رہ سکتی ہے۔ وہ اپنا گھر چاہتی ہے۔ اپنا! اور صرف اپنا! چاہے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو! اور پھر عورت پہ ہی کیا موقوف گھر کا جذبہ مرد میں بھی موجود ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گھر کا تصور اِنسانی جبلت کا حصہ ہے۔

جب ہم اِقبال اور کریم بی بی کے کیس کا تجزیہ کرتے ہیں تو' ان کی ازدواجی زِندگی کے مسئلے کو گھمبیر سے گھمبیر تر بنانے میں اِس محرومی کا بھی کافی حصہ نظر آتا ہے۔ سب کو اِقبال کا کرب نظر آتا ہے کہ جب وہ یورپ سے واپس آئے تو ازدواجی زِندگی ان کے لیے سوہان روح تھی' وہ اذیت اور ذہنی کشمکش کا شکار تھے' ان کا یہ دکھ انہیں تنہائی میں رلاتا تھا' اِن کی زِندگی بقول ان کے بہت Miserable تھی اور وہ کریم بی بی کو ساتھ رکھ کر اِسے مزید تکلیف دہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اِس مسئلے سے تنگ آکر انہوں نے ملک چھوڑنے اور علم بغاوت بلند کرنے کی بھی ٹھان لی تھی اور آپنے اِس سوز دروں کا بھی اظہار کیا تھا جو سب کچھ جلا سکتا تھا' غرضیکہ اِقبال کے لیے یہ دور (۱۲۔۱۹۰۸ء) اِنتہائی صبر آزما اور اذیت ناک تھا۔

مگر کاش! کسی کی نظر اِس مظلوم عورت کے دکھوں کی جانب بھی گئی ہوتی جس نے تمام عمر امیدوں کے سہارے کاٹ دی مگر جس کی امید کبھی بر نہ آئی۔ شادی کے بعد یہ امید کہ اِقبال کی تعلیم مکمل ہو جائے تو ایک اچھی زِندگی کا خواب پورا ہو گا' تعلیم مکمل ہو گئی مگر خواب ادھورا ہی رہا۔ ملازمت شروع ہوئی تو بھی مجازی خدا کی قربت میسر نہ آ سکی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اِقبال نے یورپ کا سفر اختیار کیا تو ایک نیا خواب' ایک سہانا خواب آنکھوں میں جاگزیں ہوا۔ تکلیفیں تو پہلے سے بڑھ گئیں مگر آسانیوں کی امید پر برداشت ہوتی رہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے بعد اِقبال کو اعلیٰ مقام حاصل ہو گا اور زوجہ اِقبال کی حیثیت سے اِسے بھی زیادہ عزت ملے گی۔ پھر اِن تکلیفوں کا احساس مٹ جائے گا۔ منزل پا لینے کے بعد سفر کی تھکان جاتی رہے گی! مگر افسوس! آنکھوں میں بسنے والے سپنوں کو آنسو بن کر چھلکنا تھا۔ ملن کی آس میں رتجگوں سے گزرنے والی آنکھوں کو اب مایوسیوں بھری بے خوابیوں سے

گزرنا تھا۔ سپنوں کا شیش محل چکنا چور ہونا تھا کیونکہ

"اِقبال نے یورپ سے واپسی پر دوسری شادی کا اعلان کر دیا"۔

یہی وہ بجلی تھی جس نے کریم بی بی کی امیدوں کے گلشن کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ کیا یہی وہ "بہار" تھی جس کے اِنتظار میں خزاں کی طویل مدت کے دکھ جھیلے تھے۔

بقول میاں محمد بخش

آسے آسے عمر گزاری تے جھلے خار ہزاراں
مالی باغ نیئں ویکھن دیندا آیاں جدوں بہاراں

اِقبال' جو فلسفے کی اتھاہ گہرائیوں سے واقف تھا' جو جذبوں کی شدت کو زبان دینا جانتا تھا جو "نوائے غم" کی مدد سے "فلسفۂ غم" کا اظہار جانتا تھا' کے لیے یہ دور کٹھن تھا تو ایک سیدھی سادی عورت کے لیے کس درجہ جاں سوز ہو گا۔ اس کے سوزِ نہاں کا کون اندازہ کر سکتا ہے' وہ اپنے دکھوں کا اظہار کس سے کرتی اور کیسے کرتی؟

جن کو امید تھی بہاروں کی
ان کو گلشن میں آشیاں نہ ملا

(۱۰) کریم بی بی کا اَن پڑھ ہونا:۔

اِقبال کی پہلی شادی کے اِسباب ناکامی میں کریم بی بی کا اَن پڑھ ہونا بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اَن پڑھ بیوی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر کے ساتھ گزارہ مشکل ہوتا ہے۔ کریم بی بی واقعی اَن پڑھ تھیں۔ قرآن مجید کے علاوہ کچھ پڑھ لکھ نہ سکتی تھیں۔ ان کی ایک عزیزہ بلقیس عابد علی اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:۔

"اماں مرحوم بہت سیدھی اور نیک دِل خاتون تھیں۔ وہ اپنا نام لکھنے کے سوا پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتی تھیں"۔ (۸۱)

پروفیسر محمد عثمان لکھتے ہیں:۔ (۸۲)

"یورپ میں وہ (اِقبال) عورت کے جن ذہنی اور تہذیبی اوصاف سے آشنا ہوئے تھے ان کو بھول جانا یا ازدواجی اور جذباتی زِندگی میں انکی قدر و قیمت سے اِنکار کرنا اب اِن کے لیے ممکن نہ تھا۔ انہیں یقیناً رہ رہ کر فراؤ سینے شل کی فلسفہ طرازی' واڑ ناسٹ (ویگے ناسٹ) کی نکتہ آفرینی' عطیہ فیضی کی حاضر دماغی اور گزری ہوئی محبتوں اور بیتے ہوئے دِنوں کی یاد آتی ہو گی اور اِس کے مقابلے میں جب وہ اپنے گھر کی مالکہ' اپنی رفیقہ حیات کو دیکھتے ہونگے جو

افلاطون کے فلسفے اور حافظ کی شاعری پر گفتگو کرنا تو درکنار غالباً ان کے نام سے بھی آشنا نہ تھیں۔ تو ان کا دل خون ہو جاتا ہو گا۔ ان کی زندگی پر مایوسی اور اضطراب کے سیاہ بادل چھا جاتے ہوں گے اور مستقبل پر انکے پختہ اعتقاد کی بنیادیں ہل جاتی ہوں گی۔"

کریم بی بی کے ان پڑھ ہونے سے اِقبال جیسے شخص کو سمجھنے میں دشواری کا پیش آنا دور از قیاس نہیں لیکن اِس چیز کا ان کی کشیدگی میں زیادہ حصہ ممکن نہیں کیونکہ جب وہ ایک دوسرے سے دور رہ رہے تھے تو شاعری یا فلسفے پر گفتگو کا موقع ہی کب آتا ہو گا۔ یہ صحیح ہے کہ قیام یورپ سے واپسی پر عورت کے بعض نئے روپ دیکھ چکنے کی وجہ سے' ان کا عورت کے بارے میں نقطۂ نظر یقیناً تبدیل ہوا ہو گا لیکن اِسے ہم علیحدگی یا دوسری شادی کی وجہ ہرگز قرار نہیں دے سکتے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کی دوسری اور تیسری بیوی کم اَز کم اِس حد تک ضرور پڑھی لکھی ہوتی کہ ان کے ساتھ شاعری یا فلسفے پر گفتگو کر سکتی جبکہ وہ دونوں بھی تقریباً اَن پڑھ تھیں اِقبال کی پہلی بیوی کی چھوٹی بہن فاطمہ بی بی بیان کرتی ہیں:۔

"علامہ اِقبال کی دوسری بیوی بالکل اَن پڑھ تھیں' والدہ جاوید تھوڑی بہت حرف شناس تھیں۔"(۸۳)

ڈاکٹر جاوید اِقبال لکھتے ہیں:(۸۴)

"سردار بیگم کسی اسکول میں نہ جاتی تھیں بلکہ انہوں نے قرآن مجید اور معمولی اُردو پڑھنے لکھنے کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی تھی"۔

خالد نظیر صوفی لکھتے ہیں:(۸۵)

"لوگ مشہور کرتے ہیں کہ علامہ اِقبال نے اِس لئے مزید دو شادیاں کیں کیونکہ وہ زیادہ پڑھ جانے کی وجہ سے اپنی پہلی بیوی (جو کہ کم تعلیم یافتہ تھیں) سے مطمئن نہیں تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ صاحب کی وہ دونوں بیگمات بھی' جن سے انہوں نے انگلستان سے واپس آکر شادی کی' زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ ان کی لدھیانے والی بیگم صاحبہ تقریباً اَن پڑھ تھیں اور والدۂ جاوید قرآن مجید اور تھوڑی بہت اُردو گھر پر پڑھی ہوئی تھیں۔"

(۱۱) کریم بی بی کی بیماری:۔

ایک چھوٹی سی مگر شاید بہت اہم وجہ جس سے زوجیت کے تقاضوں میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی' کریم بی بی کی ایک اندرونی بیماری تھی جس کا ذِکر کریم بی بی کی چھوٹی بہن فاطمہ بی بی نے

کیا ہے۔

"کریم بی بی کے تیسرے بچے کی پیدائش پر ایک اندرونی بیماری ہو گئی تھی جس کی وجہ سے علامہ نے دوسری شادی کی"۔ (۸۶)

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی لکھتے ہیں:۔

"اِقبال کی یہ بیوی اکثر بیمار رہا کرتی تھی اِس لیے اس کا زیادہ تر قیام اپنے والدین ہی کے یہاں رہا"۔ (۸۷)

اِس بارے میں راقم نے جب' کریم بی بی کی سب سے چھوٹی بہن شہزادہ بیگم کے صاحبزادے سید پرویز سجاد بخاری سے دریافت کیا تو انہوں نے اِس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ کریم بی بی کو گنٹھیا کی طرح کا کوئی مرض تھا جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے میں تکلیف محسوس کرتی تھیں۔ تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد' کافی عرصہ تک ان کے جوڑ متاثر رہے تھے۔ (۸۸)

طبی نقطہءنظر سے یہ ممکن ہے کہ جوڑوں کی بیماری کی شدت یا کسی خاص مرض کی وجہ سے کریم بی بی کی نسوانیت متاثر ہوئی ہو۔ اس وقت بہتری کی امید ہو مگر یورپ سے واپسی پر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ پا کر انہوں نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا ہو۔

لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنا ہو گی کہ ایسے میں حالات وہ نہ ہوتے جن کا ہمیں اِقبال کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر صرف یہی وجہ ہوتی تو انکا کرب اور اذیت اِس درجہ نہ ہو سکتا تھا۔

(۱۲) جوانی ہے تو ذوق دید بھی' لطف تمنا بھی:۔

اِقبال حسن پسندی اور حسن پرستی کا شدید رجحان رکھتے تھے۔ شاید یہ اِن کی شاعرانہ اور فلسفیانہ طبیعت کا تقاضا تھا۔ ایسے اشخاص کے قلب و ذہن پر اِس رجحان کی وجہ سے حسن و عشق کی وارداتوں کا شدید اثر ہوتا ہے اور انکی زندگیاں بھی اِس سے شدید متاثر ہوا کرتی ہیں۔ پروفیسر محمد عثمان کہتے ہیں:۔ (۸۹)

"یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے صبر و قرار اور اعتماد یقین کی بظاہر مضبوط عمارت بنیادوں تک ہل جائے یا سوز و غم کی ایک مستقل کیفیت اِنکے رگ و پے میں سرایت کر جائے"۔

خود اِقبال کی زبانی سنئے (نظم "عاشق ہرجائی"۔ بانگ درا)

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
پھر عجب یہ کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے
تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پر مدار
تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا ناآشنا تیرا خطاب
اے تلون کیش، تو مشہور بھی، رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے، ہے عجب بے تاب تو
گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

اقبال کی زندگی، اِن کے اِس ذوق کی شاہد ہے۔ جس کا ذکر خود اقبال نے اور ان کے قریبی دوستوں نے بھی کیا ہے۔ اقبال "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "حضور رحمتہ للعالمین ﷺ" میں عرض کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشقِ مجاز اور اِس کے متعلقات میں مبتلاء رہا، لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو، فرماتے ہیں۔ (۹۰)

مدتے با لالہ رویان ساختم عشق با مرغولہ مُویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا گردید گرد حاصلم رہزناں بردند کالائے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زر سار از دامانم نہ ریخت

اقبال کے ایک دوست جناب عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"اقبال عنفوانِ شباب میں آپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے، شہد کی مکھی کبھی نہ بنے لیکن آج بھی اِن کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اِس گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اِن کے تمام ہم نشیں اِس حقیقت کے گواہ ہیں"۔ (۹۱)

سالک صاحب، مرزا جلال الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اِس خاتون سے (جو جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں) شادی ہو جانے کے بعد اِقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ اِس کے بعد اِقبال کی زِندگی کا اسلوب کاملاً بدل گیا"۔ (۹۲)

مرزا جلال الدین صاحب خود بیان کرتے ہیں:۔

"ڈاکٹر صاحب کے متعلق جتنے قصے مشہور ہیں انکے صحیح یا غلط ہونے کا فی الحال سوال نہیں۔ لیکن میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ والدہ جاوید سے شادی کے بعد' جو ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ ان کے طور طریقے اور زِندگی کا رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا تھا"۔ (۹۳)

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ نشاندہی ضروری ہے کہ "رنگ رلیوں کا دور" والدۂ جاوید سے شادی کے بعد ختم ہو گیا یعنی شادی تک جاری تھا۔ اِقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی اور والدہ جاوید سے ۱۹۱۳ء میں۔ اِن بیس برسوں میں کیا رنگ رلیوں کا دور جاری رہنا چاہیے تھا؟ کیا کوئی شادی شدہ عورت یہ پسند کرے گی کہ اسکا شوہر اس کی ذات کے علاوہ کسی اور عورت کی جانب دیکھے بھی۔ وہ اپنے خاوند کو مصری کی مکھی دیکھنا چاہتی ہے نہ شہد کی مکھی!

اِقبال کی زِندگی میں رقص و سرود کو بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اِن محفلوں میں ان کے شریک مرزا جلال الدین' اِقبال کی یورپ سے واپسی کے دور کا ذِکر کرتے ہوئے کہتے ہیں!

"اِقبال ہر شام بلاناغہ میرے ہاں تشریف لاتے' انکو راگ رنگ کا بہت شوق تھا۔ میرے مکان پر چونکہ رقص و سرود کی محفلیں اکثر جما کرتیں۔ اِس لیے وہ اِن مجالس میں بڑی رغبت سے شمولیت فرماتے" (۹۴)

پھر لکھتے ہیں: (۹۵)

"اِس میں کلام نہیں عالمِ شباب میں عام طرزِ معاشرت کے خلاف تھوڑی سی بے راہ روی ضرور موجود تھی لیکن محض اِسی کے پیشِ نظر کوئی حتمی نظریہ قائم کرنا ان پر بہت بڑا ظلم ہے"۔

یہی راگ رنگ اور رقص و سرود انہیں "اس بازار میں" بھی لے جاتا تھا۔ خود "زہد و رندی" میں کہتے ہیں۔

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل   مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اِسے حسن فروشوں سے نہیں ہے   عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا ہے جو شب کو تو سحر کو ہے تلاوت   اِس رمز کے ابتک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اَپنے مریدوں سے ہے میں نے   بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

اِقبال جب ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ میں "گانا سننے جاتا ہوں" اور "حسن فروشوں سے بھی رسم و راہ" ہے تو ساتھ یہ صفائی بھی دیتے ہیں کہ "میری جوانی پہ کوئی داغ نہیں ہے" تو ہم اِس روش کو شعراء کی پرانی عادت سمجھ کر برا نہیں مانتے لیکن وہ بیوی جو اِقبال کے یورپ سے اعلیٰ تعلیم کے ساتھ آنے کے اِنتظار میں اچھے دِنوں کے سہانے خواب سجائے رتجگوں سے گزر رہی ہو' کیسے برداشت کرے گی کہ اس کا شوہر اپنی راتیں اِس انداز سے گزارے۔ کیا اِسی خرچ سے بیوی کو ساتھ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔؟

اِس سے کچھ اور آگے بڑھیں تو ۱۹۰۳ء سے قبل ہی ہمیں "امیر بائی" دکھائی دیتی ہے جو صرف ایک گانا گانے والی ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت اِس سے بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ اِقبال کے من میں بسی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اِقبال اَپنے قدیم دوست سید محمد تقی کو مئی ۱۹۰۳ء میں بلوچستان سے لکھتے ہیں:۔

"امیر کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں' مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اِس میں کیا راز ہے جتنا دور ہو رہا ہوں اتنا ہی اس سے قریب ہو رہا ہوں۔" (۹۶)

امیر بیگم اُردو اور فارسی اساتذہ کے کلام سے شناسا ہونے کے علاوہ خود بھی شعر کہتی تھیں۔ نہایت فصیح و بلیغ اُردو میں بات چیت کرتیں" (۹۷) امیر کے پرسوز لحن اور منفرد و مہذب شخصیت سے اِقبال اِسقدر متاثر ہوئے کہ وہ "صنم خانۂ امیر" کے پرستار بن گئے: ۱۹۰۴ء کی ایک نظم کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ (۹۸)

عجب شے ہے صنم خانۂ امیرؔ اِقبال
میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اِس سے پہلے ۱۹۰۲ء کے ایک خط بنام منشی سراج الدین (۱۸۷۶۔۱۹۴۱ء) میں بھی "امیر" سے قلبی تعلق کے اشارے ملتے ہیں۔ (۹۹)

گشت اے اِقبال مقبول امیرِ ملکِ حسن
کردہ وا مارا گرہ آخر ز کارِ انگشتری

دوسری طرف امیر بھی اِقبال کی گرویدہ تھیں۔ اِسی لیے جب وہ اپنی خاصی صحبتوں میں امیر کو بلاتے تو وہ بے تامل حاضر ہو جاتیں (۱۰۰) منشی سراج الدین کے نام ایک خط محررہ ۱۱ مارچ

۱۹۰۳ء میں بھی ہمیں امیر کا اشارہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں "ابرِ گہربار کی اصل علت کی آمد آمد ہے' یہ جملہ شاید آپ کو بے معنی معلوم ہو مگر کبھی بوقت ملاقات آپ پر اِسکا مفہوم واضح ہو جائے گا" (۱۰۱) یہاں "ابرِ گہربار کی اصل علت" سے اِقبال کا اشارہ امیر کی جانب ہے جن کی آمد کے وہ منتظر تھے (۱۰۲)

اِس دور کی بہت سی غزلوں اور نظموں میں اِس قلبی واردات کا اظہار ملتا ہے اور بہت سے اشعار عشق مجازی کی والہانہ کیفیت اور سوز و مستی کے آئینہ دار ہیں۔ امیر سے میل ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۴ء تک چلتا رہا لیکن پھر والدۂ امیر کے سخت قدغن کی وجہ سے امیر ہمیشہ کے لیے اِقبال سے جدا ہو گئی۔ (۱۰۳)

ایسی واردات شاید اِقبال کے لیے وہ مطلب نہ رکھتی ہو جو ہم اخذ کرتے ہیں۔ اِن کے کسی دوست کے نزدیک جو "رنگ رلیاں" ہیں ہو سکتا ہے وہ اِقبال کے لیے فکر انگیزی کا باعث ہوں' ان کے تخیل کے لیے تازیانہ کا کام دیتی ہوں مگر مروجہ اصولوں کے مطابق آج بھی اور آج سے ایک صدی قبل بھی کسی شادی شدہ اور دو تین بچوں کے باپ کا کسی "غیر عورت" سے ایسا تعلق خاطر کہ "میں جتنا دور ہو رہاں ہوں' اتنا نزدیک ہو رہا ہوں" اسکی منکوحہ بیوی اور اسکے سسرال والوں کے لیے کیونکر قابلِ قبول ہو سکتا ہے بلکہ خود اِقبال کے والدین بھی ایسے تعلق کو پسند نہیں کر سکتے کہ ان کا بیٹا اپنی منکوحہ بیوی کو درخورِ اعتنانہ سمجھے اور 'بازاری عورتوں' کے حسن سے متاثر ہو کر اِن سے لو لگا بیٹھے۔

یہ ایک مثال ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اِقبال گجرات آتے تو یہاں بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے اپنی حسن پسندی اور ذوقِ دید کا مظاہرہ کسی نہ کسی رنگ میں ہو جایا کرتا تھا اور سسرال والے اِس بات سے ناراض ہوتے تھے۔

(۱۳) یورپ' عطیہ اور ویگے ناست:۔

اِقبال کی ذاتی زِندگی کے حوالے سے جس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا گیا وہ ان کا عطیہ بیگم سے تعلق ہے۔ اِس پر لکھنے والوں کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ جنکا خیال ہے کہ اِقبال کو اِنسان کا عشق ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ جنکا خیال ہے کہ اِقبال چونکہ ایک اِنسان تھے' حسن پسند اور شاعر تھے اِس لیے اِنسان کا عشق نہ صرف ممکن ہے بلکہ عین ممکن ہے اور انہیں عشق ہوا بھی مثلاً عطیہ بیگم سے۔

۳۔ جنکا خیال ہے کہ عطیہ اور ویگے ناست جیسی خواتین نے اِقبال کو وقتی

طور پر متاثر کیا اور جذباتی سہارا فراہم کیا اور بس!

بقول اِقبال'

لکھی جائیں گی کتابِ دِل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

راقم الحروف کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے جو سمجھتا ہے کہ اِقبال" اِنسان تھے اِس لیے انہیں عشق ہونا غیر ممکن نہیں؟

تفصیلات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اِقبال کے محبوب میں درج ذیل خوبیوں کا وجود ضروری تھا:۔

☆ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت
☆ ذہانت' فطانت اور متانت
☆ علم و آدب سے لگاؤ
☆ خود اعتمادی اور حاضر دماغی

اِن خوبیوں کا امتزاج اِنہیں جہاں بھی نظر آیا وہ کھنچے چلے گئے۔ اِن خصوصیات کا ہلکا سا پرتو اِنہیں امیر بیگم میں نظر آیا تو اس کے پرستار بن گئے اور جب اِنہی خصوصیات کا بھرپور امتزاج انہیں عطیہ بیگم اور ویگے ناست میں نظر آیا تو ان کے شیدا ہو گئے۔

لاہور کی گھٹی گھٹی فضا سے جب وہ آپنے "ہر دم ارتقاء پذیر دماغ" کے ساتھ یورپ کی مخلوط معاشرت میں پہنچے تو وہاں انہیں عورت کے کچھ نئے روپ مثلاً علم دوستی' اخلاق' خود اعتمادی' فلسفہ دانی' حاضر دماغی دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ عطیہ کی حاضر دماغی' ویگے ناسٹ کی نکتہ آفرینی اور سینے شل کی فلسفہ دانی سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ وہ یہاں عورت کی ذہنی اور تہذیبی صلاحیتوں سے پہلی بار پوری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اِن خواتین میں سے ہمیں عطیہ فیضی اور ویگے ناست کا ذِکر قدرے تفصیل سے کرنا ہے۔

تفصیل میں گئے بغیر' درج ذیل اشارے ظاہر کرتے ہیں کہ اِقبال عطیہ بیگم کو پسند کرتے تھے باہمی تعلق میں زیادہ گرمجوشی عطیہ کی طرف سے تھی جبکہ ویگے ناست کے سلسلے میں زیادہ گرمجوشی کا اظہار اِقبال کی طرف سے ملتا ہے۔ اِن اشاروں کی موجودگی میں کسی بھی ذی عقل اِنسان کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں۔ اور راقم کا خیال ہے کہ اِقبال کو اِنسانی محبت سے عاری یا بالاتر سمجھنا اِقبال پر ایک الزام اور ظلم ہے۔ ایسا خیال کرنا گویا انہیں ایک ذی روح کے رتبہ سے گرانا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "اِقبال کا عشق اِنسان سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اِقبال کا عشق یا خدا سے تھا یا پیغمبر سے" یہ بات سمجھنے سے کیوں اِنکاری ہیں کہ

اِنسان کا عشق بھی تو خالق کے عشق کا ایک رخ ہے اور عشق مجازی کی منازل طے کرنے کے بعد اِقبال جیسے شخص کے لیے عشق حقیقی کی منزل کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔

ذیل میں وہ اشارات دیے جا رہے ہیں جو ہمیں اِقبال کے خطوط بنام عطیہ میں ملتے ہیں۔ (۱۰۴) یا اِن کی شاعری میں موجود ہیں اور اِن کے عطیہ سے تعلق خاطر کا پتہ دیتے ہیں۔ اِن میں ایسے احساسات کا اظہار ہے جو محبت کے بغیر جنم نہیں لے سکتے اور محبت کے غماز ہیں:۔

۱۔ غزلیات کے مجموعہ کا اِنتساب ایک "ہندوستانی خاتون" کے نام کرنے کی خواہش کا اظہار۔

۲۔ "آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں"۔

۳۔ اپنی ازدواجی زِندگی کے قضیئے کا تفصیلی ذِکر صرف عطیہ سے۔

۴۔ "میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاتا اور میرا اعتقاد ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے"۔

۵۔ "میری یہ عادت رہی ہے کہ آپ کی خواہشات کا مطالعہ کروں اور آپ کو ہر ممکن طریقے سے خوش کروں"۔

۶۔ "میں ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے آپ خوش ہوں"۔

۷۔ "ہزھائی نس نے میری نقل و حرکت کے بارے میں آپ کو واحد حکم سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ کیا میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا بنا رہنا پسند نہیں کیا۔ اگرچہ میں نے اِس حکم کی طاقت کو تسلیم کر لیا ہے اور ہمیشہ تسلیم کروں گا۔ بعض اشخاص آپ کے بارے میں مجھے بھی ایسا ہی حکم تسلیم کرتے ہیں۔

۸۔ "مجھے ڈر ہے کہ میں وہ باتیں لکھ رہا ہوں جو صرف گفتگو کے لیے محفوظ رہنی چاہییے تھیں۔ میں اور کچھ نہیں لکھونگا اِس سے مجھے ترغیب ملتی ہے کہ میں آپنے دِل کی ساری باتیں کہہ ڈالوں"۔

۹۔ "اِن دِنوں کی یاد میں ۔ جو فطرت میں مردہ ہو چکے ہیں مگر میرے دِل کی دُنیا میں زِندہ ہیں"۔

۱۰۔ "شاعری کے متعلق میں آپنے دِل میں کسی قسم کا ولولہ محسوس نہیں کرتا اور آپ ہی اِسکی ذمہ دار ہیں"۔

۱۱۔ "گزشتہ پانچ چھ سالوں سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی رہی ہیں اور میرا خیال ہے کہ پبلک کو انہیں پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اِن میں سے بعض کو تو میں نے کلیتہً تلف کر دیا ہے اِس ڈر سے کہ کہیں کوئی انہیں چرُا کر نہ لے جائے اور شائع نہ کر دے"۔

۱۲۔ "وصال" کے عنوان سے نظم کا اولاً عنوان "------ کے نام" تھا اور شیخ اعجاز احمد نے غالب امکان کے طور پر عطیہ کا نام لیا ہے۔ (۱۰۵)

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گُل مجھے

۱۳۔ قیامِ یورپ کی ایک اور نظم "حسن و عشق" بھی اسی بات کی دلالت کرتی ہے۔ (۱۰۶)

ہے مرے باغ سخن کے لیے تو بادِ بہار — مرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد تیرا عشق ہوا سینے میں — نئے جوہر ہوئے پیدا میرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال — تجھ سے سر سبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

۱۴۔ اسی دور کی ایک نظم "پیش کش ـــ" کے بارے میں بھی یہی خیال ہے۔ (۱۰۷)

ہے تری منت طلب میری بہارِ شاعری — تازہ تر میرے دامن میں گلِ مضموں میرا
عشق لیکن دردِ محرومی سے پاتا ہے کمال — ہجرِ لیلیٰ سے ہوا آوارہ تر مجنوں میرا

۱۵۔ اسی دور کی ایک اور نظم "سلیمیٰ" کے بارے میں بھی ڈاکٹر اکبر حیدری نے یہی امکان ظاہر کیا ہے۔ (۱۰۸)

۱۶۔ قیامِ انگلستان کی نظم بعنوان "کلی" بھی اسی خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ (۱۰۹)

۱۷۔ "وصال" کے عنوان سے نظم '۱۹۰۷' میں لکھی گئی مگر ناکامیٔ الفت پر "نوائے غم" ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی لیکن احتیاطاً اسے "بانگِ درا" کے حصہ دوم (۱۹۰۵ ـ ۱۹۰۸ء) میں رکھا گیا۔ (۱۱۰)

زندگانی ہے میری مثلِ رباب خاموش — جسکی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی — چوٹ مضراب کی اِس ساز نے کھائی نہ کبھی

۱۸۔ ۱۹۱۱ء کی ایک اور نظم "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" بھی شاعر کے دلی جذبات کا اظہار ہے۔ (۱۱۱)

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

پھر کہتے ہیں'

کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مدعا نہ ہوا
کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا

۱۹۔ شیخ اعجاز احمد مرحوم نے خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں (۱۱۲)

"معلوم ہوتا ہے کہ جستجو جس گُل کی انہیں تڑپاتی تھی وہ گل انہیں قیامِ یورپ کے دوران مل گیا۔ ذاتی علم نہ ہونے کی وجہ سے اِس گل کو یقین کے ساتھ Identify کرنا راقم الحروف کے لیے ممکن نہیں' وہ عطیہ فیضی تھی یا مس ویگے ناست یا کوئی اور (اغلباً اول الذکر) لیکن جو کوئی بھی تھی ان دنوں میں

وہ اِنہیں اَپنے "باغِ سخن کے لیے بادِ بہار" محسوس ہوئی جس نے انکے بیتاب تخیل کو قرار دیا.... اِس زمانے کا ان کا کلام اِن کی قلبی کیفیت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ افسوس وہ اَپنے حالات سے مجبور نہ تو اس گل کو توڑ کر اپنی دستار میں رکھ سکے نہ زیبِ گلو کر سکے..... ان کے حالات کا ظلم اِن کے لیے تمہید کرم ہوا۔ ان کے حالات میں اِس گل کی بیل شاید کیا یقیناً منڈھے نہ چڑھتی" (کیونکہ اِقبال کو علم اور تجربہ تھا کہ نازو نعم میں پلی بڑھی کریم بی بی سے وہ نباہ نہیں کر سکے تو عطیہ، کریم بی بی سے بھی بڑے گھرانے اور اونچے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ ناقل۔ م۔ س)

اِقبال کے کچھ خطوط سے جو انہوں نے جرمن دوست، مس ویگے ناست (۱۸۷۹۔ ۱۹۶۴ء) کو لکھے، اِن کی قلبی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور ویگے ناست سے محبت کی غمازی ہوتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

اِقبال ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء کو لندن سے لکھتے ہیں: (۱۱۳)

"میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میرے باطن میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش ہے کہ آپ سے دوبارہ بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو۔ اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہ کرم میں نے جو لکھا ہے اِس کے لیے مجھے معاف فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اِس قسم کے اظہار جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔ براہ کرم جلد لکھئے اور سب کچھ۔ یہ اچھا نہیں کہ اس شخص سے کچھ چھپایا جائے جو آپ سے کچھ نہیں چھپاتا"۔

۲۰ جنوری ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں: (۱۱۴)

"دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی لیکن یہ مت باور کیجئے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے دِل میں بھی جاپذیر ہیں اور مدام رہیں گی۔ شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپکو دیکھ پاؤں لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زِندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا"۔

لاہور سے ۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں:۔ (۱۱۵)

"شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ

عرصہ بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا مقصد ہے اور تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہو گا"۔

عطیہ کے نام ایک خط میں اِقبال نے لکھا۔ (۱۱۶)

"میں اِس لڑکی (ویگے ناست) کو بے حد پسند کرتا ہوں' وہ کس قدر اچھی اور سچی ہے"۔

عطیہ لکھتی ہیں۔ (۱۱۷)

"مس ویگے ناست سے اِقبال بہت محبت کرتے تھے"۔

اِقتباسات کے درج بالا طویل سلسلے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اِقبال عطیہ اور ویگے ناست دونوں سے تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ یہ تعلق اِن کی ازدواجی زِندگی کے بحران میں کیا اہمیت رکھتا ہے اِس کا جواب ہر ذی عقل فرد دے سکتا ہے کہ جب دِل میں کبھی امیر' جاگزیں ہو' کبھی عطیہ کا قبضہ ہو اور کبھی ویگے ناست بس رہی ہو تو بیوی کا مقام کیا رہ جاتا ہے اور ازدواجی زِندگی کس موڑ پر آکھڑی ہوتی ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔ (۱۱۸)

"لندن میں اِقبال کو عطیہ بیگم فیضی کی رفاقت میسر آئی اور یورپ میں درسِ فلسفہ کے لیے اِنہیں مس ویگے ناست اور مس سینے شل کی شاگردی کرنی پڑی۔ یہ تینوں جواں حسین و جمال اور بے حد ذہین تھیں۔ اِقبال کی طبیعت پر انہوں نے گہرا اثر کیا۔ اِقبال اپنی فطرت کے تقاضے سے پرستاری پر مجبور تھے۔ ان کی پہلی متاہل زِندگی اطمینان بخش نہیں تھی اِس لیے انہیں ایک محرمِ راز کی تلاش تھی جسے وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ سکیں مگر اِن کی کوشش پروان نہ چڑھی اور اِن کا عشق مجاز کی منزلیں طے کرتا ہوا ناکامی سے دوچار ہو کر حقیقت کی طرف مڑ گیا۔ یہ قدرت کا عظیم کرشمہ ہے کہ ایک عورت نے اپنے وقت کی دو عظیم اَدبی شخصیات (شبلی اور اِقبال) کو عجیب طریق سے متاثر کیا۔ دونوں نے شعر کہے۔ ایک کے دبے ہوئے جذبات معاملہ بندی اور واقعہ نگاری کی رنگینیوں کے وقف ہو گئے اور دوسرے کا شوقِ بے پروا ترفع اور تجرید کا مقام پا گیا"۔

(۱۴) دوسری اور تیسری شادی۔ مسئلے کا سبب یا حل:۔

آفتاب اِقبال اپنے ایک تحریری اِنٹرویو میں لکھتے ہیں۔ (۱۱۹)

"میرے علم میں اختلاف کی وجہ سے دوسری شادیاں تھیں..... جنکی وجہ سے آپس کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ یہ ایک قدرتی بات تھی..... گھر میں بدمزگیوں کا آغاز ہوا......"۔

اِس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اِختلافات' دوسری شادیوں سے شروع ہوئے۔ مگر حقیقت اِس کے برعکس تھی یعنی اختلافات کی وجہ سے دوسری شادی کی ضرورت پیش آئی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ دوسری شادیوں سے اختلافات اِس حد تک چلے گئے جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی اور یہ اختلافات علیحدگی پر منتج ہوئے لیکن اِقبال یورپ سے واپسی پر ہی کریم بی بی کو ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ دوسری شادی کے سلسلے میں ایک اور غلط بیانی کی درستگی بھی ضروری ہے۔ خالد نظیر صوفی لکھتے ہیں۔ (۱۲۰)

"حکیم الامت چونکہ ایک اعلیٰ سیرت' نیک چلن اور پاک طینت بیوی کے خواہشمند تھے اِس لیے گھریلو قسم کی خاتون سے شادی پر اظہار آسودگی فرمایا"۔

کیا کریم بی بی اعلیٰ سیرت' نیک چلن اور پاک طینت نہیں تھی۔ اگر یہی خصوصیات' اِقبال کی خواہش تھیں تو کیا یہ کریم بی بی میں موجود نہیں تھیں؟ جس کی نجابت و شرافت کو سب نے تسلیم کیا تھا۔

حوالہ جات و حواشی:۔

(۱) شیما مجید مرتبہ شباب نگر۔ جنگ پبلشرز لاہور' دیباچہ

(۲) اقبال درونِ خانہ از خالد نظیر صوفی ۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۱

(۳) سرگزشتِ اِقبال از عبدالسلام خورشید۔ لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۷

(۴) داستانِ اِقبال از صابر کلوروی' لاہور' صفحہ ۱۵۱

(۵) مفکرِ پاکستان از حنیف شاہد' لاہور ۱۹۸۲ء صفحہ ۴۷۲

(۶) مضمون "اِقبال اور گجرات" مطبوعہ "اِقبالیات" لاہور' جنوری مارچ ۱۹۸۸ء

(۷) اقبال درونِ خانہ از خالد نظیر صوفی بزم اقبال لاہور طبع اول ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۱

(۸) دانائے راز از سید نذیر نیازی۔ صفحہ ۷۵

(۹) قریبی ذرائع یہ ہیں۔

(ا) اِقبال کی ہمشیرہ' کریم بی بی' کا اِنٹرویو از م۔ ش۔ مطبوعہ ہفت روزہ "آفاق" لاہور بابت ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۷

(ب) شیخ اعجاز احمد۔ "مظلوم اِقبال" صفحہ ۴۳

(ج) ڈاکٹر جاوید اِقبال۔ زِندہ رود جلد اول صفحہ ۴۷

(۹) اِقبال کی خواہرِ نسبتی شہزادہ بیگم کے صاحبزادے سید پرویز سجاد بخاری نے بھی اپنی والدہ کے حوالے سے اِسی بات کی تصدیق کی۔

(۱۰) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" اَز ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین' سے مدد لی گئی ہے۔ صفحہ ۳۹' ۱۳۰ تا ۱۴۰

(۱۱) ایضاً صفحہ ۱۷۷' ۱۷۸ + زِندہ رود جلد دوم صفحہ ۴۲' ۴۳

(۱۲) روایات اِقبال صفحہ ۲۵' ۲۶ اور سہ ماہی صحیفۂ اِقبال نمبر ۱۹۸۲ء بحوالہ نقوش اِقبال نمبر۔ نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۸۳

(۱۳) غالباً "کلاہ ساز" لکھا گیا ہے۔

(۱۴) سوائے لفظ "بیگم مسجد" کے باقی پڑھا نہیں جاتا۔ "شاعر" اِقبال نمبر۱۔ ۱۹۸۸ء نے یہی لکھا ہے۔

(۱۵) حافظ غلام احمد صاحب' مسجد شاہدولہ دربار گجرات کے خطیب و پیش امام تھے۔ مشہور ادیب جناب شریف کنجاہی کے نانا اور گجرات کے ماضی کے مشہور حکیم غلام مصطفیٰ (م۔۱۹۴۶ء) کے برادرِ نسبتی تھے۔ اِنکا آبائی گاؤں بیگہ بانیاں ضلع گجرات تھا' جہاں سے اِن کے والد حافظ محمد اکرم ہجرت کر کے گجرات شہر میں آ آباد ہوئے تھے۔ اور دربار شاہدولہ کے ساتھ ہی ایک مکان میں رہنے لگے تھے۔ حافظ غلام احمد کے والد محمد اکرم' دادا مبارک الدین اور پڑدادا محمد عبداللہ سبھی حافظ قرآن اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ حافظ غلام احمد نے اپنے والد کے علاوہ مولوی حکیم نورالدین (قادیان) سے اکتسابِ علم کیا۔ اور حکیم احمد دین سے طب کا درس لیا۔

حافظ محمد اکرم دربار شاہدولہ کی مسجد کے خطیب تھے اِن کے بعد حافظ غلام احمد نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ حافظ غلام احمد' قاضی سلطان محمود کے دوستوں اور ارادتمندوں میں نمایاں تھے۔ قاضی صاحب بھی اِن کے تبحرِ علمی کے معترف تھے۔ شاہدولہ سے قاضی صاحب کو فیض پہنچا تھا اور دربار کی مسجد کی تعمیر میں بھی قاضی صاحب کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ اِس مسجد کی تعمیر میں حافظ صاحب نے اِنکی بھرپور مدد کی تھی۔ قاضی صاحب گجرات تشریف لاتے تو حافظ صاحب کے پاس ہی ٹھہرتے۔

اِقبال اور کریم بی بی کے نکاح کے لیے حافظ صاحب کو خصوصی طور پر بلایا گیا تھا۔ کیونکہ شیخ نور محمد اور شیخ عطا محمد دونوں قاضی صاحب کے ارادتمند تھے اور حافظ صاحب سے اِس تعلق کی وجہ سے متعارف تھے۔ حالانکہ قریب اور مساجد اور نکاح خواں بھی موجود تھے۔

حافظ صاحب کی اولادِ نرینہ زِندہ نہ رہی۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ اِنتقال کیا۔ اور مسجد دربار شاہدولہ کے متصل دفن ہوئے۔

(۱۶) اِقبال کی ابتدائی زِندگی صفحہ ۳۱

(۱۷) زِندہ رود جلد دوم صفحہ ۴۳

(۱۸) یہ معلومات کٹڑہ شالباقاں (گجرات) کے ایک بزرگ محمد سرور بٹ نے' راقم سے ایک ملاقات مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء میں فراہم کیں۔

(۱۹) مکتوب کرنل خواجہ عبدالرشید بنام ڈاکٹر احمد حسین قلعداری مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹٦۷ء از کراچی بروایت لیفٹیننٹ جنرل محمد افضل فاروقی
(۲۰) ایضاً
(۲۱) "ابتدائی کلام اقبال" مرتبہ ڈاکٹر گیان چند۔ اردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد۔ انڈیا۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۷
(۲۲) "عروج اقبال" از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ بزم اقبال لاہور' ۱۹۸۷ء' صفحہ ٦۱
(۲۳) مکتوب اقبال بنام نیازالدین خان محرہ ٦' اپریل ۱۹۲۰ء
(۲۴) یہ دونوں واقعات "مجلّہ" حروف' زمیندار سائنس کالج گجرات' ۱۹۸۸ء سے لیے گئے ہیں صفحہ ۹۴۔ مضمون پروفیسر شیخ اعجاز احمد
(۲۵) نقوش۔ اقبال نمبر' نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۸۳
(۲٦) علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی از سید حامد جلالی صفحہ ۳۷
(۲۷) دانائے راز صفحہ ۷٦
(۲۸) روایات اقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی۔ روایت خواجہ فیروزالدین صفحہ ۸۸
(۲۹) مظلوم اقبال صفحہ ۹۹
(۳۰) اقبال از عطیہ بیگم۔ مترجم ضیاء الدین احمد برنی۔ اقبال اکادمی لاہور' ۱۹۸۱ء صفحہ ۵۱' ۱۳۵ (خط انگریزی میں تھا۔ ترجمہ راقم نے خود کیا ہے اور برنی صاحب کا ترجمہ سامنے رکھا ہے)
(۳۱) ایضاً صفحہ ۵٦
(۳۲) ایضاً صفحہ ۴۷
(۳۳) اقبالنامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ صفحہ ۳۵
(۳۴) مظلوم اقبال صفحہ ۱۰۱
(۳۵) مولوی محمد حسین کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کے دوست مرزا جلال الدین کے لڑکوں کو عربی پڑھاتے تھے۔ مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔
(۳٦) "سرگزشت اقبال" از عبدالسلام خورشید۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء' صفحہ ۸۱
(۳۷) مجلہ "شاعر" بمبئی۔ اقبال نمبر۱۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۲٦۔ تحریری انٹرویو آفتاب اقبال
(۳۸) دانائے راز صفحہ ۷٦' ۷۷
(۳۹) مظلوم اقبال' صفحہ ۱۰۴
(۴۰) مجلہ شاعر بمبئی۔ اقبال نمبر۱۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۵۵۴
(۴۱) ایضاً صفحہ ۵۵٦
(۴۲) ایضاً صفحہ ۵٦۰
(۴۳) ایضاً صفحہ ۵۴۲
(۴۴) مظلوم اقبال صفحہ ۱۰۴

(۴۵) دانائے راز صفحہ ۷۶
(۴۶) یہ خطوط "علامہ اقبال اور اِن کی پہلی بیوی" از سید حامد جلالی کے صفحات ۵۷ تا ۶۰ پر درج ہیں۔
(۴۷) ایضاً صفحہ ۶۴
(۴۸) ماہنامہ 'شاعر' بمبئی۔ اقبال نمبر۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۵۹۰
(۴۹) "علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۹۵
(۵۰) 'اقبال ۸۵'۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت۔ صفحہ ۵۶
(۵۱) بحوالہ دانائے راز صفحہ ۷۷
(۵۲) کریسنٹ۔ حالی نمبر' اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور۔ ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۲
(۵۳) "حیات جاوید" از مولانا الطاف حسین حالی۔ دیباچہ
(۵۴) ذکر اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ ۱
(۵۵) موج کوثر از شیخ محمد اکرام صفحہ ۲۴۸
(۵۶) اقبال ۸۵۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت۔ صفحہ ۱۰
(۵۷) مضمون "میرا اقبال" از مرزا جلال الدین۔ ملفوظاتِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صفحہ ۱۱۳
(۵۸) مظلوم اقبال صفحہ ۱۰۲
(۵۹) دانائے راز صفحہ ۷۷
(۶۰) اقبال درونِ خانہ صفحہ ۱۴۱
(۶۱) ا: 'میرا بھائی'۔ اقبال کی بہن کی زبانی۔ از م ۔ ش۔ مطبوعہ ہفت روزہ "آفاق" لاہور بابت ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۷
ب: مظلوم اقبال صفحہ ۴۳
(۶۲) اقبال از عطیہ بیگم: مترجم ضیاء الدین احمد برنی۔ اقبال اکادمی لاہور صفحہ ۵۱
(۶۳) ایضاً صفحہ ۹۱
(۶۴) مظلوم اقبال صفحہ ۹۱
(۶۵) زندہ رود جلد اول صفحہ ۴۷
(۶۶) کلاسیکی ادب کا مطالعہ از ڈاکٹر وحید قریشی: لاہور۔ ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۰۶، ۳۰۷
(۶۷) پاکستان ٹائمز (انگریزی روزنامہ) ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء بحوالہ زندہ رود جلد اول صفحہ ۴۷
(۶۸) ماہنامہ "سیّارہ" لاہور بابت ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء بحوالہ زندہ رود جلد اول صفحہ ۴۷
(۶۹) "شاعر" بمبئی۔ اقبال نمبر۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۶۳۶
(۷۰) ایضاً (تحریری انٹرویو فاطمہ بی بی)
(۷۱) مظلوم اقبال صفحہ ۶۳ تا ۶۶
(۷۲) "علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۴۰

(۷۳) ایضاً صفحہ ۴۴
(۷۴) ایضاً صفحہ ۴۱
(۷۵) ہفت روزہ "آفاق" لاہور۔ بابت ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء صفحہ ۴۲
(۷۶) مظلوم اِقبال صفحہ ۹۹ ۔ ۹۸
(۷۷) دانائے راز صفحہ ۷۷
(۷۸) زِندہ رود جلد دوم صفحہ ۲۴۳
(۷۹) مکتوب بنام عطیہ بیگم مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء
(۸۰) ایضاً
(۸۱) ہفت روزہ "صادق" لاہور۔ صفحہ ۲۷ بابت ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء
(۸۲) "حیات اِقبال کا ایک جذباتی دور از پروفیسر محمد عثمان" لاہور، ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۷۵-۶
(۸۳) ماہنامہ، شاعر، بمبئی۔ اِقبال نمبر۔ ۱۹۸۸ء اِنٹرویو فاطمہ بیگم صفحہ ۶۳۰
(۸۴) زِندہ رود جلد دوم صفحہ ۱۲۶
(۸۵) اِقبال درون خانہ صفحہ ۱۴۱
(۸۶) ماہنامہ "شاعر" بمبئی (مذکورہ بالا) صفحہ ۶۳۰
(۸۷) مطالعہ تلمیحات و اشارات اِقبال از ڈاکٹر اکبر حسین قریشی۔ اِقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۹
(۸۸) راقم کی ملاقات مورخہ ۷ جنوری ۱۹۹۱ء
(۸۹) "حیاتِ اِقبال کا ایک جذباتی دور" صفحہ ۲۴۳
(۹۰) ذِکر اِقبال صفحہ ۷۱
(۹۱) ایضاً صفحہ ۷۰
(۹۲) ایضاً صفحہ ۷۰
(۹۳) روایاتِ اِقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی صفحہ ۱۲۹
(۹۴) ملفوظاتِ اِقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ صفحہ ۹۴
(۹۵) ایضاً صفحہ ۱۱۴
(۹۶) کلیاتِ مکاتیبِ اِقبال۔ مرتبہ سید مظفر حسین برنی۔ اُردو اکادمی دھلی ۱۹۹۲، صفحہ ۷۹، ۸۰
(۹۷) زِندہ رود باب ۹۔ جلد دوم صفحہ ۱۷۶
(۹۸) یہ نظم "سرگزشتِ آدم" ہے جو ستمبر ۱۹۰۴ء کے مخزن میں غزل کے روپ میں شائع ہوئی "بانگ درا" میں شامل نظم میں یہ شعر موجود نہیں۔
(۹۹) تفصیل کے لیے دیکھئے کلیاتِ مکاتیب اِقبال صفحہ ۶۴ تا ۶۷
(۱۰۰) عروجِ اِقبال از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ بزم اِقبال لاہور، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۱۲۰
(۱۰۱) اِقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۲۰

(۱۰۲) عروج اِقبال صفحہ ۱۳۰

(۱۰۳) ایضاً صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱، ۲۶۹، ۲۷۰

امیر بیگم کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھئے

ا۔ "شورش" ۔ از شورش کاشمیری۔ چٹان مطبوعات لاہور، ۱۹۶۷ء

ب ۔ "اس بازار میں" از شورش کاشمیری صفحہ ۱۹۶، ۲۲۲ تا ۲۲۴

ج ۔ زِندہ رود جلد دوم صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۹۶

(شورش کی تحریر کو ڈاکٹر جاوید اِقبال نے "غلط فہمی پر مبنی" قرار دیا ہے (زِندہ رود صفحہ ۲۹۶) مگر یہ نہیں بتایا کہ غلط فہمی کیا ہے اور صحیح صورت حال کیا ہے) (م۔س)

د ۔عروج اِقبال از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱، ۲۶۹، ۲۷۰

(۱۰۴) اِقبال از عطیہ بیگم اُردو ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی صفحات ۵۰ تا ۷۶

(۱۰۵) مظلوم اِقبال صفحہ ۲۱۳، ۲۳۱

(۱۰۶) ایضاً صفحہ ۲۳۱

(۱۰۷) ایضاً صفحہ ۲۳۱

(۱۰۸) ابتدائی کلام اِقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر گیان چند۔ اُردو ریسرچ سنٹر حیدر آباد انڈیا۔ ۱۹۸۸ء، ۳۲۲

(۱۰۹) مظلوم اِقبال صفحہ ۲۳۲

(۱۱۰) حیات اِقبال کا ایک جذباتی دور صفحہ ۲۸۵

(۱۱۱) ایضاً صفحہ ۲۸۷

(۱۱۲) مظلوم اِقبال صفحہ ۲۱۳

(۱۱۳) کلیات مکاتیب اِقبال صفحہ ۱۳۶

(۱۱۴) ایضاً صفحہ ۱۳۰

(۱۱۵) ایضاً صفحہ ۱۴۳

(۱۱۶) اِقبال از عطیہ بیگم صفحہ ۵۳

(۱۱۷) ایضاً صفحہ ۵۴

(۱۱۸) شعر العجم فی الہند از شیخ محمد اکرام۔ ۱۹۶۱ء، صفحہ ۲۰۷

(۱۱۹) ماہنامہ 'شاعر' بمبئی۔ اِقبال نمبر ا۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۴۳۵

(۱۲۰) 'اِقبال درون خانہ' صفحہ ۱۴۱

حصۂ دوم: زوجۂ اولیٰ، اولاد، سسرالی خاندان

- زوجۂ اولیٰ، کریم بی بی
- اولاد :-
  - معراج بیگم
  - آفتاب اقبال
- سسرالی خاندان:-
  - خسر، خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد
  - خوشدامن، زینب بی بی
  - برادرِ نسبتی، ڈاکٹر شیخ غلام محمد
  - خواہرانِ نسبتی:-
    - نواب بی بی
    - فاطمہ بی بی
    - حمیدہ بیگم
    - شہزادہ بیگم
  - فرزند برادرِ نسبتی، شیخ محمد مسعود

زوجۂ اولیٰ' کریم بی بی

کریم بی بی' علامہ محمد اِقبال کی پہلی بیوی' ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی سب سے بڑی صاحبزادی اور بیرسٹر آفتاب اِقبال کی والدہ محترمہ تھیں۔

کریم بی بی ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو گجرات شہر کے محلہ کٹڑہ شالبافاں میں پیدا ہوئیں۔ (۱) اِن دنوں اِن کے والد شیخ عطا محمد میڈیکل سکول لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ اس دور میں گجرات میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی ادارہ نہ تھا اور نہ اس کی روایت تھی چنانچہ کریم بی بی نے گھر پر ہی قرآن مجید پڑھنا سیکھا اور بنیادی دینی مسائل کا علم حاصل کیا۔ میڈیکل کالج سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر عطا محمد مختلف مقامات پر تعینات رہے اس دوران ان کا خاندان گجرات میں ہی اَپنے آبائی گھر میں رہائش پذیر رہا۔ ۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر عطا محمد کو حدیدہ اور تامران میں حکومت ہند کی جانب سے وائس کونسل مقرر کیا گیا' ڈاکٹر صاحب اَپنے خاندان کو بھی ساتھ لے گئے۔ جہاں وہ دسمبر ۱۸۹۱ء تک رہے۔ اس دوران کریم بی بی نے عربی بھی سیکھ لی اور حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ "علامہ اِقبال اور ان کی پہلی بیوی" کے مصنف سید حامد جلالی نقوی لکھتے ہیں:۔

> "کریم بی بی دس برس جدہ میں رہیں اور عربی بے تکان بولتی تھیں۔ بارہا حج کی سعادت حاصل کی" (۲)

(کریم بی بی عربی بول سکتی تھیں لیکن وہ جدہ میں نہیں' حدیدہ میں رہیں اور دس برس نہیں' سات برس) خواجہ فیروزالدین (اِقبال کے ہم زلف) رقمطراز ہیں۔

> "ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خسر ڈاکٹر عطا محمد صاحب (ساکن گجرات) حافظِ قرآن تھے وہ مدت تک عرب میں رہے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے گھر میں عربی خاصی بولی جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ (کریم بی بی) بھی بے تکلف عربی بولتی تھیں"۔ (۳)

حدیدہ سے واپسی پر کریم بی بی کی عمر ۱۸ برس ہو چکی تھی چنانچہ ڈاکٹر عطا محمد کو اِن کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ چندہ ماہ بعد ان کی نسبت محمد اِقبال سے ٹھہرا دی گئی۔ اِقبال اس وقت نویں جماعت کے آخری مہینوں میں تھے۔ منگنی کے تقریباً ایک سال بعد کریم بی بی اور اِقبال کی شادی ہو گئی۔ کریم بی بی سے اِقبال کی تین اولادیں پیدا ہوئیں۔

۱۸۹۶ء میں معراج بیگم
۱۸۹۸ء میں آفتاب اِقبال

۱۹۰۱ء میں ایک بیٹا پیدا ہوا جو پیدائش کے فوراً بعد فوت ہو گیا۔
شادی کے بعد کریم بی بی دو سال سیالکوٹ میں رہیں پھر جب اقبال لاہور چلے گئے تو وہ زیادہ تر اپنے والدین کے ہاں قیام پذیر رہتیں۔ کبھی کبھار سیالکوٹ میں کچھ دن کے لیے ٹھہرتی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں جب معراج بیگم کا انتقال ہو گیا تو اس کے بعد کریم بی بی کبھی سیالکوٹ نہیں گئیں (۴) اقبال کی دوسری اور تیسری شادی کے بعد کریم بی بی کچھ عرصہ لاہور میں رہیں، مگر اختلافات مزید بڑھ گئے اور پھر کبھی کریم بی بی لاہور میں علامہ کے گھر نہیں رہیں۔ اس کے چند سالوں بعد ان کے والد اور بھائی کا انتقال ہو گیا تو وہ زیادہ تر اپنی بہنوں شہزادہ بیگم کے پاس گجرات میں (۵) یا فاطمہ بی بی کے پاس لاہور میں رہتی تھیں۔ (۶) جب ۱۹۴۵ء میں آفتاب نے اپنی لاء پریکٹس شروع کی تو وہ مستقلاً ان کے ہاں رہنے لگیں اور تازیست ان کے پاس ہی رہیں۔ ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو لاہور میں فوت ہوئیں اور باغبانپورہ قبرستان میں دفن ہوئیں۔ (۷)

کریم بی بی کی چھوٹی بہن شہزادہ بیگم کی نند محترمہ بلقیس عابد علی لکھتی ہیں۔

"اماں مرحوم بہت سیدھی سادھی اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کی زبانی میں نے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی تھی۔ علامہ کی دوسری بیویوں کا جب ذکر کرتیں تو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس تغافل کے جو علامہ نے ان کیساتھ برتا تھا، اماں کے دل میں ان کی بڑی محبت موجود تھی..... جب علامہ نے وفات پائی تو اماں کی دلی محبت ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور وہ فوراً لاہور پہنچیں اور تجہیزو تکفین کی رسومات میں شریک ہوئیں"۔ (۸)

بقول یزدانی جالندھری،

دیکھو ہمیں کہ ہم نے ابھارے ہیں آفتاب
دیکھو ہمیں کہ خاک میں ہم ہیں ملے ہوئے

مکتوب کریم بی بی بنام خواجہ فیروز الدین:۔

کریم بی بی نے یہ خط میانوالی سے (جہاں ان دنوں ڈاکٹر عطا محمد تعینات تھے) اپنی بیٹی معراج بیگم سے لکھوایا۔ ڈاکٹر صاحب ۶ جون ۱۹۰۷ء سے یکم دسمبر ۱۹۱۲ء تک میانوالی میں رہے۔ جب یہ خط لکھا گیا تب خواجہ خورشید انور بھی تھے، جو ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ یہ خط ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ اس میں شہزادہ بیگم، فاطمہ اور حمیدہ کا ذکر ہے، یہ تینوں کریم بی بی کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ خواجہ فیروز الدین، فاطمہ بی بی کے شوہر اور خورشید انور ان کے

بیٹے کا نام ہے۔ ذیل میں یہ خط نقل کیا جاتا ہے۔(۹)

آز میانوالی

برادر عزیز فیروز الدین ۔ خدا تمہاری عمر میں برکت دے

کل تمہارا خط ملا۔ تمہاری خیریت پڑھ کر از حد خوشی ہوئی۔ جناب چچا صاحب کی خیریت پڑھ کر از حد خوشی ہوئی۔ خدا آئندہ بھی اپنا رحم کرے۔ عزیز معراج کو اب کچھ آرام ہے۔ امید ہے کچھ دنوں تک زخم بالکل اچھا ہو جائے گا۔(۱۰)

آج گھر سے شہزادہ بیگم کا خط آیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تم عید سے پہلے گھر آ جاؤ۔ والد صاحب کا بھی یہی ارادہ ہے مگر ہمارا ارادہ والد صاحب کے ساتھ ہی جانے کا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد والد صاحب کو کھانے وغیرہ کی تکلیف ہو گی۔ آگے جیسے والد صاحب کی مرضی!

ہمارا سب کا دل تمہارے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے اس لیے مہربانی کر کے تم اپنی تصویر عزیز خورشید انور کو گود میں لے کر کھنچوا کر بھیجو۔ تمہاری نہایت مہربانی ہو گی۔ تصویروں کی دو کاپیاں بھیجنا کیونکہ ایک کاپی میں اپنے پاس رکھوں گی دوسری حمیدہ کے لیے۔ مہربانی کر کے تصویریں ضروری بھیجنی۔ تاکید ہے کیونکہ انور کی پیاری صورت دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔

تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ آفتاب کے ابا باہر بالکل نہیں نکلتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی چلہ مانا ہوا ہو گا۔ اب وہ اپنی مراد لے کر باہر نکلیں گے۔ باقی خیریت ہے' میری طرف سے اور معراج کی طرف سے اور حمیدہ کی طرف سے تم کو اور عزیزہ فاطمہ کو سلام پیار۔ والد صاحب کی طرف سے تم کو اور سب بچوں کو پیار اور سب بزرگوں کو آداب۔ خورشید انور کی گود میں لے کر خوب پیار کرنا۔

راقم تمہاری بہن کریم بی بی

معراج بیگم

اقبال کی سب سے پہلی اولاد، معراج بیگم ۱۸۹۶ء (۱۱) میں گجرات یا پنڈ داون خاں (جہاں انکے نانا ان دنوں میڈیکل آفیسر تھے) میں پیدا ہوئیں (۱۲)۔ بچپن کچھ ننھیال میں گزرا اور کچھ ددھیال میں۔ یوں انہیں نانا، نانی، دادا، دادی سب کی محبتیں ملیں۔ معراج بیگم کو علامہ بہت چاہتے تھے اور خود ہی انکا نام رکھا تھا۔ (۱۳) اقبال کہا کرتے تھے:۔ "یہ بچی میری اولاد میں سب سے ذہین ہو گی"۔ شیخ نور محمد کہا کرتے تھے۔ "یہ لڑکی جس گھر جائے گی، اس میں روشنی کا باعث ہو گی"۔

معراج بیگم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی مگر گلے کے خنازیر کی بیماری کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ ان دنوں اس بیماری کا کوئی حتمی علاج نہ تھا۔ متاثرہ غدود آپریشن کر کے نکال دیتے تھے۔ معراج کے نانا، ڈاکٹر عطا محمد نے خود گیارہ مرتبہ آپریشن کیا، (۱۴) مگر غدود پھر بڑھ جاتے تھے۔ اقبال نے خود بھی بچی کے علاج کے لیے تدابیر کیں۔ علی بخش کا بیان ہے۔

> "ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی معراج بیگم جب بیمار ہوئیں تو بہت علاج کرائے گئے صاحبزادی کو خنازیر کا مرض تھا۔ ہمارے ہوشیار پور میں ایک ان پڑھ حکیم تھا عمر بہت ہو چکی تھی، ہم اسے "بابا" کہتے تھے، وہ خنازیر کے علاج کا ماہر تھا میں اسے بھی ایک مرتبہ ہوشیار پور سے لایا تھا اور صاحبزادی کو دکھایا تھا پھر اس سے دوائیں بھی لایا تھا"۔ (۱۵)

معراج بیگم اپنی عمر سے زیادہ فہم و فراست کی مالک تھیں۔ اللہ تعالی نے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے نوازا تھا۔ معراج بیگم کے دل و دماغ میں اپنے ننھیال کی امارت و بڑائی کا بالکل غرور نہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سب کو بہت عزیز تھیں۔ والد اور والدہ کے درمیان کشیدگی پر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں۔ مگر بے بس تھیں۔ وہ حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے والد کے مقام و مرتبے سے واقف تھیں اور دونوں کے تعلقات کی کشیدگی میں والدہ کو زیادہ قصور وار ٹھہراتی تھیں۔ آپنے ایک خط میں اپنے خالو خواجہ فیروزالدین کو جو لاہور میں رہتے تھے، لکھتی ہیں۔

> "مہربانی کر کے آپ جب خط لکھا کریں تو ابا جان کی کوئی بات خواہ اچھی ہو خواہ بری ہو بالکل نہ لکھا کریں۔ کیونکہ والدہ صاحبہ کی زبان پھر قابو میں نہیں

رہتی۔ جو کچھ آتا ہے گت بنائے رکھتی ہے اور ان کو ہر وقت بد زبانی سے یاد کرتی ہے"۔ (۱۶)

معراج بیگم کی عمر کے ساتھ ساتھ بیماری بھی بڑھتی رہی۔ آخر جب مایوسی کے دن قریب آگئے تو انہوں نے اپنے ددھیال جانے کا اصرار کیا چنانچہ کریم بی بی سیالکوٹ آگئیں جہاں سب معراج بیگم کو پسند کرتے تھے۔ یہاں بھی بہت علاج ہوا مگر بے سود! آخر اس موذی مرض نے جواں عمری ہی میں معراج بیگم کی زِندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا دِن معراج بیگم کے ننھیال اور ددھیال دونوں کے لیے ایک منحوس دِن تھا' جب یہ محبتوں کی معصوم پیامبر اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ معراج بیگم کی خواہش کے مطابق انہیں دادی جان کے پہلو میں اس جگہ دفن کیا گیا جو شیخ عطا محمد نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ (۱۷)

خواجہ فیروزالدین لکھتے ہیں (۱۸)

"ڈاکٹر صاحب کی پہلی اولاد ایک بیٹی تھی جو آفتاب اِقبال سے بڑی تھی۔ اسکا نام معراج بیگم تھا۔ خدا نے اسے سیرت و صورت دونوں سے ایسا نوازا تھا کہ ہزاروں میں فرد تھی"۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ بچوں کو لے کر گجرات چلی گئی تھیں وہاں بچی بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو بے حد خیال تھا کہ بچے اور ان کی والدہ اِن کے پاس رہیں تا کہ بچی کا پورا علاج ہو سکے۔ انہیں یہ خیال بھی تھا کہ میری بچی بہت عقل مند ہے وہ اپنی والدہ کو ضرور راضی کر سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور بچی گجرات میں فوت ہو گئی۔"

اس بیان پر غور ضروری ہے کیونکہ

☆ معراج بیگم کی بیماری اچانک پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ بچپن سے چلی آ رہی تھی۔

☆ اِقبال کب کریم بی بی کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا یہ فقرہ ملاحظہ ہو۔

میں اسکی کفالت کرنے کو تیار ہوں لیکن اسے اَپنے ساتھ رکھ کر اپنی زِندگی کو اجیرن بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں"۔ (۱۹)

☆ ان سے بہتر علاج معراج کے نانا خود کر سکتے تھے۔ جو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار تھے۔

☆ بیمار بچی والدہ کو کیا راضی کرتی جب علیحدگی کا خیال خود اِقبال کا تھا۔

☆ بچی گجرات میں نہیں' سیالکوٹ میں فوت ہوئی۔

آفتاب اقبال

اِقبال کے خلفِ اکبر' آفتاب اِقبال ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو پنڈدادن خاں میں پیدا ہوئے جہاں اِن کے نانا ڈاکٹر عطا محمد اِن دنوں تعینات تھے۔ آفتاب کی پیدائش اِقبال' شیخ نور محمد اور امام بی کے لیے خاص طور پر مسرت کا باعث تھی کیونکہ وہ اِقبال کی پہلی نرینہ اولاد تھے۔ شیخ نور محمد نے ان کا نام "آفتاب احمد" رکھا۔ بچپن کا زمانہ زیادہ تر ننھیال میں گزرا' آفتاب دادا' دادی کے منظور نظر تھے اور انہیں دادا کے قریب رہنے کا زیادہ موقع ملا۔ گو اِقبال سے ملاقات کم ہوتی تھی لیکن وہ اِن سے محبت کرتے تھے۔ میر غلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶۔۱۹۵۲ء) ۱۹۰۱ء کے قریب اِقبال سے ملنے سیالکوٹ گئے تو اِقبال نے آفتاب کا تعارف کراتے ہو کہا "ایہ آفتاب وانگوں سحر خیزاے"۔ (۲۰)

آفتاب ذرا بڑے ہوئے تو انہیں سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کروا دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں اِقبال نے انہیں سکاچ مشن سے اٹھا کر تعلیم الاسلام سکول قادیان میں داخل کروا دیا (۲۱) مگر مولوی نورالدین کی وفات پر وہاں سے بھی اٹھوا لیا (۲۲) ۱۹۱۶ء میں آفتاب نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اس زمانہ میں انہیں درویش منش دادا کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا بھرپور موقع ملا۔ لکھتے ہیں۔

"میرے والدین نے میری پرورش کی۔ دادا' دادی اور نانا' نانی نے مجھے تربیت دی۔ میں اَپنے عظیم باپ علامہ ڈاکٹر سر محمد اِقبال کا پہلا بڑا بیٹا ہوں اور اس لحاظ سے میں اَپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے اَپنے باپ اور اَپنے دادا کی صحبت میں رہنے کا زریں موقع اِن کی اولاد میں سے سب سے زیادہ حاصل ہوا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ میں ہی علامہ اِقبال کا واحد بیٹا اور شیخ نور محمد صاحب کا واحد پوتا ہوں جس نے عہدِ طفلی سے لے کر سن شعور تک اَپنے دادا کے اخلاق و کردار اور تعلیم و تربیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور صرف میں ہی علامہ اِقبال کی واحد اولاد ہوں جس نے علامہ کے اُستاد شمس العلماء مولوی صوفی میر حسن صاحب سے پند نامہ فریدالدین عطار وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور ان جیسے سراپا زہد و تقویٰ بزرگ کی زِندگی کے پاکیزہ و سادہ پروگرام کے مطالعہ سے سرفراز ہوا"۔ (۲۳)

میٹرک کے بعد آفتاب نے سینٹ سٹیفنز کالج دہلی میں داخلہ لیا۔ یہ کالج اس وقت ہندوستان بھر میں اَپنے فاضل اساتذہ مسٹر این۔ کے۔ سین' مسٹر بی۔ این مکرجی اور سی۔ ایف' اینڈریو کی وجہ

سے مشہور تھا۔ مسٹراین کے سین اِقبال کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی بنا پر اِقبال نے اس کالج کا اِنتخاب کیا۔

اِقبال اور والدہ آفتاب میں کشیدگی کی ابتداء (۱۹۰۹ء) کے وقت آفتاب ابھی بچہ تھے۔ جب اِقبال نے دوسری اور پھر تیسری شادی کی تو آفتاب سنِ شعور کو پہنچ رہے تھے۔ ایسی صورتِ حالات میں ان کی ہمدردیاں قدرتی طور پر ماں کیساتھ تھیں۔ مگر مجموعی طور پر باپ بیٹے کے باہمی تعلقات ۱۹۱۷ء تک نارمل دکھائی دیتے تھے۔ ۷ مارچ ۱۹۱۷ء کو اِقبال مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں۔

"لڑکا (آفتاب) دہلی کالج میں پڑھتا ہے۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آجکل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرا دوں یا اس کی شادی کر دوں تاکہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

اسکی تصویر بھی اِنشاء اللہ حاضر ہوگی"۔ (۲۴)

۱۹۱۸ء میں آفتاب نے سینٹ سٹیفنز کالج سے ایف اے درجہ دوم میں پاس کیا۔ علامہ نے اِنہیں مشورہ دیا کہ مزید تعلیم کی بجائے نوکری کرلو (۲۵) مگر آفتاب نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ اور علامہ کو خط لکھا کہ ان کا ماہانہ خرچ ۳۵ روپے سے بڑھا کر ۵۰ روپے کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ مطالبہ کیا کہ دو سال کا خرچ ۱۲۰۰ روپے یکمشت دیا جائے۔ اس مطالبے کا علم جب سردار بیگم (اِقبال کی دوسری بیگم) کو ہوا تو اُنہوں نے شیخ نور محمد صاحب کو لکھا کہ ان کا زیور فروخت کر کے اس مطالبے کو پورا کر دیا جائے۔ شیخ صاحب نے سردار بیگم کے نام جو خط لکھا اس کا علم جب علامہ کو ہوا تو اُنہوں نے اپنے والد محترم کو جواباً لکھا:۔ (۲۶)

لاہور: ۹ جون ۱۹۱۸ء

قبلہ و کعبہ من اَلسلام علیکم:۔

آپ کا خط جو اعجاز کی چچی کے نام آیا ہے میں نے دیکھا ہے اور اس نے اس خط کا مضمون بھی مجھے سنایا ہے جو اس نے آپکی خدمت میں تحریر کیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے مگر یہ بات اِنصاف سے بعید ہے کہ میں اس کا زیور لیکر ایک ایسے لڑکے کی تعلیم پر صرف کروں جس سے نہ اسے کچھ توقع ہو سکتی ہے نہ مجھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا زیور اس خیال سے نہیں دیتی کہ کل کو اسے اس کا معاوضہ ملے گا

بلکہ وہ محض اس غرض سے دیتی ہے کہ مجھ پر کوئی شخص حرف گیری نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص مجھ پر حرف گیری کرے تو اسکا مطلب صرف اسقدر ہے کہ وہ شخص مجھ سے ناخوش ہے۔ برخلاف اس کے ناانصافی میں خدا اور رسول کی ناخوشی ہے جسکا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔ میں اور لوگوں کی حرف گیری آسانی سے برداشت کر سکتا ہوں، خدا اور رسول کی ناراضگی سے میرا دل کانپتا ہے۔

آپکو معلوم ہے کہ گذشتہ دس سالوں کے عرصے میں بیس پچیس ہزار میرے ہاتھوں میں آیا ہے۔ مگر یہ سب اپنے اپنے موقع پر مناسب طور پر خرچ ہوا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ تاہم اس وقت تک میں ایک عمدہ مکان کرائے پر نہیں لے سکا نہ مکان کے لیے فرنیچر اور سازو سامان خرید سکا ہوں۔ نہ عمدہ گھوڑا گاڑی خرید سکا ہوں۔ یہ سب لوازمات اس پیشے کے ہیں۔ اب میں نے تہیہ کیا ہے کہ جسطرح ہو سکے یہ لوازمات بہم پہنچائے جائیں۔ اب حالات اس قسم کے ہو گئے ہیں کہ ان کا بہم پہنچانا لازم اور ضروری ہے۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر فضل کرے تو اپنی نظم و نثر سے کوئی مالی فائدہ نہ اٹھاؤں گا کہ یہ ایک خداداد قوت ہے جس میں میری محنت کو دخل نہیں۔ خلق اللہ کی خدمت میں اسے صرف ہونا چاہیے مگر ضروریات سے مجبور ہو کر مجھے اس عہد کے خلاف کرنا پڑا۔

باقی رہے وہ لوگ جو مجھ سے للعہ (روپے) چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اسے احسان نہیں جانتے بلکہ قرض تصور کرتے ہیں۔ میں نے ۳۵ روپے ماہوار اس کمبخت لڑکے کو دیے تھے اور کالج کے لڑکوں سے اخراجات کے متعلق دریافت کر کے یہ رقم مقرر کی تھی مگر آجتک ہر شخص کے پاس یہی رونا رویا جاتا ہے کہ خرچ ناکافی ملتا ہے۔ ان کو للعہ دینا نہ دینا برابر ہے۔ شیخ گلاب دین صاحب کو بھی اس نے خط لکھا تھا۔ مگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ حالات مجھے معلوم ہیں اس واسطے میں ڈاکٹر صاحب سے اس بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ گذشتہ سالوں میں بھی وہ لوگ اپنی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئے۔ اگر آپ کے پاس ان کا بیان کروں تو آپ کو سخت تکلیف ہو گی۔ لہٰذا میں اس تکلیف دہ داستان کو نظر انداز کرتا ہوں۔"

مگر باوجود ان تمام باتوں کے میں للعہ دیتا مگر اس وقت مشکلات کا سامنا ہے۔ جنگ کی وجہ سے آمدنیاں قلیل ہو گئی ہیں اور یہ شکایت کچھ مجھی کو نہیں اوروں کو بھی ہے اور وہ پچاس روپیہ اس طرح مانگتے ہیں جیسے میں مقروض ہوں اور وہ قرض خواہ۔

میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں ملازمت کرکے اور کچھ کمانے کے قابل ہو جائے

کہ بی۔اے کے امتحان کی اب وہ وقعت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ میں نے تجربے سے دیکھا ہے کہ جو لڑکے انٹرنس یا ایف اے پاس کر کے ملازمت کرتے ہیں وہ بی۔اے ' ایم۔اے کرنے والوں سے بہتر رہتے ہیں۔ مگر اس نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا اور کالج میں داخل ہونے کے لیے دہلی چلا گیا۔ پھر بھی مجھے کچھ اعتراض نہیں۔

آپ نے جو کچھ اسے خط میں لکھا ہے ' بالکل ٹھیک ہے یہی بات میرے دِل میں بھی تھی۔ اور یہ اس کے خط کا بہترین جواب ہے۔ بہتر ہے اس کی والدہ اپنے نقرئی و طلائی سرمائے اس کی تعلیم پر خرچ کرے۔ کم اَز کم اس کا وہ حصہ خرچ کر دے جو اس نے میرے ماں باپ سے لیا ہے۔ آپنے ماں باپ کا خرچ نہ کرے اور اگر کچھ عرصے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آگیا تو میں اسے یکمشت بارہ سو روپیہ دے دونگا۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ اپنی خیریت سے اطلاع دیں۔

محمد اِقبال۔ لاہور

یہی وہ دور تھا جب باپ بیٹا کے درمیان اختلافات اور شکوے شکایتوں کی خلیج بڑھنا شروع ہوئی اور راستے جدا ہونے کا آغاز ہوا۔ آفتاب اپنی کم سنی اور نادانی کے ہاتھوں کوتاہیوں کے مرتکب ہوتے رہے اور اِقبال کے دِل میں ان کی جگہ کم ہوتی گئی۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اِقبال نے آپنے والد کے نام خط میں لکھا:۔ (۲۷)

"مجھے تو دہلی سے کبھی کوئی خط نہیں آیا اور نہ کسی پروفیسر نے مجھے اس کی بابت لکھا ہے۔ نہ مجھے یہ معلوم کہ وہ کم بخت دہلی سے مالیر کوٹلہ گیا یا نہ گیا۔ میں نے سنا تھا کہ حافظ صاحب ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے ہیں (۲۸) اور اب گجرات میں ہیں مگر یقیناً یہ خبر بھی معلوم نہیں۔ میرے خیال میں آپ اسے خط لکھیں اور تسلی دیویں کہ بیماری سے گھبرانا نہ چاہیے اور نہ موت سے ڈرنا چاہیے اور یہ شاید یہ اس کے لیے بہتر ہو کہ آپنے علاج کے لیے چند روز کے لیے گجرات چلا جائے ' اچھا ہو جائے تو پھر کالج میں چلا جائے۔ باقی رہا قصور اس کا یا اسکی والدہ کا ' سو میرے نزدیک کسی کا نہیں۔ امرالٰہی ہر طرح ہو جاتا ہے۔

اس کم بخت کو دوسرا موقع اپنی اصلاح کا مل گیا تھا۔ بھائی صاحب نے اس کا قصور معاف کر دیا اور اسی پہلے برتاؤ کا اس سے آغاز بھی کر دیا تھا۔ کم بخت نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا اور میں نے سنا ہے کہ ہمشیرہ کریم بی بی کو اس نے بہت دِل آزار باتیں کہیں۔ کیا عجب اس کی موجودہ مصیبت اسی کی بد دعا کا نتیجہ ہو۔ میری رائے میں کریم بی بی سے اسے معافی مانگنی چاہیے اور خدا کے حضور

میں توبہ کرنی چاہیے۔"

ذہنی اور معاشی پریشانیوں کے اس دور (۱۹۲۰ء) میں آفتاب نے بی۔اے کا امتحان فلاسفی میں آنرز اور معاشیات (اختیاری مضمون) کیساتھ درجہ اول میں پاس کر لیا۔ ۱۹۲۱ء کے آغاز میں آفتاب کو ان کے نانا 'ماموں اور والدہ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان بھیجا۔ اقبال نے چونکہ ایف اے کے بعد آفتاب کی تعلیم میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا اس لیے انہیں اس کی اطلاع نہیں تھی۔ اقبال بڑے بھائی کے نام خط محررہ ۱۰' مارچ ۱۹۲۱ء میں لکھتے ہیں:۔

"اس مردود نے مجھے تو خط لکھنے کی جرأت نہیں کی نہ معلوم والد مکرم کو کیوں خط لکھا ہم کو تو اس کے ولایت جانے کی بھی اطلاع نہیں۔ حافظ صاحب کو اطلاع ہو گی یا انہوں نے اسے خرچ اخراجات کا یقین دلایا ہو گا۔ آجکل تو ولایت اسی کو جانا چاہیے جس کے پاس بالکل فضول روپیہ ہو۔ جو طریق اس نے اختیار کیا ہے وہ نیا نہیں ہے بلکہ اس کی پرانی چال ہے اور جو بیماری اسے ہے وہ بھی اسکی بداعمالی اور بے باکی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے متعلق زیادہ کیا لکھوں"۔ (۲۸)

کچھ عرصے بعد شیخ عطا محمد (نانا) نے محسوس کیا کہ آفتاب کے اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں اور وہ فضول خرچی اور دروغ گوئی کی طرف راغب ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی آپنے روپے میں کچھ سختی پیدا کی کیونکہ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے اور آمدنی محدود تھی۔ انہوں نے آفتاب کو سرزنش کی اور والد کے ساتھ بدسلوکی پر برا بھلا کہا۔ نیز اخراجات کے لیے رقم بطور قرض حسنہ اور ایک ایگریمنٹ کے تحت دینے کی شرط عاید کی۔ جواب میں آفتاب احمد نے جو اب آفتاب اقبال بن چکے تھے (۲۹) آپنے نانا کو لکھا:۔

"میرا سب سے بڑا جرم جو میں نے والد کے خلاف کیا ہے وہ یہ ہے کہ آج تک میں نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا ہے۔ اگر آپ اس کو طوطا چشمی سمجھتے ہیں تو میں طوطا چشم تھا اور بڑے بھاری جرم کا مرتکب ہوا۔ میرا جہاں تک خیال ہے والد صاحب کیساتھ میری کشمکش کا باعث میری والدہ ہوئی ہے ورنہ میں نے ایسا کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے مجھے گھر سے نکال دیا گیا۔ سیالکوٹ میں تایا جان نے ایک دفعہ صاف یہ کہہ دیا تھا کہ آفتاب کا جرم یہ ہے کہ اس نے مجرم کا ساتھ دیا ہے۔ مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ مجھے اس پاداش پر مجرم ٹھہرائیں گے۔ کیونکہ جو کچھ میں نے کیا ہے وہ میں نے والدہ کی طرفداری میں کیا ہے۔ والد کو معلوم تھا کہ اسکا سلوک ایک نہ ایک دن رنگ لائے گا۔ وہ مجھ سے بھلائی کی توقع کس طرح رکھ سکتا تھا' جب اسکو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اس نے میری والدہ اور میرے

ساتھ اِنصاف کا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ آپ بھی اس معاملے میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے اور الٹا مجھے مجرم ٹھہرائیں گے۔ میں نہیں سمجھتا آپ نے خط میں اس قدر غصے کا اظہار کیوں کیا ہے۔ آپ سے تو میں صرف قرضِ حسنہ کا خواستگار ہوا تھا اور میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ میں ایگریمنٹ بھیجنے کو تیار ہوں۔ مجھے رنج اس لیے نہیں ہوا کہ آپ مجھے روپیہ بطور قرض دے رہے ہیں۔ میں نے آپ سے روپیہ بطور اِنعام یا گفٹ تو مانگا ہی نہیں تھا۔ مجھے حیرانی صرف اس بات پر ہوئی کہ قانونی ایگریمنٹ کی کوئی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیپٹن فاروقی نے مجھ سے کوئی ایگریمنٹ نہیں لکھوایا بلکہ جب میں نے اسکو اس بارے میں لکھا تھا تو اس نے جواب دیا کہ تم پر اخلاقی قرض ہو گا کہ تم اسکو ادا کرو۔ اگر میں قرضے کو ادا نہ کروں تو میں واقعی Black guard ہوں گا۔ خیر یہ کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو ایگریمنٹ دینے کو تیار ہوں مگر آپ لکھتے ہیں کہ میں روپیہ ادا نہ کر سکوں گا' کیوں کہ میں فضول خرچ ہوں۔ اب اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔ آپ خود ہی بتایئے جولائی کا مہینہ ختم ہونے کو آیا ہے اور میں نے کچھ فیس تو مس بک سے قرضہ لیکر ادا کی ہے اور کچھ اگست کے آخر تک کرنی ہے اور ابھی تک مس بک کو کوئی روپیہ نہیں پہنچا۔

میری حالت جو آجکل ہے وہ خدا جانتا ہے۔ ایک منٹ بھی خوشی کا نصیب نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھے قرضہ دے سکتے ہیں تو خدا کے لیے روپیہ روانہ کر دیجئے۔ اگر آپ نہیں دے سکتے تو مجھے بذریعہ تار اطلاع دیجئے تاکہ میں کوئی پیٹ پالنے کی صورت اختیار کروں۔ ساری عمر تو والدہ کی طرفداری میں ذلتیں اٹھائیں۔ آپ اس کی بھی قدر نہیں کرتے۔ اس طرف سے تو جواب مل ہی چکا ہے اگر آپ بھی وہی جواب دیتے ہیں تو خیر جو خدا کو منظور ہو گا ہو جائے گا۔ اگر میں بجائے والدہ کے والد کا ساتھ دیتا تو شاید مجھے اتنی مصیبتیں آج برداشت نہ کرنی پڑتیں مگر یہ میرے ضمیر کے خلاف تھا" (۳۰)۔ جولائی ۱۹۲۲ء

یہ دور آفتاب کے لیے ہر لحاظ سے کٹھن اور صبر آزما تھا۔ اِن مشکل ایام میں اِن کے جواں سال ماموں ڈاکٹر غلام محمد ۲۱ مئی ۱۹۲۱ء کو اِنتقال کر گئے اور ۱۴ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اِن کے نانا کا رہا سہا سہارا بھی اجل چھین کر لے گئی۔ اور آفتاب بے رحمیٔ حالات کا پہلے سے زیادہ شکار ہو گیا۔ مگر اس کے قدم رکے نہیں' وہ جیسے تیسے قدم بڑھاتا رہا۔

اِقبال کی طرح آفتاب کو جہاں مولوی میر حسن سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا' وہاں لندن میں وہ مس ایما جیسی بک (Miss Emmajassy Beck) کی مشفقانہ سرپرستی سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ یہ وہی مس بک تھیں جو سرزمین لندن میں ہر ہندوستانی طالب علم کے لیے ایک شفیق ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ اِقبال سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا اور عطیہ فیضی

سے اقبال کی پہلی ملاقات مس بک کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔ آفتاب لکھتے ہیں۔

"۱۹۲۱ء میں جب میں لندن گیا تو مس بک نے میرے تعلیمی معاملات میں بڑی دلچسپی لی اور میرے نانا خان بہادر حاجی حافظ عطا محمد صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو انہوں نے مستقل طور پر میرے گارجین اور سرپرست کی حیثیت اختیار فرمائی۔ دس سال کی طویل مدت تک مجھے ان کے سایہ عاطفت میں رہنے کی عزت حاصل رہی۔ اس عرصہ میں روزانہ شام کی چائے ان کے ساتھ پینا میرا معمول تھا۔ از راہ فرط محبت میری عادت و خصلت اور علمی قابلیت کی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے تعریف فرماتی تھیں میرے بہترین مستقبل کے بارے میں بڑی ہی پر امید تھیں۔ میرے قیام انگلستان کے دوران بڑی بڑی شخصیتوں سے میرا تعارف کرایا۔ مسٹر بالڈون وزیر اعظم انگلستان سے مجھے ملایا۔ مسٹر ریمزے میکڈونلڈ وزیر اعظم لیبر گورنمنٹ سے میری ملاقات کرائی نیز مسٹر آئزک فٹ' مسٹر ویڈووڈبین اور سر فرانسس ینگ ہزبینڈ اور ہزہائی نس دی آغا خان سے اور بہت سے لارڈز اور ممبران پارلیمنٹ سے مجھے خاص طور پر ملایا اور بڑے تعریفی الفاظ کے ساتھ مجھے روشناس کرایا۔" (۳۱)

جولائی ۱۹۲۲ء میں آفتاب نے لندن یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی۔اے (آنرز) اور ستمبر ۱۹۲۴ء میں ایم۔اے فلسفہ کا امتحان پاس کر لیا۔ ایم اے کے لئے ان کے مقالہ کے نگران کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیویز ہکس (Dawes Hicks) تھے اور عنوان تھا "قبل کانٹی اور کانٹی فلسفہ میں تصور عرفان ذات"

(" The concept of Self-Consciousness in pre-Kantian and Kantian Philosophy")

نومبر ۱۹۲۴ء میں وطن واپس آگئے اور جون ۱۹۲۶ء تک انڈین ایجوکیشن سروس میں ملازمت کے لیے تگ و دو میں کرتے رہے مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور لندن لوٹ گئے۔ وہاں لندن یونیورسٹی کے مدرسہ علوم شرقیہ (Schoolfororientalstudies) میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک کام کرتے رہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ لنکنز ان (Lincon's Inn) میں قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے اور ۱۹۲۹ء میں بار ایٹ لاء کے تمام مراحل کامیابی سے طے کر لیے مگر مالی مشکلات کی وجہ سے ۱۵۰ پونڈز کی فیس ادا نہ کر پائے اور سند حاصل نہ ہو سکی۔

اس دوران آفتاب اقبال نے لندن کے مدرسہ اقتصادیات سے اکنامکس اور پالیٹکس میں بھی لیکچرز کا ایک کورس مکمل کیا۔ جہاں انہیں مسٹر ہیرالڈ لاسکی' مسٹر گریگوری' مسٹر سرل اے سکوتھ' مسٹر ڈیویز ہکس' ڈاکٹر

اسپیرمین اور پروفیسر ڈالٹن سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔
۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہوئی۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں انڈین ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اسٹرینڈ پیلس لندن میں کانفرنس کے شرکاء کو "ایٹ ہوم" دیا گیا جسکی صدارت مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے کی۔ آفتاب نے صدرِ استقبالیہ کی حیثیت سے ہندوستان کی حمایت میں ایک زبردست تقریر کی جو لندن کے تمام اخباروں میں شائع ہوئی اور ایک تہلکہ مچ گیا۔ مہمانوں کی طرف سے سر محمد شفیع نے تقریر کا جواب دیا۔ تقریر سننے والوں میں سر اَکبر حیدری اور سر ایڈورڈ میکلیگن (گورنر پنجاب، جنھوں نے اِقبال کے لیے نائٹ ہڈ کی سفارش کی تھی) بھی شامل تھے۔ جلسے کے اختتام پر سر میکلیگن نے آفتاب کو بہت شاباش دی۔ سر اَکبر حیدری بھی آفتاب کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ آفتاب نے اُنہیں ملازمت حاصل کرنے میں دشواری کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ سر اَکبر حیدری نے لندن سے یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو فخریار جنگ فخرالدین کو ایک سفارشی خط لکھ کر آفتاب کو دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ یا کسی دوسری جگہ کوئی مناسب اسامی دِلانے میں مدد کرنے کو کہا۔ سر اَکبر حیدر نے اس خط میں لکھا۔ (۳۲)

"I have seen Mr. Aftab Iqbal and he impressed me very favourably. He spoke exceedingly well at gathering at which Col. Patterson, the political A.D.C to Secretary of state and several others were present. I should like you very much to kindly help him in the University with regard to examinership and translations. I have written in similar terms to Fazal Mohammad Khan and I hope you two together will be able to do something to help this youngman who I think will be an asset to community latter on."

اِن دِنوں حیدر آباد دکن کا ایک سرکاری وفد لندن پہنچا۔ اور اسکا ایک اجلاس الیگزینڈر ہوٹل، ہائیڈپارک لندن میں ۱۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ سر اَکبر حیدری بھی شامل تھے۔ آفتاب نے ان سے اپنی مشکلات کا ذِکر کیا۔ وہ اِقبال کے دوست بھی تھے اور چند روز بیشتر آفتاب کی تقریر سے بھی متاثر ہو چکے تھے، چنانچہ اُنہوں نے وفد کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا اور آفتاب کے لیے ایک سو نوے پونڈ کی رقم بطور قرض حسنہ حاصل کی۔ آفتاب نے اس رقم سے فیس ادا کرکے بارایٹ لاء کی سند حاصل کی۔ (۳۳)
وطن واپسی پر حیدر آباد کے وفد نے یہ مسئلہ ریاستی کونسل کے سامنے رکھا۔ یہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد، مدارالمہام موجود تھے جو اِقبال کے گہرے دوست اور عقیدتمند تھے۔ اُنہوں نے

یہ قرض معاف کر کے اسے عطیہ قرار دے دیا۔(۳۴)

مارچ ۱۹۳۱ء میں آفتاب اِقبال وطن واپس آ گئے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کو اُنہوں نے ٹِنلز ہوٹل لاہور سے ایک خط سر اکبر حیدری کو لکھا اور اپنی مالی مشکلات اور والد کے عدم التفات کا شکوہ کرتے ہوئے اُنہیں لکھا کہ وہ اِقبال کو اِن کی مالی امداد پر آمادہ کریں چنانچہ سر اکبر حیدری (۱۸۶۹ء-۱۹۴۲ء) نے اِقبال کو لکھا:۔

"میں ایک نہایت نازک معاملے کے بارے میں آپ کو لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں آپ کے صاحبزادے آفتاب اِقبال نے لندن میں مجھ سے مدد کی درخواست کی اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی ناداری وہاں کی مسلمان برادری میں اکثر زیرِ بحث رہتی تھی۔ اس کی حالت پر تو مجھے بہت ترس آیا ہی تھا مگر میں اس الزام پر زیادہ دکھ محسوس کرتا ہوں جو لوگ اس شخصیت پر لگاتے ہیں جسے میں ہمیشہ ایک عظیم اِنسان اور ایک عظیم مسلمان سمجھتا ہوں۔ آپنے بیٹے سے خفگی کی وجوہ مجھے معلوم نہیں مگر میں یہ کہنے کہ جرأت کرتا ہوں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس کی بحالی پر غور کریں اور اس وقت تک اس کی مدد کریں جب تک وہ آپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ یقین فرمایئے کہ محض گہرے دوستانہ جذبے نے ہی مجھے یہ عریضہ پیش کرنے کی ہمت دِلائی ہے۔" (۳۵)

اِقبال نے ۲ مئی ۱۹۳۱ء کو اس خط کا جواب دیا۔

"میں آپ کے گرامی نامے کے لیے بے حد سپاس گزار ہوں جو ابھی مجھے ملا ہے۔ یہ داستان اتنی طویل اور اذیت دہ ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ کو تمام حقائق کا علم ہوتا تو آپ کو اس کی طرف سے لکھنے میں مشکل پیش آتی۔ میں نے دہلی میں دانستہ آپ سے ملنے سے گریز کیا مبادا وہ ہماری گفتگو کا موضوع بن جائے اور وقتی طور پر میرا سکون قلب غارت ہو جائے۔ میرے اور میرے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اس کے نامناسب رویے کے باوجود میں آپنے وسائل سے بڑھ کر اس کی مدد کرتا رہا ہوں۔ کوئی باپ ان بیہودہ خطوط کو پڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا جو اس نے ہمیں لکھے۔ اور جو کچھ وہ اب کر رہا ہے وہ اسی بلیک میلنگ سکیم کا حصہ ہے جو وہ کچھ عرصے سے اختیار کیے ہوئے ہے۔ بہرحال اب میرے لیے اسکی مدد کرنا ممکن نہیں۔ میں بوڑھا آدمی ہوں میری صحت کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں سے

کچھ ملنے کی توقع بھی نہیں۔ مزید برآں دو چھوٹے بچوں کی پرورش میرے ذمہ ہے۔ اگر میں صاحبِ ثروت ہوتا تو ممکن ہے کچھ کرتا اگرچہ وہ کسی چیز کا حقدار نہیں۔ میرے حالات کا اندازہ میرے سوا کسی کو نہیں۔ قدرت نے مجھے کچھ چیزوں سے نوازا ہے اور کچھ سے محروم رکھا ہے۔ میں اسی پر قانع ہوں اور میرے لب کسی حرفِ شکایت سے آشنا نہیں۔ آپ شاید پہلے آدمی ہیں جنہیں میں نے وہ کچھ لکھ دیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا۔ مجھے اپنے مصائب کی نمائش سے نفرت ہے۔ کیونکہ دُنیا بحیثیتِ مجموعی غیر ہمدرد ہے۔ سر اَکبر جیسی وسیع القلب اور ہمدرد فطرت کس کو ملی ہے؟ میں جانتا ہوں آپ نے اس کی مدد کچھ اس بنا پر کی کہ اس نے آپ کو متاثر کیا اور کچھ میری وجہ سے۔ آپکی فیاض فطرت اسکے برعکس کر بھی نہیں سکتی! لیکن اگر آپ اسے عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی مناسب جگہ دِلوا دیتے یہ عنایت میرے اور اس کے لیے زیادہ مفید ہوتی"۔ (۳۶)

اس خط کے جواب میں ۱۱ مئی ۱۹۳۱ء کو سر اَکبر حیدری نے سر اِقبال کے موقف کو تسلیم کیا اور اُنہیں یقین دِلایا کہ وہ آفتاب کی ملازمت کے لیے کوشش جاری رکھیں گے۔ اس خط کا جواب اِقبال نے ۱۴ مئی ۱۹۳۱ء کو دیا:۔ (۳۷)

"یہ نوجوان اب تک مبلغ ستر ہزار روپے اَپنے اوپر صرف کر چکا ہے۔ اس کے اَپنے بیان کے مطابق اس میں سے پچاس ہزار روپے اس نے اِنگلستان سے ادھار لیے ہیں میں نے اسکی والدہ کو دس ہزار روپے دیے جو سب اس نے اس پر صرف کر دیے۔ یہ رقم اس کے علاوہ ہے جو اسکی والدہ اور نانا نے اسے دی۔ اسکی ہندوستان آمد سے ایک یا دو ماہ پہلے مجھ سے مطالبہ کیا گیا کہ اسے دس ہزار روپے دے دوں اور اس کے یہاں پہنچنے کے کچھ روز بعد اِنگلستان میں اس کے قرض خواہوں میں ایک کا پہلا خط ملا۔ اس کے باوجود وہ آئے دِن بلیک میل کرنے کے لیے خط لکھتا رہتا ہے۔ میں چاہتا تھا اس کے آخری خط کی نقل آپ کو بھیج دوں مگر میں ایسا نہیں کر رہا۔ صرف اس لیے کہ کہیں آپ اس کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ ختم نہ کر دیں۔ فارسی کا مندرجہ ذیل شعر میری موجودہ قلبی کیفیت پر صادق آتا ہے'

آں جگر گوشہ ہماں شد کہ من اول گفتم
کہ چو شوید لبش آز شیر جگر خوارہ شود"

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک آفتاب اسلامیہ کالج کلکتہ میں انگریزی زبان و آدب کے پروفیسراور یونیورسٹی آف کلکتہ میں فلسفہ کے لیکچرر رہے۔ اس دوران بھی اُنھوں نے سر اَکبر حیدری سے رابطہ رکھا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو سر اَکبر حیدری کے نام لکھا:۔

"میرے والد کی معاشی حالت اچھی نہیں اور وہ کسی طرح بھی میری مدد کرنے کے قابل نہیں۔ مسلمانانِ ہند کی ترقی میں ان کا کچھ تو حصہ ہے اور یہاں ہر کسی کا خیال ہے کہ حیدر آباد ریاست کو اتنا تو کرنا چاہیے کہ ان کے بڑھاپے میں ایک معقول ماہانہ وظیفہ مقرر کر دے۔ انکی صحت روز بروز گر رہی ہے اور شاید وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکیں۔ نواب صاحب! کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ مستقبل کا مورخ جب میرے والد کی سوانح عمری لکھے تو یہ تحریر کرے کہ اِقبال اور اسکے بچے اس دور میں معاشی بدحالی کا شکار رہے جب سر حیدری' ریاست حیدر آباد میں اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے عروج پر تھے"۔ (۳۸)

اس کے جواب میں سر حیدری نے مناسب تدابیر کا وعدہ کیا۔ ۲ فروری ۱۹۳۷ء کو اِقبال نے لاہور سے سر اَکبر حیدری کو ایک خط لکھا جس پر اس سلسلے کے دوسرے تمام خطوط کی طرح پرائیویٹ اور کانفیڈنشل لکھا ہوا تھا اور ساتھ ایک اور خط بھی منسلک تھا جو اِقبال کو کسی گمنام شخص کی طرف سے ملا تھا۔ اِقبال نے لکھا

"میں اس عریضے کے ساتھ ایک خط آپ کو بھیج رہا ہوں جو رات ہی مجھے ڈاک کے ذریعے موصول ہوا۔ چونکہ لفافے کے اندر صرف یہی پرچہ تھا جو مجھے ملا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس نے بھیجا ہے۔ تاہم اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب نے آپ کو کوئی خط لکھا تھا جس کا یہ جواب ہے۔ میرا قیاس ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ لکھنے والا میرے لیے بالکل اجنبی ہے اور پچھلے کئی سالوں سے!

میرے لیے یہ بیان کرنا ممکن نہیں کہ وہ پچھلے چند برسوں میں مجھ سے کس طرح پیش آتا رہا ہے۔ تاہم اس خط کا مقصد آپ کو اس نوجوان سے خبردار کرنا ہے جو میرے لیے ایک مستقل آزار کا باعث ہے۔ میں اسے آپکو' یا میرے اور دوستوں کو بدنیتی پر مبنی خط لکھنے سے تو باز نہیں رکھ سکتا لیکن آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آپنے اور میرے تعلقات میں کسی قدر مصالحت کا تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے جو اب قطعی ناممکن ہے اور اسکا

واحد مقصد آپ سے کچھ نہ کچھ روپیہ بٹورنا ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ وہ اس سے بیشتر بھی آپ کی فیاض طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھا چکا ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ آپ آیندہ کے لیے خط لکھنے میں اسکی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے۔" (۳۹)

اس خط کے جواب میں سر اکبر حیدری نے ۱۲ فروری ۱۹۳۷ء کو اِقبال کو لکھا۔

"میرے لیے آپ کے اس عنایت نامہ کا جواب دینا آسان نہیں جس میں آپ نے مجھے خبردار کیا ہے۔ میں بے خبری میں آپ کو تکلیف دینے کا ذمہ دار ہوں۔ یقین کیجئے اگر مجھے پہلے سے ان ناخوشگوار حالات کا علم ہوتا جن کی آپ نے نشاندہی کی ہے تو بلاشبہ میں اس اپیل کو نظرانداز کر دیتا۔ میں آپ کے خبردار رہنے کے مشورے کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ اور پوری ہمدردی کے ساتھ اس امید کے اظہار کی جسارت کرتا ہوں کہ آیندہ آپ کے عظیم اور معزز نام سے ناجائز فائدہ اٹھانے والی ہر کوشش کو موثر طریقے سے روک دیا جائے گا۔" (۴۰)

آفتاب سنِ شعور سے ہی نامساعد حالات کا شکار رہے۔ ۱۹۳۷ء تک کی کہانی آپ نے پڑھ لی، مگر قدرت کے خزانے میں آفتاب کے لیے ابھی کچھ اور دکھ اور پریشانیاں تھیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء اس ہستی کا روزِ کوچ تھا جو آفتاب سے نالاں رہی اور یہ آفتاب کی کم نصیبی تھی کہ وہ اِقبال کے دِل میں اَپنے لیے کوئی مقام نہ بنا سکے۔ اِقبال نے اُنہیں گھر سے کیا نکالا، دِل سے ہی نکال دیا۔ وہ آفتاب سے کس قدر خفا تھے، اسکا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک غیر مصدقہ روایت کے مطابق اُنہوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ "اگر آفتاب اِن کے جنازے میں شریک ہوا تو انہیں روحانی اذیت پہنچے گی" (۴۱) چنانچہ جب آفتاب جاوید منزل گئے تو شیخ عطا محمد نے انہیں دیکھتے ہی، تمام لوگوں کے سامنے اَپنے روایتی درشت لہجے میں یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا کہ "جاؤ یہاں سے، ہو چکی ماتم پرسی" (۴۲)

اِقبال کی زبان میں:-

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا

آفتاب جنازے میں شریک ہوئے جنازے کو کندھا دیا۔ خود والد کے جسد خاکی کو قبر میں

اتارا۔ مگر اس موقع پر شیخ عطا محمد کا رویہ کس درجہ زیادتی پر مبنی تھا۔ اسکا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہو گیا تھا۔ ۱۰ جون ۱۹۳۸ء کو آفتاب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ (۴۳)

"مجھے افسوس ہے کہ تجھ سے اس روز زیادتی ہوئی اور تمہاری برخورداری نے بعد میں مجھے خود نادم کیا۔ غم اور رنج کی حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے"۔

علامہ نے اپنی وصیت میں آفتاب اور انکی والدہ کو وراثت میں حصہ دار نہیں ٹھہرایا تھا۔ اِن حالات میں شیخ عطا محمد (برادر بزرگ علامہ) نے آفتاب کے نام خطوط (۴۴) میں علامہ کو خطاوار ٹھہرایا اور اپنی ہمدردی کا یقین دِلایا۔ اُنہوں نے آفتاب کو اپنی والدہ کے حق میں قانونی چارہ جوئی کرنے کا بھی مشورہ دیا اور امداد کا یقین بھی دِلایا مگر آفتاب کو ان کی والدہ نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

آفتاب نے اَپنے اور اپنی والدہ کے لیے مالی امداد کے حصول کی خاطر سر اَکبر حیدری کے نام خطوط کا سلسلہ جاری رکھا۔ آفتاب کی حمایت میں سر ظفراللہ خان (۱۸۹۳۔۱۹۸۵ء) نے جو برطانوی ہند کی کونسل میں لاء ممبر تھے' سر اَکبر حیدری کے نام ۹ مئی ۱۹۳۸ء کو شملہ سے ایک خط میں لکھا۔ (۴۵)

I believe you have already been approached in the matter of rendering some help to Dr. Aftab Iqbal M.A.Ph.D Bar -at-Law. eldest son of late Dr. of Sir Mohammad Iqbal. Dr. Aftab Iqbal is a youngman of great talent and promise but to my certain knowledge. He is passing through a period of great distress and you will be helping in a very deserving case if you can do any thing anything for him. I do hope,it will be possible for you to render substatial help to Aftab Iqbal."

اس خط پر کاروائی کے طور پر آفتاب کو وقتاً فوقتاً چھ سو روپے کلدار اور ایک سو پاؤنڈ کی امداد دی گئی (۴۶) تاہم ڈاکٹر مظفرالدین قریشی کی کوششوں کے باوجود آفتاب کے لیے ریاست حیدر آباد سے مزید کوئی مدد حاصل نہ کی جا سکی۔ ریاست سے جاوید اِقبال' منیرہ بانو اور کریم بی بی کے لیے ماہوار وظائف جاری کر دیے گئے۔ مگر آفتاب کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ "جو شخص قانونی پریکٹس کے ذریعے اپنی روزی کما رہا ہو اسے رقم دینا چہ معنی وارد" (۴۷)

اُدھر لاہور میں کافی عرصے سے آفتاب ملازمت کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شیخ عطا

محمد بھی اِن کوششوں میں ان کے ساتھ تھے۔ چنانچہ شیخ عطا محمد نے جون ۱۹۳۹ء میں کشمیر جاکر چودھری خوشی محمد ناظر سے نواب مظفر کے نام ایک سفارشی خط حاصل کیا اور آفتاب کو بھیجا۔ وہ چاہتے تھے کہ اَنجمن حمایت اسلام کے ذریعے آفتاب کو اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت مل جائے۔ شیخ عطا محمد ۲۵ جون ۱۹۳۹ء کو ایک خط میں آفتاب کو لکھتے ہیں۔

"جس اَنجمن کی خدمت برادر مرحوم نے جوانی کے عالم سے لیکر تا بمرگ کی ہو اس اَنجمن کو لازم ہے کہ مرحوم کی خدمات کو یاد رکھنے کے لیے ان کی اولاد میں سے آفتاب اِقبال، انکے بڑے اور لائق لڑکے کو کالج میں جگہ دے کر ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے تاکہ آئندہ نسلوں کے دِلوں میں بھی مرحوم اِقبال زندہ رہے۔" (۴۸)

ایسی ہی کوششوں سے آفتاب اِقبال کو ستمبر ۱۹۳۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں شعبۂ انگریزی کے سربراہ کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ کالج کے پرنسپل خواجہ دِل محمد نے طلباء سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"جناب آفتاب اِقبال ایم اے، لندن، بارایٹ لاء، نامور باپ ڈاکٹر سر محمد اِقبال کے نامور بیٹے ہیں۔ وہ ایک پرجوش سکالر اور فصیح مصنف ہیں۔ ہم اُنہیں اَپنے درمیان خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ان اعلیٰ توقعات پر پورا اتریں گے جو ہم نے انکی ذات سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ میرے عزیز طلبہ! آپ کو اِن کے علم و فضل سے استفادہ کرنے کے متعدد مواقع میسر آئیں گے۔" (۴۹)

علاوہ ازیں اُنہیں اسلامیہ کالج یونین کا صدر بھی مقرر کیا گیا (۵۰) وہ ۱۹۴۱ء تک اس ادارے میں شعبہ انگریزی کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات اِنجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک دہلی میں قیام رہا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو جالندھر میں ٹھیکیدار مرزا روشن بیگ کی صاحبزادی رشیدہ بیگم (پ۔ ۱۹۲۳ء) سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء میں کچھ عرصہ گورنمنٹ آف اِنڈیا کے محکمہ تسپلائی میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۴۵ء میں آفتاب نے لاہور میں ہائیکورٹ میں قانونی پریکٹس کا آغاز کیا وہ اِن دنوں لاہور میں باغبانپورہ کے قریب مین روڈ پر واقع ایک کوٹھی "لالہ زار" میں کرائے پر رہ رہے تھے (۵۱)۔ ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی منتقل ہو گئے اور سندھ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان میں پریکٹس کرنے لگے۔ اُنہوں نے مصنوعات کی رجسٹریشن، (Patent act) وغیرہ میں Specialize کیا اور کراچی کے نامور وکلاء میں شمار ہونے لگے۔ اُنہوں نے

اپنی خداداد صلاحیتوں، محنت اور اپنے خوبصورت انداز خطابت کی مدد سے عزم و استقلال کے ساتھ خوب ترقی کی اور خوشحال زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے انکی اولاد میں تین صاحبزادے شامل ہیں:۔

آزاد اقبال:۔ (پ: ۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء لاہور) بیرسٹر ہیں اور شاعر بھی
وقار اقبال:۔ (پ: ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کراچی، وفات، ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کراچی)
ڈاکٹر نوید اقبال:۔ (پ: ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۲ء کراچی) ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی (۵۲)

کراچی منتقل ہونے کے بعد آفتاب اقبال کے حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے اولاد کو اچھی تربیت دی اور اعلیٰ تعلیم دلوائی اور ان خواہشات کو مدنظر رکھا جو کبھی ان کے من میں بھی ابھری تھیں مگر ناسازی حالات نے انہیں پنپنے کا موقع نہ دیا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا اور آفتاب کی شوریدہ سری کم ہوتی گئی۔ اور اسکی جگہ متانت آتی گئی۔ زندگی کی کٹھنائیوں نے انہیں بہت کچھ سکھا دیا تھا اور اب وہ زندگی کی حقیقتوں اور رشتوں کے تقدس کو بہتر طور پر سمجھنے لگے تھے۔ انہیں اپنی دانستہ اور نادانستہ غلطیوں کا احساس ہونا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اقبال کی زندگی میں ہی مصالحت کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ مگر جوانی کے جوش میں جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنی تنگدستی کی وجہ سے وہ کچھ ایسی حرکات کر چکے تھے جنہیں اقبال کبھی فراموش نہ کر سکے۔ آفتاب بھی اب چاہنے لگے تھے کہ

پھر ہم کو اسی سینہ روشن میں چھپا لے
اے مہر جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

مگر وہ اقبال کی نظروں میں اپنا مقام بحال نہ کر سکے اور صبح کا بھولا جب لوٹ کر گھر آیا تو شام ڈھل چکی تھی اور اسکی جگہ گہری تاریکی نے لے لی تھی۔

پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب آفتاب کو اپنے باپ کی عظمت کا احساس ہو گیا اور وہ ان کی فکر اور عظمت سے روشناس ہوئے۔ اب وہ ان کے محاسن کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ ۱۹۶۷ء تک اس قدر مثبت تبدیلی آچکی تھی کہ اب وہ اقبال کی کسی بات اور کسی عمل سے نالاں نہ تھے۔ کہتے ہیں (۵۳)

"وہ بے شک مجھے اپنے مالی ترکہ سے ضرور محروم کر گئے مگر ان کے علمی و ذہنی ترکہ کا بہت بڑا حصہ مجھے قدرت نے ودیعت فرمایا..... انہوں نے مجھے بے سہارا چھوڑا اور یہی چیز میرے لیے مفید ثابت ہوئی۔ عزم امور کی صلاحیت و

استعداد مجھے خدا نے مرحمت فرمائی۔ الحمد للہ میں پیش آمدہ مشکلات پر قابو پانے کے بعد آج سے بہت پہلے اس قابل ہوں کہ دوسروں کی مدد کرسکوں"

کراچی میں آفتاب جب تک رہے "یوم اِقبال" کی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ جب وہ لندن میں تھے (۱۹۷۰ء کی دہائی میں) تو وہاں بھی "یوم اِقبال" کے موقع پر اپنی خطابت کے کمال سے سامعین کو مسحور کرتے رہے۔ فصیح و بلیغ انگریزی میں اشعار اِقبال کی تشریح کرتے اور ساتھ بر محل اشعار اِقبال سے سماں باندھ دیتے۔

اب وہ ذاتی سطح سے بلند ہو کر سوچنے لگے تھے۔ اور اِقبال کو اپنے لیے ایک معزز حوالہ جاننے لگے تھے۔ اب اُنہیں ادراک ہو گیا تھا کہ اِقبال ایک مینارۂ نور ہے' اسکی قربت روشنی کا باعث ہوگی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے بچوں کے نام کے ساتھ "اِقبال" لگایا اور اِن کے بیٹے آزاد اِقبال نے اپنے بیٹے کا نام "جہاد اِقبال" رکھا ہے۔ (۵۴)

آفتاب ایک بھرپور زِندگی گزار کر ۱۳' اگست ۱۹۷۹ء کو رات دس بجے بعارضۂ قلب لندن میں اِنتقال کر گئے ان کا جسدِ خاکی کراچی میں لایا گیا اور ۱۵' اگست کو قبرستان سخی حسن کے مشرقی گوشے میں دفن کیا گیا۔ (۵۵)

آفتاب کیوں فرزندِ اِقبال کا صحیح مقام حاصل نہ کرسکا:۔

اگر ہم غیر جانبدارانہ طریقے سے اِن عوامل کا جائزہ لیں جو آفتاب اِقبال کے صحیح معنوں میں فرزندِ اِقبال بننے کی راہ میں حائل ہوئے اور ان کی مشکلات کا باعث بنے تو درج ذیل اسباب سامنے آئے ہیں۔

آفتاب کی زِندگی کے ابتدائی پندرہ سال بہت اچھے گزرے' پھر حالات کی ستم ظریفیاں شروع ہوگئیں اور اگلے تیس سال ان کی نذر ہو گئے۔ اِن سالوں میں وہ طرح طرح کے مسائل سے گزرے' عجیب عجیب آزمائشوں کا سامنا کیا۔ ایک طرف والد کی ناراضگی اور دوسری طرف والدہ کی حمایت میں والد کے منہ آنے پر نانا بھی ناراض۔ پھر مالی مشکلات کا ختم نہ ہونے والا طویل اور صبر آزما سلسلہ۔ گویا

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام

(۱) شفقتِ پدری کی کمی:۔

آفتاب ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ تب اِقبال لاہور میں تھے۔ کبھی کبھار سیالکوٹ آتے تو ملاقات ہوتی۔ پھر اِقبال تین سالوں کے لیے بیرون ملک چلے گئے۔ واپسی پر بھی زیادہ تر

لاہور میں ہی رہے۔ ۱۹۱۱ء میں آفتاب کو قادیان بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں جب علامہ نے دوسری اور پھر تیسری شادی کی تو آفتاب کی ہمدردیاں قدرتی طور پر ماں کے ساتھ تھیں اور یہ دور ان کی ذہنی پرورش کا دور تھا۔ یوں والد سے اختلاف کا بیج بویا جا چکا تھا۔ اِن پندرہ سالوں میں آفتاب اگرچہ دادا کے بہت قریب رہے لیکن والد کی شفقت اور توجہ سے محروم رہے۔ ایف اے کے بعد ملازمت کرنے کا اِقبال کا مشورہ بھی آفتاب کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد اختلافات بڑھتے گئے اور اِقبال کی دلچسپی کم سے کم تر ہوتی گئی۔ آفتاب جب اِنگلستان گئے تو علامہ کو خبر تک نہیں تھی کیونکہ اُنہوں نے آفتاب کے سر سے دست شفقت ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ مالی اعانت بھی بند کر دی تھی۔

آفتاب کی جذباتی عمر کی نادانیوں کو اِقبال اپنی شفقت سے سلجھا سکتے تھے مگر وہ تو آفتاب کے خطوط کا جواب دینے کی زحمت بھی نہیں کرتے تھے۔ یوں آفتاب اس "شفقتِ پدری" سے محروم رہے جو "آدابِ فرزندی" سکھانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

(۲) تایا کا درشت رویہ:۔

اِقبال کے برادرِ بزرگ کی سخت طبیعت سے آفتاب کبھی سمجھوتہ نہ کر سکے۔ شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ "وہ دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" تھے۔ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں جسمانی سزا کے قائل تھے۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اِقبال" میں چند ایک واقعات لکھے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب بچپن میں شرارتی تھے اور شیخ عطا محمد نے کئی دفعہ انہیں اپنی سخت طبیعت کا نشانہ بنایا (۵۶) ایسے میں کریم بی بی کی ایک نہ چلتی اور وہ اَپنے لختِ جگر کو تشدد کا نشانہ بنتے دیکھتی رہتیں۔ یہ رویہ آفتاب کے لیے قابلِ قبول نہ تھا کیونکہ وہ ننھیال میں شہزادوں کی سی زِندگی گزارتا تھا۔

(۳) اِقبال کی مزید شادیاں:۔

شاید یہ سب سے اہم سبب تھا۔ جب اِقبال نے دوسری اور پھر تیسری شادی کی تو قدرتی طور پر آفتاب کی ہمدردیاں ماں کے ساتھ تھیں۔ آفتاب نے اپنے اور اَپنے والد کے درمیان اختلافات اور کشمکش کا سبب صرف اس بات کو ٹھہرایا کہ اُنہوں نے اپنی والدہ کا ساتھ دیا۔ یہ بات بھی اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ دوسری شادی کرنے پر پہلی شادی سے ہونے والی اولاد سے والد کے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایسی شادیوں سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ پہلی اولاد کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

(۴) مالی دشواریاں:۔

یہ بھی اہم سبب تھا۔ کیونکہ تنگدستی میں اِنسان کا رویہ بدل جانا ایک قدرتی امر ہے۔ بچپن میں ننھیال کی طرف سے ان کو ہر سہولت میسر تھی۔ ایف اے کے بعد اِقبال آفتاب کی مالی مدد سے دستکش ہو گئے اور آفتاب کبھی نانا کبھی والدہ کبھی دوستوں کے محتاج رہے۔ تنگ دستیوں کی چیرہ دستیوں نے اُنہیں ہمیشہ پریشان رکھا۔ غریب الوطنی میں تنگ دستی اِن کے دِل و دماغ پر کچوکے لگاتی رہی۔ باپ سے جواب مل چکا ہو' ماں اپنی پونجی دے چکی ہو' اور نانا قرض حسنہ دینے کے لیے ایگریمنٹ مانگتے ہوں تو پرائے دیس میں جو بیتتی ہے' اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ اور ایسے میں راہِ اعتدال چھوٹ جانا بعید از قیاس نہیں۔

(۵) ناپختہ ذہن:۔

آفتاب کی شوریدہ سری کی ایک وجہ اِن کا ناپختہ ذہن بھی تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ یہ وقت ہیجان خیز ہوتا ہے۔ جسے ہم نفسیاتی اور جسمانی تبدیلیوں کے اعتبار سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ نوجوانی میں اِنسان بہت زیادہ "آدرش پرست" ہوتا ہے۔ جب آفتاب زِندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے قابل ہوئے تو اُنہوں نے اَپنے رویے میں واضح تبدیلی کر لی۔

(۶) اِقبال کے حاشیہ نشینوں کی کارستانیاں:۔

آفتاب اور اِقبال میں جب فاصلے پیدا ہوئے تو پھر بڑھتے ہی رہے۔ بڑھتے ہوئے فاصلوں اور تلخیوں کو غلط فہمیوں نے گھمبیر کر دیا۔ بجائے اس کے کہ ان تلخیوں کو کوئی اپنی محبت اور صلح جوئی کی شیرینی سے کم کرنے کی کوشش کرتا' اِقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو نہیں چاہتے تھے کہ آفتاب "فرزند اَکبر" کا مقام حاصل کرے اور ان کا وارث اور جانشیں ٹھہرے۔

اِقبال "یقین کر لینے والے" شخص تھے۔ ان کے حاشیہ نشین جو "خبر" سناتے وہ یقین کر لیتے۔ اگر اِقبال' آفتاب کی غلطیوں کو معاف کر کے سینے سے لگا لیتے تو یہ لوگ کامیاب نہ ہوتے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فلسفہ کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے والا دانائے راز اَپنے ہی لختِ جگر کے ذہن کو نہ سمجھ سکا۔ اِقبال ہی کی زبان میں:۔ (۵۷)

شمعِ محفل ہو کے تُو جب سوز سے خالی رہا
ترے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ اُلفت میں جب اِن کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

خان بہادر الحاج ڈاکٹر حافظ شیخ عطا محمد

ڈاکٹر شیخ عطا محمد' اقبال کی زوجۂ اولیٰ کریم بی بی کے والد تھے۔ گجرات شہر کے محلہ "کٹڑہ شالبافاں" میں رہتے تھے۔ ان کے دادا تجارت کی غرض سے کشمیر سے پنجاب آئے اور گوجرانوالہ میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کا تعلق کشمیریوں کی راٹھور گوت سے تھا (۵۸) وہ زعفران اور دیگر اجناس کشمیر کی تجارت کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹے شیخ عبداللہ کو تعلیم دلوائی وہ انگریز سرکار میں ملازم ہو گئے اور پنجاب کے داروغۂ جیل کے عہدے تک پہنچے اور گجرات شہر کے محلہ "کٹڑہ شالبافاں" میں سکونت پذیر ہوئے۔ (۵۹)

شیخ عطا محمد ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء کو گجرات میں پیدا ہوئے (۶۰) دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کرتے رہے۔ ۱۸۷۲ء میں مشن سکول گجرات سے میٹرک پاس کیا۔ (۶۱) اور اسی سال لاہور میڈیکل سکول (موجودہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج) میں داخل ہوئے۔ جنوری ۱۸۷۸ء میں اُنہوں نے سب اسسٹنٹ سرجن کورس مکمل کر لیا (۶۲)۔ اس سال اس ادارے سے کل گیارہ طلباء نے یہ کورس پاس کیا جن میں سے شیخ عطا محمد واحد مسلمان تھے۔ اور وہ اس ادارے سے فارغ ہونے والے آٹھویں مسلمان ڈاکٹر تھے۔ (۶۳) گویا قیام (۱۸۶۰) سے لے کر ۱۸۷۸ء تک ۱۸ سالوں میں یہ مرتبہ حاصل کرنے والوں کی تعداد صرف آٹھ تھی' جن میں سے شیخ عطا محمد ایک تھے۔ لاہور میڈیکل سکول میں اِن کے اساتذہ میں ڈاکٹر برٹن براؤن (پرنسپل) خان بہادر ڈاکٹر رحیم خان (۱۸۲۹ـ۱۹۰۶ء) ڈاکٹر محمد حسین خان' اور ڈاکٹر نیل شامل تھے۔ (۶۴)

یکم اگست ۱۸۷۸ء کو شیخ عطا محمد نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ (۶۵)

۱۵ ستمبر سے ۱۵ دسمبر ۱۸۷۸ء تک ہری پور ڈسپنسری میں انچارج رہے۔

۱۶ دسمبر ۱۸۷۸ء سے ۲۰ جنوری ۱۸۷۹ء تک میو ہسپتال میں جنرل ڈیوٹی پر رہے۔

اس کے بعد اِن کی خدمات فوج کے سپرد کر دی گئیں۔ مہاراجہ پٹیالہ اور جیند کی افواج کے ساتھ بطور اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر تعینات رہے اور چند ماہ کوہاٹ' بنوں وغیرہ میں رہے۔ پھر حکومتِ پنجاب کے تحت میو ہسپتال میں یکم جولائی سے ۸ ستمبر ۱۸۷۹ء تک رہے۔ اس کے بعد دوبارہ فوج کے ساتھ قرم فیلڈ فورس میں خدمات سرانجام دیتے رہے جہاں وہ ۹ ستمبر ۱۸۷۹ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۰ء تک رہے۔ یہ جنگِ افغانستان کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد اُنہیں "فرسٹ گریڈ اسسٹنٹ سرجن" کے عہدے پر ترقی دی گئی اور "افغانستان وار میڈل" بھی عطا کیا گیا۔ اس کے بعد وہ درج ذیل مقامات پر فائز رہے۔

میو ہسپتال لاہور (جنرل ڈیوٹی)	یکم نومبر ۱۸۸۰ء تا ۲۱ جنوری ۱۸۸۱ء
علی پور ضلع مظفر گڑھ ڈسپنسری (اِنچارج)	۲۲ جنوری ۱۸۸۱ء تا ۲۱ اپریل ۱۸۸۱ء
میو ہسپتال (جنرل ڈیوٹی)	۲۲ اپریل ۱۸۸۱ء تا ۱۲ مئی ۱۸۸۱ء
سول ہسپتال امرتسر اِنچارج	۱۳ مئی ۱۸۸۱ء تا ۲۶ اکتوبر ۱۸۸۱ء
سول ہسپتال گجرات (جنرل ڈیوٹی)	۲۶ اکتوبر ۱۸۸۱ء تا ۲۱ جنوری ۱۸۸۲ء
سنٹرل جیل۔ لاہور ڈپٹی میڈیکل آفیسر	۲۲ جنوری ۱۸۸۲ء تا ۱۵ نومبر ۱۸۸۲ء
گجرات کے سرکاری طبیبوں کے اِنچارج	۱۷ نومبر ۱۸۸۲ء تا ۱۹ مارچ ۱۸۸۳ء

اس بعد ان کی خدمات گورنمنٹ آف اِنڈیا کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر دی گئیں وہ سرکاری ڈسپنسری قلات کے اِنچارج ۳' اپریل ۱۸۸۳ء سے ۱۹ جولائی ۱۸۸۴ء تک رہے۔ اس وقت ان کی تنخواہ دو سو روپے تھی۔

اس کے بعد آپ کو خصوصی طور پر ہز مجسٹی کونسل حدیدہ اور قامران میں طبی خدمات پر تعینات کیا گیا۔ ساتھ ساتھ آپ وائس کونسل بھی تھے۔ یہاں آپ ۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ء سے ۲۴ دسمبر ۱۸۹۱ء تک رہے۔ اس دوران آپ نے ۷ بار حج کی سعادت حاصل کی۔ (۶۶)

حدیدہ (Hodieda) آجکل یمن کی بندرگاہ ہے۔ اس دور میں شاید یہ سلطان روم کی سلطنت میں شامل تھا۔ قامران اس سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے۔ حدیدہ میں امریکہ' روس' فرانس اور اٹلی کی کونسلیں بھی رہتی تھیں۔

حدیدہ کے قیام کے دوران ڈاکٹر عطا محمد نے بردہ فروشی کے اِنسداد کے لیے کی جانے والی کوششوں میں بھرپور مدد دی جسکا اعتراف سیکریٹری آف سٹیٹ نے کیا۔ اسی دوران ۲۴ مئی ۱۸۸۹ء کو آپکو "خان بہادر" کا خطاب دیا گیا (۶۷) سلطان روم کی جانب سے بھی "تمغۂ عثمانی" دیا گیا جسے سرکاری سطح پر قبول نہ کر سکے۔ ۱۸۹۱ء میں وطن واپس آئے۔ انکی خدمات حکومت پنجاب کے سپرد کی گئیں۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء سے ۳۰ نومبر ۱۸۹۲ء تک جنرل ڈیوٹی پر رہے۔

چکوال ڈسپنسری یکم دسمبر سے ۱۶ دسمبر ۱۸۹۲ء تک رہے۔

پنڈدادن خاں ڈسپنسری ۲۲ دسمبر ۱۸۹۲ء سے ۱۸ اپریل ۱۹۰۱ء تک رہے۔ نومبر ۱۸۹۴ میں اسسٹنٹ سرجن درجہ اول ہوئے۔

اسی دوران ۱۸۹۳ء میں آپ کی بڑی صاحبزادی کریم بی بی کی شادی محمد اِقبال سے ہوئی۔ پنڈدادن خاں میں ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو آفتاب اِقبال پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کو وائسرائے ہند کا اعزازی سرجن مقرر کیا گیا۔ جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ ۱۹۰۰ء میں خان

بہادر کو سینئر گریڈ میں ترقی دی گئی۔ بعد ازاں اِن مقامات پر تعینات رہے۔

سول سرجن شاہ پور	۸ مئی ۱۹۰۱ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۰۱ء
سول سرجن ڈیرہ اسمٰعیل خان	۲۵ نومبر ۱۹۰۱ء تا ۲۵ دسمبر ۱۹۰۲ء (۶۸)
سول سرجن گوڑگاؤں	۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء تا ۱۸ فروری ۱۹۰۳ء
سول سرجن شاہ پور	۲۲ فروری ۱۹۰۳ء تا ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء
۳ ماہ کی رخصت	۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء تا ۱۹ فروری ۱۹۰۴ء
سول ہسپتال راولپنڈی (اِنچارج)	۲۴ فروری ۱۹۰۴ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء
سول سرجن اٹک	یکم اپریل ۱۹۰۴ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۰۴ء
سول ہسپتال راولپنڈی	۲۱ دسمبر ۱۹۰۴ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء
سول سرجن ڈیرہ غازی خان	۳ اپریل ۱۹۰۵ء تا ۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء
سول سرجن مظفر گڑھ	۲۷ ستمبر ۱۹۰۶ء تا ۲۱ مئی ۱۹۰۷ء
سول سرجن میانوالی	۶ جون ۱۹۰۷ء تا یکم دسمبر ۱۹۱۲ء

میانوالی سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی ۳۴ سالہ سرکاری ملازمت' خدمت اور فرض شناسی کی روشن مثال تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے انکی خدمات کے اعتراف میں "گولڈ میڈل" بھی دیا گیا۔ آپ دو سال تک اِنڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ڈاکٹر عطا محمد' نواب سر محمد احمد علی خان والئی ریاست مالیر کوٹلہ کے ہاں چیف میڈیکل آفیسر کے طور پر ملازم ہو گئے اور ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ نواب نے آپ کی خدمات کو سراہتے ہوئے خلعتِ خاص بقدر تین ہزار روپے (سکہ ریاست مالیر کوٹلہ) عطا کی اور تعریفی سند بھی عنایت کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ریاست مذکور میں سینیٹر بھی رہے۔ (۶۹) اس کے بعد ڈاکٹر صاحب گجرات آ گئے اور کٹڑہ شالبافاں میں آپنے آبائی مکان میں مقیم رہے۔ آپ صحیح معنوں میں مومنِ پاکباز تھے۔ حافظِ قرآن' صوم و صلوہ کے بچپن سے پابند' جوانی سے بارلیش' متعدد بار حج بیت اللہ کی سعادت' غربا اور مساکین کے مونس و مددگار' نادار مریضوں کا نہ صرف علاج بلامعاوضہ کرتے بلکہ اپنی جیب سے ان کی مدد کرتے۔ آپ درجنوں بیواؤں کو ماہانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران جہاں بھی رہے لوگ آپ کی شرافت' دیانت' خدمت اور دینداری کے معترف رہے۔ دُنیاوی اعزازات اور جاہ و حشم سے ان کی منکسر المزاجی اور جذبۂ خدمت میں کبھی کمی نہ آئی۔ یہی وہ صفات تھیں جن کو دیکھ کر شیخ نور محمد نے ان سے ناتا جوڑا تھا۔ دونوں سمدھی تازیست ایک دوسرے کی عزت کرتے رہے اور اِقبال نے بھی

کریم بی بی سے کشیدگی کے باوجود اِن کی تکریم میں کمی نہ آنے دی۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر صاحب کا اکلوتا بیٹا ڈاکٹر غلام محمد' جو کچھ سال پہلے ہی لندن سے میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹا تھا' عین عالمِ شباب میں اِنتقال کر گیا۔ ڈاکٹر عطا محمد کے لیے یہ حادثہ سوہانِ روح ہو گیا۔ ہر وقت آنکھوں میں نم اور دل میں غم لئے' قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے رہتے۔ ایک دن راجہ سکندر خاں (جن سے پنڈدادن خاں قیام کے دِنوں سے مراسم تھے) تعزیت کے لیے آئے اور کہنے لگے "ڈاکٹر صاحب صبر کیجئے! آخر سب کو ایک دِن جانا ہے' قدرت کو جو منظور" ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: "آپکی بات درست ہے مگر قدرت نے کچھ بے قاعدگی کی ہے"۔ (۷۰) بوڑھے باپ کے لیے نوجوان' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہونہار بیٹے کی موت سے بڑھ کر اور صدمہ کیا ہو سکتا ہے اور ڈاکٹر عطا محمد کے لیے یہی صدمہ جان لیوا ثابت ہوا اور بیٹے کے غم میں ڈیڑھ سال گھلتے رہنے کے بعد آخر ۱۴ دسمبر ۱۹۲۲ء کو اس جہان پُر درد سے سدھار گئے (۷۱) انہیں قبرستان بھٹیاں (محلہ مسلم آباد گجرات شہر) میں بیٹے کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شیخ عطا محمد اَپنے والدین کے اکلوتے فرزند تھے۔ ان کی دو بہنیں مہتاب بی بی اور بیگم بی بی تھیں۔ اِن کا ایک فرزند اور پانچ بیٹیاں تھیں۔

زینب بی بی

زینب بی بی' خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی زوجہ' کریم بی بی کی والدہ اور اِقبال کی خوشدامن جبکہ عظیم موسیقار خواجہ خورشید انور کی نانی تھیں۔

زینب بی بی ۱۸۵۸ء میں اٹاوہ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد اور ڈاکٹر عطا محمد کے والد آپس میں قریبی عزیز تھے۔ زینب بی بی اور ڈاکٹر عطا محمد کی شادی ۱۸۷۲ء کے قریب ہوئی۔ اس وقت وہ میٹرک کا امتحان پاس کر چکے تھے اور میڈیکل سکول میں داخلے کے منتظر تھے۔ زینب بی بی معمولی پڑھی لکھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے قیام عرب کے دوران انہوں نے بھی کئی حج کیے۔ (۷۲)

بیٹی کی شوہر سے علیحدگی' جوان بیٹے کی موت' شوہر کی موت اور پھر داماد (اِقبال) کی موت کے صدمے جھیل کر اگست ۱۹۳۸ء میں گجرات میں فوت ہوئیں اور قبرستان بھٹیاں (گجرات) میں آپنے شوہرِ نامدار کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ (۷۳)

کیپٹن ڈاکٹر شیخ غلام محمد

شیخ غلام محمد' ڈاکٹر عطا محمد کے اکلوتے فرزند اور شاعرِ مشرق کے برادر نسبتی تھے۔ ۱۸۹۱ء کے قریب گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سکاچ مشن سکول گجرات میں حاصل کی۔ والد نے اِن کے لیے بھی میڈیکل کے شعبے کا اِنتخاب کیا اور لاہور میڈیکل کالج میں داخل کروا دیا۔ شیخ غلام محمد ہونہار طالب علم تھے۔ ۱۹۰۹ء میں نہایت کم عمری میں اُنہوں نے L MS کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس سال اس ادارے سے صرف ۲۵ طالب علموں نے یہ امتحان پاس کیا جن میں سے صرف ۲ طالب علم شیخ غلام محمد اور سید غلام مرتضیٰ' مسلمان تھے۔ شیخ غلام محمد' اس ادارے کے قیام (۱۸۶۰ء) سے لے کر ۱۹۰۹ء تک فارغ ہونے والے ساٹھویں مسلمان تھے۔ گویا پچاس سالوں میں ساٹھ افراد' مسلمانوں میں سے یہ مقام حاصل کر سکے تھے۔ (۷۴)

۱۹۰۹ء میں ہی آپ اِنڈین میڈیکل سروس میں داخل ہوئے اور مارچ ۱۹۱۲ء میں مزید تعلیم کے لیے اِنگلستان روانہ ہوئے اور لیور پول یونیورسٹی سے میڈ۔سن کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۹ء میں انکی شادی لاہور کے ایک معزز کشمیری خاندان کی ایک دوشیزہ فہمیدہ بیگم سے کر دی گئی۔ اس خاتون سے ۱۹۱۲ء میں محمد مسعود پیدا ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں جب ڈاکٹر غلام محمد نے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے والد انہیں اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس موقع پر اِقبال نے ڈاکٹر عطا محمد کو رضا مند کیا اور والدہ سے اس وعدے پر اجازت حاصل کی کہ وہ ہر سال کچھ دِنوں کے لیے آیا کریں گے۔ چنانچہ وہ اِنگلستان روانہ ہو گئے اور نہ صرف ۵ سال تک واپس نہ آ سکے بلکہ جب واپس آئے تو اِنکے ساتھ ایک نئی نویلی دُلہن ڈورس بھی تھی جس سے ۱۹۱۵ء میں پیرس میں شادی کر چکے تھے۔ اس پر ان کے والدین اور اِقبال بہت ناراض ہوئے (۷۵) واپسی پر غلام محمد نے اپنی منکوحہ بیوی کو چھوڑ دیا۔ دوسری بیوی سے ایک بیٹا پیدا ہوا مگر جلد ہی فوت ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد دوسری بیوی ان کا سارا مال و اسباب بیچ کر واپس چلی گئی۔

ڈاکٹر شیخ غلام محمد فرانس میں حکومت برطانیہ کی جانب سے' پہلی جنگ عظیم میں' مامور تھے کہ وہیں بیمار ہو گئے۔ واپسی پر راولپنڈی ملٹری ہسپتال میں تعیناتی ہوئی اور یہیں علاج کے لیے داخل ہو گئے۔ مگر ان کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی اور موت کو نہ ان کی بوڑھی ماں کی دعائیں روک سکیں نہ باپ کا عمر بھر کا تجربہ! آخر ۲۱ مئی ۱۹۲۱ء کو ۲۹ سال کی عمر میں آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بوڑھے باپ نے اپنے اکلوتے اور نہایت قابل فرزند

کو آپنے ہاتھوں سے قبرستان بھٹیاں میں سپرد خاک کیا۔

نواب بی بی

ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی دوسری بڑی بیٹی اور علامہ اِقبال کی سب سے بڑی خواہر سبتی نواب بی بی ۲۰ اپریل ۱۸۷۷ء کو گجرات شہر کے محلہ کٹڑہ شالباقاں میں پیدا ہوئیں۔ (۷۶) بہت چھوٹی عمر میں ان کا نکاح ان کے پھوپھی زاد عنایت اللہ سے ہو گیا اور ۴ مئی ۱۸۹۳ء کو رخصتی ہوئی۔

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے اپنی کتاب "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۷۳ پر لکھا ہے کہ نواب بی بی کی شادی پہلے حافظ فضل احمد سے ہوئی جو ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم تھے اِن سے نباہ نہ ہو سکا تو اُنہوں نے نواب بی بی کو طلاق دے دی۔ پھر عنایت اللہ سے عقد ثانی ہوا۔" مگر نواب بی بی کے حقیقی بھانجے سید پرویز سجاد بخاری (۷۷) اور محترمہ رشیدہ آفتاب صاحبہ نے (۷۸) اس کی تردید کی اور بتایا کہ نواب بی بی کی ایک ہی شادی عنایت اللہ سے ہوئی تھی۔ عنایت اللہ پولیس میں سب اِنسپکٹر تھے اور کالری دروازہ گجرات میں رہتے تھے۔ وہ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد کی بڑی بہن کے صاحبزادے تھے۔ اِنکی ماں بیوہ تھیں اور اپنی بیماری اور طویل العمری کی وجہ سے بیٹے کی جلد شادی کرنا چاہتی تھیں چنانچہ نواب بی بی اور عنایت اللہ کا نکاح اسی وقت کر دیا گیا جب نواب بی بی کی عمر ابھی صرف پانچ برس تھی۔ رخصتی ۱۶ برس کی عمر میں ہوئی۔

نواب بی بی کا اِنتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا (۷۹) اور عنایت اللہ نے ۱۹۶۵ء کے قریب گجرات میں وفات پائی (۸۰) اِنکی صرف ۴ بیٹیاں نصرت، تاج، عصمت، اور ثروت تھیں۔

فاطمہ بی بی

ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی تیسری بیٹی' علامہ کی خواہرِ نسبتی اور عظیم موسیقار خورشید انور کی ماں' فاطمہ بی بی ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ حدیدہ میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۰۹ء میں اِن کی شادی لاہور میں خواجہ فیروزالدین سے علامہ اِقبال کے توسط سے ہوئی۔ خواجہ فیروزالدین کے والد خواجہ رحیم بخش علامہ کے قریبی دوست تھے۔ خواجہ فیروزالدین بیان کرتے ہیں:۔

"اس زمانے میں میرے والد میری شادی کے سلسلے میں ڈاکٹر عطا محمد کے پاس پہنچے جن کی بڑی صاحبزادی ڈاکٹر اِقبال سے بیاہی جاچکی تھی۔ ڈاکٹر اِقبال اس زمانے میں بہ سلسلہ تعلیم لندن جاچکے تھے۔ ڈاکٹر عطا محمد نے رشتے کے سلسلے میں میرے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کی تو ڈاکٹر اِقبال کو بھی ولایت ایک خط لکھا۔ میں اس اثناء میں سالانہ امتحان میں فیل ہوگیا۔ اس لیے کہ ریاضی مجھے بالکل نہیں آتی تھی۔ اور اس زمانے میں ریاضی کا مضمون لازمی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر عطا محمد نے رشتے سے اِنکار کردیا۔ پھر ڈاکٹر اِقبال کا خط آیا جس میں تاکیداً لکھا تھا کہ یہ رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ ضرور منظور کرلینا چاہیے۔ ایسا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا اس میں میری بڑی تعریف لکھی تھی کیونکہ ڈاکٹر صاحب میرے والد اور دوسرے افراد خانہ کو بھی جانتے تھے۔ میں اس زمانے میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر عطا محمد نے خود سر مہدی شاہ کو کیمبل پور میرے والد کے پاس بھیجا کہ ہمیں رشتہ پسند ہے۔ ہم منظور کرتے ہیں۔ اس طرح میری طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے بطور اُستاد جو تاثرات میرے متعلق قائم کیے تھے وہ رشتے کے سلسلے میں میرے معاون ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ہی کی سفارش سے مجھے ان کا ہم زلف بننے کا موقع ملا اور ۱۹۰۹ء میں میری شادی ہوگئی"۔ (۸۱)

اسی شادی کے بارے میں خواجہ عبدالوحید برادر عم زاد خواجہ فیروزالدین کا بیان ہے کہ:۔

"اس وقت مجھے شادی کی ایک تقریب یاد آرہی ہے جس میں علامہ اِقبال نے شرکت کی تھی۔ ۱۹۰۸ء تک میرے دو بڑے بھائیوں خواجہ عبدالمجید (مولف جامع اللغات) اور خواجہ عبدالحمید کی شادیاں ہوچکی تھیں اب میرے چچا زاد بھائی خواجہ فیروزالدین کی باری تھی ان کے لیے رشتے کی تلاش ہوئی تو علامہ اِقبال نے اپنی خواہر نسبتی (والدہ آفتاب اِقبال کی بہن) کا رشتہ تجویز کیا۔ شیخ

صاحب اول تو ہمارے خاندان سے اچھی طرح واقف تھے دوسرے اُنہوں نے یہ دیکھا کہ لڑکے کے بارے میں ان کے داماد (علامہ اِقبال) کی رائے اچھی ہے۔ اُنہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ ڈاکٹر عطا محمد کا قیام گجرات میں تھا جو لاہور سے بہتر میل کے فاصلے پر ہے۔ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ شادی ہوئی۔ برات بڑی دھوم دھام کے ساتھ گجرات گئی۔ برات کا استقبال کرنے والوں میں حضرت علامہ اِقبال بھی تھے۔ برات کے ساتھ..... طوائف بھی تھی۔ برات ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے گھر پہنچی تو رات کا وقت تھا' اس موقع پر آتش بازی کا زبردست مظاہرہ ہوا"۔ (۸۲)

اِقبال جب خواجہ فیروزالدین کے گھر جاتے تو فاطمہ بی بی سے ملاقات ہوئی (۸۳)۔ فاطمہ بی بی کی وفات ۱۹۸۲ء میں ہوئی ۔ ان کی اولاد میں خواجہ محمد آصف' خواجہ خورشید انور' خواجہ محمد افضل' خواجہ سلطان احمد' انوری بیگم' اصغری بیگم اور نجمہ بیگم شامل ہیں۔ (۸۴)

حمیدہ بیگم

خان بہادر کی صاحبزادی اور علامہ اِقبال کی خواہرِ نسبتی' حمیدہ بیگم ۱۸۹۴ء کے لگ بھگ گجرات میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۱۴ء کے قریب ان کی شادی سیّد عظمت علی شاہ سے ہوئی۔ جو پولیس میں ڈی۔ایس۔پی تھے اور اندرون کالری دروازہ میں رہتے تھے۔ ان کے والد سید محمد فضل شاہ میونسپل کمیٹی گجرات کے ممبر تھے۔ سید عظمت علی شاہ ریٹائرمنٹ کے بعد میو روڈ لاہور پر رہائش پذیر رہے۔اقبال کے ملاقاتی بھی تھے۔ طویل عمر پا کر ۱۹۹۲ء میں فوت ہوئے۔ سید عظمت علی شاہ کے چچا زاد بھائی سید نور اللہ شاہ' ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے قریبی دوست تھے' انہی کی وساطت سے یہ رشتہ طے پایا۔ سیدعظمت علی شاہ کی یہ دوسری شادی تھی۔ اور حمیدہ بیگم کی پہلی! حمیدہ بیگم ۱۹۶۳ء میں لاہور میں فوت ہوئیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ ان کی اولاد میں سید شفقت علی شاہ (ایڈووکیٹ) اور خالدہ بیگم شامل ہیں۔ ایک اور بیٹا سہیل عظمت بچپن میں فوت ہو گیا تھا۔ (۸۵)

شہزادہ بیگم

خان بہادر کی سب سے چھوٹی صاحبزادی' شہزادہ بیگم ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی بھی سید خاندان میں سید نور اللہ شاہ کے صاحبزادے سید سجاد حیدر بخاری سے ۱۹۲۸ء کے قریب ہوئی۔ اس سے قبل ان کی شادی بھٹی کشمیری برادری میں نذیر احمد بھٹی سے ۱۹۱۷ء کے لگ بھگ ہوئی تھی مگر اس خاوند سے نباہ نہ ہو سکا اور ۱۹۲۵ء کے قریب طلاق ہو گئی۔

سید سجاد حیدر بخاری بیرون کالری دروازہ (فیصل گیٹ) گجرات شہر میں رہتے تھے۔ پھر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ وہ لاہور ہائیکورٹ کے ڈاکومنٹ ایکسپرٹ تھے۔ شہزادہ بیگم نے لاہور میں ہی زندگی گزاری اور ۱۹۸۳ء میں فوت ہوئیں۔ جب علامہ اقبال میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے تو شہزادہ بیگم اور حمیدہ بیگم دونوں بہنیں ان کے مکان کے متصل (دیوار بیچ) گھر میں کچھ عرصہ رہیں۔ اولاد میں سید پرویز سجاد بخاری (سول سرونٹ) پروین بیگم' نسرین بیگم' یاسمین بیگم' سیمیں بیگم اور شہناز بیگم شامل ہیں۔ (۸۶)

شجرہ نسب سید عظمت علی شاہ و سید سجاد حیدر شاہ

(صرف متعلقہ افراد کے نام لکھے گئے ہیں)

سید عبدالصدیق شاہ

سید عبدالصمد شاہ

(صوبیدار فوجِ فرنگ' مدفون گجرات۔ اِن کے چھ بیٹے تھے)

سید اکبر علی شاہ۔ سید اصغر علی شاہ۔ سید محمد فضل شاہ

سید نور اللہ شاہ (سیشن جج)۔ سید تراب علی شاہ۔ سید عظمت علی شاہ (ایس پی)

سید سجاد حیدر۔ سید امجد علی۔ سید حسن عسکری۔ سید فخر تراب' سید شفقت علی

شیخ محمد مسعود

خان بہادر کے پوتے اور ڈاکٹر غلام محمد کے فرزند' شیخ محمد مسعود ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ مشن سکول گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد انٹر کالج گجرات سے ایف۔ اے کیا۔ ایف سی کالج لاہور سے گریجوایشن کی اور سول سروس میں آ گئے۔ پنجاب اسمبلی میں اسسٹنٹ سیکریٹری رہے۔ (۸۷)

اندازاً ۱۹۳۶ء میں ان کی شادی ان کی پھوپھی فاطمہ بی بی زوجہ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر کی صاحبزادی انوری بیگم سے ہوئی۔ کٹڑہ شالبافاں کے ایک بزرگ میر نصیرالدین' جو خان بہادر کے عزیز ہیں' نے راقم سے ایک ملاقات میں بتایا۔

"شیخ عطا محمد کا سارا خاندان بڑا شریف اور نیک تھا۔ ان کے پوتے شیخ مسعود کی شادی لاہور میں طے پائی۔ اس لڑکی کا بھائی خواجہ خورشید انور بہت بڑا موسیقار ہوا ہے۔ میں نے یہ شادی اٹینڈ کی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے بارات گجرات سے لاہور گئی تھی۔ بڑا عالیشان اِنتظام تھا۔ انگریزی اور دیسی دونوں طرح کے کھانے دیے گئے۔ شیخ مسعود شادی کے بعد زیادہ عرصہ یہاں (گجرات) نہیں رہے' لاہور چلے گئے تھے۔"

بقول سید نذیر نیازی (۸۸)

"شیخ محمد مسعود' اِقبال کی گود میں کھیلے۔ علی بخش ان کا بڑا خیال رکھتا۔ محمد مسعود نے اَپنے پھوپھا کا ذِکر ہمیشہ بہت اَدب سے کیا۔"

شیخ مسعود صاحب کی زِندگی کا زیادہ تر حصہ لاہور میں گزرا اور یہیں ۵۹ برس کی عمر میں یکم مئی ۱۹۷۱ء کو اِنتقال ہوا۔ (۸۹) شیخ مسعود صاحب کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ یوں خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کا سلسلہ نسل آگے نہ بڑھ سکا۔ مسعود صاحب کی صرف ۵ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دو کی شادیاں خواجہ عبدالحمید کے بیٹوں سے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ہوئیں۔

حوالہ جات و حواشی:۔

(۱) "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" از سید حامد جلالی۔ مجلس محبان اِقبال کراچی ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۲ کے مطابق "کریم بی بی ۱۸۷۴ء کو جدہ میں پیدا ہوئیں جہاں ان کے والد وائس کونسل تھے "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین۔ اِقبال اکادمی لاہور ۸۶ء صفحہ ۱۷۷ کے مطابق کریم بی بی ۱۸۷۷ء کو گجرات میں پیدا ہوئیں۔
صحیح صورت حال یہ ہے کہ کریم بی بی ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو گجرات میں پیدا ہوئیں تب ان کے والد ابھی لاہور میڈیکل سکول میں زیر تعلیم تھے۔ یہ تاریخ پیدائش گجرات میونسپل کمیٹی ریکارڈ (بحوالہ مظلوم اقبال صفحہ ۹۲) سے لی گئی ہے اور اِقبال کے خاندان کی روایتوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۲) "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۲۱

(۳) "روایات اِقبال" مرتبہ عبداللہ چغتائی۔ مجلس ترقی اَدب لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۹۵

(۴) مضمون "لیڈی اِقبال" از بلقیس عابد علی، مطبوعہ ہفت روزہ "صادق" لاہور "اِقبال نمبر"۔ بابت ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۷

(۵) ایضا

(۶) مکتوب کرنل خواجہ عبدالرشید محررہ ۲۰ فروری ۱۹۷۹ء (راقم کو اس خط کی فوٹو کاپی ریاض مفتی صاحب سے ملی۔ اِن کے بیان کے مطابق یہ خط پرنسپل جی سرور صاحب کے نام لکھا گیا تھا' لیکن خط کے نفس مضمون سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔ اس خط کا عکس ضمیمہ جات میں شامل ہے۔ م۔ س)

(۷) صحیح تاریخ وفات (۲۸ فروری ۱۹۴۷ء) اور جائے مدفن کے ذرائع:۔
(الف) کریم بی بی کے بھانجے سید پرویز سجاد بخاری کا بیان
(ب) مکتوب محترمہ رشیدہ آفتاب اِقبال بنام مصنف مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ء
☆ سید نذیر نیازی ("دانائے راز" صفحہ ۷۵) نے تاریخ وفات ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء لکھی ہے۔
☆ عبدالسلام ندوی ("اِقبال کامل") نے تاریخ وفات مارچ ۱۹۴۷ء لکھی ہے۔
☆ صابر کلوروی ('یادِ اِقبال' صفحہ ۴۵) نے تاریخ وفات ۲۸ نومبر ۱۹۴۶ء لکھی ہے۔
☆ ڈاکٹر جاوید اِقبال (زندہ رود اول صفحہ ۲۷) نے تاریخ وفات ۱۹۴۶ء لکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید لکھا گجرات میں فوت ہوئیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

(۸) مضمون "لیڈی اِقبال" از بلقیس عابد علی۔ محولہ بالا

(۹) ماہنامہ "شاعر" بمبئی اِقبال نمبر۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۵۴۸ سے یہ خط نقل کیا گیا ہے۔

(۱۰) معراج بیگم کو گلے کا خنازیر تھا۔ جسکا ڈاکٹر عطا محمد نے خود کئی مرتبہ آپریشن کیا۔ ایسے ہی کسی

آپریشن کے زخم کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۱) قریبی ذرائع اور قبر کے کتبے کے مطابق سن پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔
(۱۲) روایت کے مطابق پہلا بچہ میکے پیدا ہوتا تھا۔
(۱۳) مفکر پاکستان از محمد حنیف شاہد صفحہ ۴۷۳
(۱۴) یاد اقبال از صابر کلوروی صفحہ ۴۵
(۱۵) روایات اقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی صفحہ ۷۵
(۱۶) یہ خط ماہنامہ "شاعر" بمبئی اقبال نمبر ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۵۴۸ سے لیا گیا ہے۔
(۱۷) "مظلوم اقبال" از اعجاز احمد صفحہ ۹۱۔۹۰' ۱۰۶۔۱۰۵
(۱۸) روایات اقبال صفحہ ۸۹
(۱۹) اقبال بنام عطیہ بیگم: مورخہ ۹ اپریل ۱۹۰۹ء مطبوعہ اقبال از عطیہ بیگم: مترجم ضیاء الدین احمد برنی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۸۱ء' صفحہ ۵۱
(۲۰) "اقبال کے کچھ حالات" (مضمون) از غلام بھیک نیرنگ۔ مطبوعہ مجلہ "اقبال" اکتوبر ۵۷ء
(۲۱) مظلوم اقبال صفحہ ۱۹۶
(۲۲) "علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۳۸
(۲۳) ایضاً صفحہ ۹۳۔۹۴
(۲۴) ذکر اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ ۲۴۸
(۲۵) حالات درست ہوتے تو اقبال کبھی یہ مشورہ نہ دیتے۔ م ُس
(۲۶) ماہنامہ 'شاعر' بمبئی۔ اقبال نمبر ا۔ ۱۹۸۸۔ صفحہ ۵۵۱ تا ۵۵۳
(۲۷) ایضاً صفحہ ۵۵۴
(۲۸) ایضاً صفحہ ۵۵۸
(۲۹) ایضاً صفحہ ۵۶۳
(۳۰) ایضاً صفحہ ۵۶۶ تا ۵۶۸
(۳۱) "علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۱۴۱
(۳۲) "اقبال ۸۵ء" مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور' ۱۹۸۹ء صفحہ ۵۸ مضمون "حیات اقبال کے چند نئے گوشے" از شکیل احمد
(۳۳) ایضاً
(۳۴) ایضاً
(۳۵) ایضاً صفحہ ۶۱ ترجمہ از انگریزی
(۳۶) ایضاً ۶۲ ترجمہ از انگریزی از مؤلف کتاب ہذا

مجلہ "صحیفہ" اقبال نمبر ۱۹۸۵ء میں عبداللہ قریشی صاحب کا مضمون "آفتاب اقبال" شائع ہوا۔ اس

مضمون میں کچھ خطوط کا انگریزی سے اُردو ترجمہ قریشی صاحب نے کیا ہے۔ یہ خطوط سب سے پہلے شکیل احمد کے مضمون "حیات اِقبال کے چند نئے گوشے (مطبوعہ مجلّہ اِقبالیات' لاہور بابت جولائی ۱۹۸۵ء) میں دیئے گئے تھے۔ اِن خطوط کا ترجمہ کرتے ہوئے قریشی صاحب نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ آفتاب بیچارہ گستاخ سے گستاخ تر ثابت ہو۔ یہ دانستہ کوشش لگتی ہے۔ دو مثالیں بلاحظہ ہوں۔ اصل انگریزی فقرہ یوں ہے:۔

"Inspite of the manner in which he has been behaving towards me and behaving towards me and other members of our family."

قریشی صاحب کا ترجمہ بلاحظہ ہوں۔

"وہ جس گستاخی اور بدتمیزی سے میرے ساتھ اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ پیش آتا تھا" اس ترجمے میں "گستاخی اور بدتمیزی" قریشی صاحب کی اختراع ہے۔ اسی طرح ایک اور فقرہ ہے جس میں قریشی صاحب نے "Nasty Letters" کا ترجمہ "بیہودہ اور دھمکی آمیز خطوط" کیا ہے۔ معلوم نہیں "دھمکی آمیز" کس لفظ کا ترجمہ ہے؟

(۳۷) ایضاً صفحہ ۶۵۔۶۶ ترجمہ اَز انگریزی اَز مؤلف کتاب ہذا

(۳۸) ایضاً صفحہ ۴۸

(۳۹) ایضاً صفحہ ۶۷۔۶۸

(۴۰) ایضاً صفحہ ۶۹

(۴۱) یاد اِقبال اَز صابر کلوروی صفحہ ۶۴۔ (بیگم رشیدہ آفتاب اِقبال نے راقم کے نام ایک خط محررہ ۳۰ جون ۹۷ء میں اس وصیت اور روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے)

(۴۲) "علامہ اِقبال اور اُنکی پہلی بیوی" صفحہ ۴۷

(۴۳) ایضاً صفحہ ۴۹

(۴۴) یہ خطوط "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" میں شامل ہیں۔

(۴۵) "اِقبال ۸۵" صفحہ ۷۰۔ آفتاب پی ایچ ڈی نہیں تھے۔

(۴۶) ایضاً صفحہ ۷۱

(۴۷) ایضاً صفحہ ۵۶

(۴۸) "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۸۰

(۴۹) مجلّہ "کریسنٹ" اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور۔ نومبر دسمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۶

(۵۰) روزنامہ "پاکستان" ۹ نومبر ۱۹۹۱ء "اِقبال اَپنے فرزند اَکبر کی نظر میں" اَز احسان الٰہی سالک

(۵۱) مکتوب بیگم رشیدہ آفتاب اِقبال بنام راقم مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ء ۳۰ جون ۱۹۹۷ء

(۵۲) آزاد اقبال نے کراچی گرامر سکول کے بعد انگلستان سے اولیول اے لیول اور ایل ایل بی (آنرز اور بارایٹ لا کیا۔ پاکستان آکر ۱۹۸۳ء تک قانونی پریکٹس کرتے رہے پھر سعودیہ کی ایک ملٹی نیشنل

کمپنی میں قانونی مشیر ہو گئے ۔ کئی ممالک کی سیر کر چکے ہیں ۔ علم و ادب، شعر و شاعری اور موسیقی سے خاص شغف رکھتے ہیں ۔ مجموعۂ کلام زیرِ تکمیل ہے ۔ شاعری میں علامہ اقبال کا پرتو واضح نظر آتا ہے ۔

وقار اقبال کی ابتدائی تعلیم بھی گرامر سکول سے ہوئی ۔ مزید تعلیم کے لئے انگلستان بھیجے گئے لیکن وہاں مختلف بیماریوں کا شکار ہو گئے اور واپس چلے آئے ۔ روحانیات اور مذہب کی طرف زیادہ لگاؤ تھا چنانچہ مذہبی تعلیم حاصل کی ۔ کئی عمرے اور ایک حج کیا۔ چالیس برس کی عمر میں دماغ کی نس پھٹنے سے انتقال کیا اور قبرستان سخی حسن کراچی میں مدفون ہیں ۔

نوید اقبال نے ایچیسن کالج لاہور اور انگلستان میں تعلیم پائی ۔ لندن یونیورسٹی سے بی ۔ اے اکنامکس (آنرز) فرانس سے ڈپلوما ان مینجمنٹ اور امریکہ کی کیلیفورنیا یونیورسٹی سے انٹرنیشنل ریلیشنز میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ تحقیق اور غور و خوض کے بعد عالمِ اسلام کے اتحاد کے لئے "یونائیٹڈ نیشنز آف ہلال" کا نظریہ پیش کیا۔ پاکستان اور عالمِ اسلام کی اقتصادی ترقی کے خواہاں ہیں اور اس سلسلے میں اپنے نظریے اور تجاویز کے حق میں اخبارات و جرائد میں بھی لکھتے رہتے ہیں ۔ آجکل اسلام آباد میں غیر ملکی سرمایہ کار کمپنیوں کی راہنمائی کا ادارہ چلا رہے ہیں ۔

("علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی" طبع دوم ۱۹۹۶ء صفحات ۲۷۸ تا ۲۹۳)

(۵۳) "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" صفحہ ۹۴

(۵۴) ماہنامہ "شاعر" بمبئی۔ اِقبال نمبر۔ ۱۹۸۸

(۵۵) یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آفتاب اِقبال سنی حنفی عقاید کے مالک تھے جیسا کہ انہوں نے خود صراحت کے ساتھ "علامہ اِقبال اور انکی پہلی بیوی" میں بیان کیا ہے۔ "خفتگان کراچی" از پروفیسر محمد اسلم، لاہور ۱۹۹۱ء میں صفحہ ۳۱۸ پر آفتاب اِقبال کی تدفین اور قبر کے سلسلے میں جو تحریر ہے اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ آفتاب قادیانی تھے جو سراسر غلط ہے۔

(۵۶) مظلوم اِقبال صفحہ ۶۵۔۶۶

(۵۷) بانگ درا۔ نظم شمع اور شاعر

(۵۸) مکتوب خواجہ عبدالرشید بنام نامعلوم مؤرخہ ۲۰ فروری، ۱۹۷۹ء

(۵۹) "اِقبال کی ابتدائی زندگی" از ڈاکٹر سلطان محمود حسین، صفحہ ۱۴۹

(۶۰) بمطابق خود نوشت حالات بحوالہ علامہ اور انکی پہلی بیوی طبع ثانی ۱۹۹۶ء صفحہ ۷۰

(۶۱) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، (حوالہ مذکور) نے لکھا ہے کہ وہ مڈل پاس کر کے لاہور میڈیکل سکول میں داخل ہوئے۔ لیکن لاہور میڈیکل سکول میں "سب اسسٹنٹ سرجن" کے کورس کے لیے کم از کم تعلیمی معیار میٹرک تھا۔ اس سے کم کبھی بھی داخلہ کا معیار نہیں رہا۔ دیکھئے

(i) King Edward Medical College - LHR 1985.

(ii) The Evolution of Medical Education in 19th century

Indo-Pakistan. (By Syed Amjad Ali)

(۶۲) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۴۹ پر کورس مکمل کرنے کی تاریخ جولائی ۱۸۷۸ء لکھی ہے۔ لیکن راقم کے نام ایک خط میں مصنف نے اصلاح کرتے ہوئے جنوری ۱۸۷۸ء لکھا ہے۔

(۶۳) کے۔ای کے طلباء کی ڈائریکٹری۔ 'ALL OF US' - LHR, 1985

(۶۴) The History of K.E.M.C LHR - 1985 -

(۶۵) خان بہادر کا سروس ریکارڈ پہلی مرتبہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے اپنی کتاب "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" میں دیا ہے۔ ہم نے اس ریکارڈ کو ضروری تصحیح کے بعد شامل کیا ہے۔ (م س)

(۶۶) ۱۹۸۶ء سے قبل شائع کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر عطا محمد جدہ میں وائس کونسل رہے۔ اس اصلاح کا سہرا بھی ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کے سر ہے۔

(۶۷) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۷۰ پر ۱۸۸۸ء لکھا ہے۔ درست سن ۱۸۸۹ء ہے بلاحظہ ہو "گزٹیئر آف گجرات ۱۹۲۱ء"

(۶۸) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۷۱ پر ۳۰ دسمبر لکھا ہے۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے راقم کے نام ایک خط میں اسکی اصلاح کی ہے۔

(۶۹، ۷۰) "روایات اِقبال" صفحہ ۹۶، روایت خواجہ فیروزالدین

(۷۱) دانائے راز از سید نذیر نیازی صفحہ ۴۷ پر سن وفات غلطی سے ۱۹۲۷ء لکھا گیا ہے۔

(۷۲) زیادہ تر معلومات سید پرویز سجاد بخاری (نواسہ خان بہادر) نے فراہم کیں

(۷۳) کتبۂ قبر

(۷۴) 'ALL OF US' - Directory of Graduates of K.E.M.C.LHR 1985.

(۷۵) روایات اِقبال صفحہ ۴۳، ۴۷، روایت علی بخش

(۷۶) مظلوم اِقبال از شیخ اعجاز احمد صفحہ ۹۲ بحوالہ ریکارڈ میونسپل کمیٹی گجرات

(۷۷) راقم سے ملاقات مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۹۲ء

(۷۸) مکتوب بنام راقم محررہ ۱۵ دسمبر ۱۹۹۴ء

(۷۹) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۷۳

(۸۰) بقول سید پرویز سجاد بخاری

(۸۱) "روایاتِ اِقبال" صفحہ ۸۸

(۸۲) "نقوش" اِقبال نمبر۔ شمارہ ۱۲۳، نومبر ۱۹۷۷ء اِقبال کے حضور از خواجہ عبدالوحید صفحہ ۳۸۳

(۸۳) اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین صفحہ ۲۹۱

(۸۴) "اِقبال کی ابتدائی زِندگی" صفحہ ۱۷۴

(۸۵ تا ۸۷) معلومات سید فخر تراب، سید حسن عسکری اور سید پرویز سجاد بخاری سے حاصل ہوئیں۔

(۸۸) دانائے راز از سید نذیر نیازی صفحہ ۸۷ - (۸۹) اِقبال کی ابتدائی زِندگی صفحہ ۱۷۴

باب چہارم
رجالِ گجرات سے اِقبالؒ کے مراسم

- حصہ اول:۔ محفلِ اِقبال کے ارکانِ مشیدہ (قریبی احباب)
- حصہ دوم:۔ وسعتِ محفلِ احباب
- حصہ سوم:۔ جن سے رسم وراہ تھی
- حصہ چہارم:۔ اِقبالؒ سے ملاقات کرنے والے
- حصہ پنجم:۔ اِقبالؒ کے گجراتی مکتوب الیہم

حصہ اول: محفلِ اِقبال کے ارکانِ مشیّدہ
(قریبی احباب)

- خان بہادر سردار عبدالغفور دُرّانی
- خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظؔر
- شفاءالملک حکیم محمد حسن قرشی

"موقع ہی وہ واحد معیار ہے جس سے کسی شخص کی حقیقی فطرت کو پرکھا جاسکتا ہے۔ اگر کبھی وقت آیا تو آپ کو دکھادوں گا کہ میں اَپنے دوستوں سے کس قدر شدید محبت کرتا ہوں اور میرا دِل اُن سب کے لیے کس درجہ بے تاب رہتا ہے۔ زِندگی کسے پیاری نہیں ہوتی لیکن مجھ میں اتنی قوت ضرور ہے کہ دوسروں کو ضرورت پڑنے پر اِسے اُن پر نثار کردوں"۔ اِقبال۔

خان بہادر سردار عبدالغفور درانی

اقبال کے دیرینہ دوستوں میں شامل تھے۔ انہیں اقبال کی شاگردی کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اقبال کا ابتدائی دور کا بیشتر کلام سردار عبدالغفور درانی کے ذریعہ ہی محفوظ رہا۔

سردار عبدالغفور درانی (جو بچپن سے ہی "ابو صاحب" کے عرف سے پہچانے جاتے تھے) گجرات کے مشہور درانی خانوادے کے فرزند تھے۔ یہ خاندان انیسویں صدی میں کابل سے آکر پنجاب میں آباد ہوا۔ عبدالغفور کے دادا سردار محمد حیات کے دادا شاہ مراد خاں پوپلزئی (۱) کابل کے حکمران تیمور شاہ کے دربار میں امیر اعظم کے لقب سے ممتاز تھے۔ اور یہ مرتبہ و لقب موروثی تھا۔ شاہ مراد کے فرزند سردار محمد شریف خاں وزیر اعلیٰ اور مشیر مال افغانستان کے عہدے تک پہنچے۔ اسی زمانہ میں کابل میں وزیر فتح خاں اور شاہ شجاع میں لڑائی ہوئی اور فتح خاں کو فتح ہوئی۔ جب شجاع الملک نے انگریزوں کی مدد سے کابل پر فوج کشی کی تو شریف خاں کے فرزند سردار پائندہ خاں' افغانستان کی فوج کے سپہ سالار تھے۔ وہ سردار دوست محمد سے کئی لڑائیاں لڑے اور دوست محمد کے تمام کنبے کو گرفتار کر کے انگریزی سرکار کے سپرد کر دیا۔ جب دوست محمد نے رہائی پائی اور امیر کابل ہوا تو اس نے شریف خاں کے ورثاء کو جلاوطن کر کے تمام جائداد ضبط کر لی۔ یہ خاندان انگریزوں سے پناہ لے کر پنجاب میں آ آباد ہوا۔ جب انگریزوں نے تمام پنجاب پر قبضہ کر لیا تو شریف خاں کے بیٹوں گلستان خان' صدیق خان اور محمد خان کو فوج میں سردار بہادر کے عہدے عطا کیے جبکہ دوسرے بیٹوں یار محمد خاں کو تحصیلدار اور محمد حیات خاں اور عطا محمد خاں کو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا۔ (۲) عبدالغفور خاں کے دادا خان بہادر سردار محمد حیات خان سرسید احمد خان کے دوست اور ان کی تحریک کے سرگرم رکن تھے (۳)۔ سردار عبدالغفور کے والد سردار محمد حسین خان بھی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔

عبدالغفور' ۱۸۸۴ء کے لگ بھگ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گجرات میں حاصل کی پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں ایف اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ان کا شمار ذہین اور سرگرم طلباء میں ہوتا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران انہیں پروفیسر تھامس آرنلڈ اور اقبال سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ بی۔اے کے بعد وہ محکمہ پولیس میں بھرتی ہوئے۔ مختلف شہروں میں تعینات رہے۔ سب سے طویل عرصہ میانوالی میں رہے۔ ترقی کرتے ہوئے سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے عہدے تک پہنچے۔ اور ۱۹۳۹ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئے۔

سردار عبدالغفور کا شمار مستعد' فرض شناس اور باصلاحیت پولیس افسروں میں ہوتا تھا۔ انگریزی افسران کے خاندانی پس منظر سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی اِنتظامی صلاحیتوں کے بھی معترف تھے۔ چنانچہ اُنہیں اہم مشن سونپے جاتے تھے۔ اور ان کی کارکردگی کی بنیاد پر اُنہیں "خان بہادر" کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گجرات کی سماجی اور سیاسی زِندگی میں حصہ لینا شروع کیا اور شہر کی سماجی شخصیت کے طور پر عزت کمائی۔ کچھ عرصہ سٹی مسلم لیگ کے بھی صدر رہے اور مسلم لیگ کے لیے بھرپور کام کیا۔ سیاسی نظریات کے اختلاف کے باوجود ان کے حریف بھی ان کی شرافت کے معترف تھے۔ سردار عبدالغفور نے ۱۰' اکتوبر ۱۹۵۲ء کو گجرات میں وفات پائی اور محلہ بیگم پورہ میں بیگم مسجد کے صحن سے متصل اَپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے۔

اِقبال اور اَبو صاحب

"اگر عبدالغفور اتنی محنت نہ کرتا تو بانگ درا کبھی مرتب نہ ہو سکتی" (اِقبال)

سردار عبدالغفور اِقبال کے شاگردوں' دوستوں اور مداحوں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اِقبال نے ۱۹۰۱ء میں چھ ماہ بطور ایڈیشنل پروفیسر انگریزی اور پھر اکتوبر ۱۹۰۲ء سے اِنگلستان روانگی تک بطور اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی' گورنمنٹ کالج لاہور میں خدمات سر انجام دیں۔ اِنہی سالوں میں عبدالغفور وہاں زیر تعلیم تھا۔ غالب امکان ہے کہ اُنہوں نے اِقبال سے انگریزی کا مضمون پڑھا۔ اگرچہ اُستاد اور شاگرد میں دوستی کی بجائے احترام اور شفقت کے رشتے پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے لیکن ایک تو دونوں کی عمروں میں صرف ۶' ۷ سال کا فرق تھا دوسرے عبدالغفور کو اَدب سے جو لگاؤ اور اِقبال سے جو محبت تھی' وہ دونوں کو بہت قریب لے آئی اور ابو صاحب اِقبال کے دوستوں میں شامل ہو گئے۔

ابتدائی کلام کی جمع آوری اور حفاظت:۔

شیخ عبدالقادر (جو علامہ اور اَبو صاحب دونوں کے مشترکہ دوست تھے' اس دور کا ذِکر کرتے ہوئے' جب اِقبال گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے اور بھاٹی دروازہ والے مکان میں رہتے تھے)' لکھتے ہیں:۔

"جوانی کی دلچسپیوں میں ایک نہایت قابل یاد دلچسپی اِقبال مرحوم کی دوستی سے پیدا ہوئی۔ جس نے دور تک ساتھ دیا۔ وہ اس وقت کالج میں پروفیسر تھے۔ اُنہوں نے شہر (لاہور) میں میرے پرانے مکان کے قریب ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ ہماری ملاقات تو پہلے ہی ہو چکی تھی شہر کی ہمسائیگی نے ہم نشینی

کے مزید مواقع پیدا کر دیے۔ میں شام کو ان کے ہاں بیٹھتا۔ ان کے دو تین اور دوست عموماً وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان میں ایک تو ان کے اُستاد مولانا میر حسن کے فرزند سید محمد تقی تھے۔ ان کی دوستی پرانے تعلقات پر مبنی تھی۔ سیالکوٹ کے ایک اور صاحب سید بشیر حیدر بھی تھے جو اس وقت طالب علم تھے۔ ایک اور طالب علم سردار عبدالغفور تھے جو "ابو صاحب" کہلاتے تھے۔ یہ سب اِقبال کی شاعری کے مداح تھے۔ میں جاتا تو شعرو سخن کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میں کوئی شعر یا مصرع اِقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا جو طرح کا کام دیتا۔ وہ حقہ پیتے جاتے اور شعر کہے جاتے۔ اَبو صاحب کاغذ اور پنسل لے کر لکھنا شروع کر دیتے۔ اِقبال کے کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح لکھا گیا۔ اَبو صاحب ایک مجلد بیاض میں اپنی پنسلی یاد داشتیں صاف کر کے لکھ لیتے تھے۔ اگر اَبو صاحب کا تیار کیا ہوا مسالہ موجود نہ ہوتا تو ہمارے مرحوم دوست کا بہت سا کلام چھپنے سے رہ جاتا کیونکہ وہ اس زمانے میں اَپنے پاس کوئی مسودہ نہیں رکھتے تھے۔ اب زیادہ شامیں اِقبال کے ہاں صرف ہونے لگیں"۔ (۴)

حکیم احمد شجاع (۱۸۹۶۔۱۹۶۹ء) اپنی یاد داشتوں میں لکھتے ہیں:۔

"گورنمنٹ کالج کے تین طلباء شیخ عبدالغفور (سہواً شیخ لکھا ہے مراد سردار عبدالغفور ہے۔ ناقل) شیخ عبدالرشید اور خواجہ عبدالمجید بھی اِقبال کے شعرو سخن کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اسے اتفاق کہئے یا نیرنگی تقدیر، شعرو سخن کے یہ تینوں دِلدادہ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو پولیس کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور اَپنے دوران ملازمت میں اپنی قابلیت کے ایسے جوہر دکھائے کہ ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں زیادہ انگریز افسروں ہی کے لیے مخصوص تھا۔ اور اس ملک کا کوئی خوش قسمت ہی اس بامِ عروج تک پہنچتا تھا۔

شیخ عبدالغفور (مراد سردار عبدالغفور ۔ م۔۔س) نے اِقبال کے کلام کو پہلے تو جمع کرنے میں اور پھر اسے مرتب کرنے میں اس مستعدی اور لیاقت سے کام لیا کہ میں نے اِقبال کو خود اس امر کا اعتراف کرتے سنا ہے کہ اگر عبدالغفور اتنی محنت نہ کرتا تو "بانگ درا" کبھی مرتب نہ ہو سکتی۔

اِقبال کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے اور دوستوں میں اِنہی دوستوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُنھوں نے ان کا ابتدائی کلام بڑی

کوشش اور محنت سے جمع کیا اور اسے بڑے التزام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ آگے چل کر بڑے کام آیا اور اقبال نے اسی کو پیش نظر رکھ کر "بانگ درا کا مسودہ مرتب کیا"۔ (۵)

سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں:۔

"ابو صاحب یعنی خان بہادر عبدالغفور درانی، گجرات پولیس کے اعلیٰ عہدیدار تھے۔ محمد اقبال کے ساتھ گورنمنٹ کالج میں تعلیم پائی (ابو صاحب ۷ سال جونیئر تھے۔ م۔ س) محمد اقبال کے کلام کے شیدائی۔ محمد اقبال سے ان کی دوستی اور ہم نشینی کی داستان بہت دلچسپ ہوگی۔ ابو صاحب نے شاید بسبب مصروفیت اسے قلمبند نہیں کیا۔ ابو صاحب نے بانگِ درا کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور کیوں نہ لیتے، عبدالقادر نے لکھا ہے، محمد اقبال کا ابتدائی کلام انہی کی کوششوں سے محفوظ رہا اور ہم تک پہنچا۔ اس ابتدائی کلام کو شیخ اعجاز احمد نے بھی آگے چل کر جمع کیا مگر جس زمانے کا عبدالقادر ذکر کرتے ہیں وہ اس زمانے میں ابھی مکتب میں بھی نہیں بیٹھے تھے۔" (۶)

سید عبدالواحد معینی (م۔۱۹۸۰ء) نے ۱۹۵۲ء میں "باقیات اقبال" مرتب کی لکھتے ہیں:۔

"جب انکو اپنے اردو کلام کی اشاعت کا خیال آیا تو علامہ نے اپنے احباب سے کلام جمع کر کے بانگ درا کو مرتب کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک صاحب عبدالغفور صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس نایاب ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرہ سے علامہ کو بانگِ درا کی ترتیب میں بڑی مدد ملی۔" (۷)

جیسا کہ درج بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ ابو صاحب نے بانگ درا کی اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا اور اقبال نے انہی کی بیاض پر انحصار کرتے ہوئے بانگِ درا مرتب کی۔ لیکن اقبال بانگِ درا کی اشاعت سے قبل بھی اس بیاض کو استعمال کرتے آرہے تھے۔ عطیہ بیگم کے نام اپنے ایک خط محررہ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء میں لکھتے ہیں:۔

نظموں کا مجموعہ بخوشی ارسال کروں گا۔ ایک دوست نے میری نظموں کی ایک بیاض ارسال فرمائی ہے۔ کاتب انہیں خوش خط لکھ رہا ہے۔ جب کتابت ختم ہو چکے گی تو نظر ثانی کروں گا۔ جو نظمیں اشاعت کے قابل سمجھی جائیں گی انہیں دوبارہ لکھواؤں گا۔" (۸)

راقم کے خیال میں یہاں دوست سے مراد ابو صاحب ہی ہیں کیونکہ اس دور میں ایسی بیاض صرف انہیں کے پاس تھی۔

آبو صاحب اور اِقبال میں باہم جو محبت اور اُلفت تھی وہ دور رہ کر بھی کم نہ ہوئی' قیام لاہور کے بعد' جب آبو صاحب اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں مثلاً میانوالی سرگودھا' امرتسر وغیرہ میں تعینات رہے تو علامہ سے مسلسل رابطہ رکھا۔

آبو صاحب کی بیاض میں خود علامہ کا درج کردہ کلام بھی تھا۔ اس بیاض سے باقیات اِقبال مرتب کرنے والوں نے بھی استفادہ کیا تھا۔ آبو صاحب کی وفات کے بعد یہ بیاض ان کے صاحبزادے امان اللہ خان کی تحویل میں تھی۔ کہتے ہیں کہ ان سے یہ بیاض راجہ غضنفر علی خان (۱۸۹۵۔ ۱۹۶۳ء) کے پاس چلی گئی تھی جو آبو صاحب کے گہرے دوست تھے۔

شیخ عبدالقادر' مشترک دوست:

شیخ عبدالقادر سے بھی آبو صاحب کو گہرا تعلق تھا۔ جب وہ ۱۹۰۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اِنگلستان گئے تو آبو صاحب کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اِقبال کا تازہ کلام نقل کر کے اُنہیں لندن بھیجتے رہیں۔ کیونکہ اُنہیں علم تھا کہ آبو صاحب سے بہتر کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔

شیخ عبدالقادر' اِقبال کے نام خط محررہ ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء از جہاز مالدیویہ میں لکھتے ہیں

"آبو صاحب کو میرا بہت بہت سلام کہئے اور کہئے کہ میری خاطر اتنی تکلیف کرنا وہ آپنے فرائض میں داخل کر لیں یعنی اِقبال کا تازہ کلام نقل کر کے اُنہیں لندن بھیجتے رہیں۔ اسکا شکریہ میں یوں ادا کروں گا کہ جب اِقبال ولایت میں میرے قبضے میں ہو گا اور آبو اس کے کلام کا منتظر ہو گا تو میں نقلیں بھیجا کروں گا۔ آبو صاحب کا سب سے آگے جا کر کھڑا رہنا اور چلتی گاڑی میں مجھ سے ہاتھ ملانا تادیر یاد رہے گا۔" (۹)

یہی وہ محبت اور خلوص تھا جس کی وجہ سے آبو صاحب نے اِقبال اور شیخ عبدالقادر کے دِل میں گھر کر لیا اور تازیست یہ جذبے سلامت رہے۔

عبدالغفور کی فرمائش پر اِقبال کی شاعری:۔

اِقبال کے مزاج کا یہ حصہ تھا کہ وہ کسی کی فرمائش پر نہ تو شعر کہتے تھے اور نہ سناتے تھے۔ اس سلسلے میں حکیم اجمل خاں اور نواب ذوالفقار علی خاں کے علاوہ یہ اعزاز صرف سردار عبدالغفور کو حاصل ہے کہ اِن کی فرمائش پر اِقبال نے متعدد بار اشعار کہے۔ ایک مرتبہ (غالباً دسمبر ۱۹۰۳ء) عبدالغفور کی درخواست پر اِقبال نے ڈانٹے (۱۰) کے تین اشعار کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔ جو جنوری ۱۹۰۴ء کے "مخزن" میں شائع ہوا تھا۔ (۱۱)

ترجمہ آزڈائک

دِل شمع صفت، عشق سے ہو نور سراپا اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا
نیکی ہو ہر اک فعل میں، نیت کی ہویدا ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہہِ افلاک نہیں ہے
یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے
(اِقبال بفرمائش سردار عبدالغفور خان)

اِقبال۔ اَبو صاحب کے گھر میں:۔

گجرات شہر میں اِقبال کے سسرالی گھر سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر عبدالغفور کا گھر ہے۔ درانی فیملی کا یہ آبائی مکان ہے جو محلہ قصاباں میں مسلم بازار سے متصل واقع ہے۔ اب یہاں اَبو صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالقدیر خاں اور اِن کے اہل خانہ رہتے ہیں۔ گجرات میں خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے بعد یہی وہ مکان ہے جسے سب سے زیادہ بار اِقبال کی قدم بوسی سے اِقبال نصیب ہوا۔ سردار عبدالقدیر خاں اور اِن کی بڑی بہن نے راقم کو بتایا "اِقبال کئی مرتبہ مثلاً ہمارے دادا محمد حیات خاں کی وفات (۴ اپریل ۱۹۰۵ء) اور ہمارے والد کی وفات (۱۶ جنوری ۱۹۲۵ء) وہ تشریف لائے تھے۔ یہ بزرگوں سے سنا ہے۔"

پسندیدہ اُستاد:۔

اِقبال اور عبدالغفور کے درمیان محبت کی ایک اور وجہ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ تھے۔ جو دونوں کے اُستاد تھے اور دونوں کے پسندیدہ اُستاد! ابو صاحب، آرنلڈ کے چہیتے شاگرد تھے۔ ایک تصویر میں وہ آرنلڈ کے بالکل پیچھے کھڑے نظر آتے ہیں۔ آرنلڈ سے اَبو صاحب نے فلسفہ پڑھا اور دیگر تعلیمی معاملات میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے رہے۔ اَبو صاحب آرنلڈ کے اتنے قریب تھے کہ آرنلڈ کی بیگم بھی اَبو صاحب سے بخوبی واقف تھیں۔

سردار عبدالغفور کے نام پروفیسر آرنلڈ کا ایک (غیر مطبوعہ) خط، اِن کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ خط آرنلڈ نے ۸ مارچ ۱۹۰۴ء کو ہندوستان سے بحری جہاز کے ذریعے واپس اِنگلستان جاتے ہوئے لکھا۔ راقم کو یہ خط ڈاکٹر احمد حسین قریشی سے حاصل ہوا ان کے پاس یہ خط اَبو صاحب کی فیملی سے پہنچا تھا۔ اس کا عکس صفحہ ۳۷۹ پر دیا گیا ہے۔

off aden

Mar, 8th

My dear Abdul Ghafoor Khan.

I hope that the enclosed testimonial will meet your wishes. I have not gone into details about your family , as their distinguished services already so well known and can be attested by separate documents.

I write with great difficulty as the ship is rolling about so much. I shall always be glad to hear from you and shall watch your career with interest.

I hope that you will get through your B.A. exam well and soon obtain the Government service you desire. Mrs. Arnold joins me in kind wishes. We have had a good journey so far, but it is getting hotter, the nearer we approach Arabia.

والسلام

Your's Sincerely

T.W. Arnold

P.S.

My congratulations upon your marriage which I hope will be attended with all happiness and blessings.

والسلام

خان بہادر چودھری خوشی محمد ناظرؔ

"جوگی" جیسی مشہور نظم کے خالق چودھری خوشی محمد ناظر اگست ۱۸۶۹ء میں گجرات شہر سے دو کلو میٹر جنوب میں واقع گاؤں ہریہ والا میں چودھری مولا داد خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری سکول میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول گجرات میں حاصل کی۔ میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں دوسرے نمبر پر رہے۔ سکول کے زمانہ (۱۸۸۱ء) میں ہی غوث الاعظمؒ کی مدح لکھ کر شاعری کی ابتداء کی۔

۱۸۸۹ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ فارسی اور انگریزی میں آنرز کا امتیاز حاصل کیا اور بی۔اے میں الہ آباد یونیورسٹی کے مسلمان طلباء میں اول رہے۔ علی گڑھ میں بھی اول رہے اور طلائی تمغے حاصل کیے۔

سکول کے زمانے میں ناظر کو مولوی نورالدین انور اور شیخ غلام محمد جیسے باکمال اُستاد ملے جنہوں نے ناظر کے اَدبی ذوق کو جلا بخشی۔ علی گڑھ میں داخلے کے وقت ناظر کو انکے اُستاد شیخ غلام محمد نے سرسید احمد خاں سے متعارف کرایا۔ سرسید کی شخصیت اور علی گڑھ کے علم پرور ماحول نے ناظر کے طبعی شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا اور وہ جلد ہی علمی و اَدبی حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ سرسید نیچری شاعری کے حامی تھے' مسٹر آرنلڈ (۱۸۶۴ء-۱۹۳۰ء) اسکی ترغیب و تربیت میں خاص دِلچسپی لیتے تھے۔ اُنہوں نے اِنعامی نظم گوئی کا سلسلہ شروع کیا تو ناظر کالج کے طلباء کے "ملک الشعراء" قرار پائے۔ "اخوت" اور "چار موسم" اسی دور کی یادگار ہیں۔ اسی زمانہ میں ناظر نے مولانا حالی سے سلسلہ تلمذ قائم کیا۔

علی گڑھ کے بعد ناظر اعلیٰ تعلیم کے لیے اِنگلستان جانا چاہتے تھے۔ اس لیے کوئی مستقل ملازمت اختیار نہ کی اور پنجاب میں تحصیلداری کے موقع سے بھی فائدہ نہ اٹھایا۔ چند سال یکے بعد دیگرے نواب ناہن سرمور' نواب لوہارو اور سپرنٹنڈنٹ مالیرکوٹلہ کے سیکریٹری رہے۔ ۱۸۹۹ء میں جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند بن کر لاہور آیا تو ناظر ایچی سن کالج میں تعینات تھے۔ ۱۹۰۱ء میں خان بہادر غلام احمد خاں ریونیو منسٹر کشمیر نے اُنہیں اپنا پرسنل اسسٹنٹ بنا لیا اور یوں ناظر ولایت جاتے جاتے کشمیر جنت نظیر کے ہو گئے۔ کشمیر میں اُنہوں نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بدولت بہت ترقی کی اور ریونیو منسٹر اور پبلک منسٹر کے عہدہ جلیلہ تک پہنچے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک کشمیر میں رہے پھر لداخ چلے گئے جہاں وہ افسر بندوبست تھے۔ دوبارہ کشمیر میں آئے اور ۱۹۲۴ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبکدوش

ہوئے۔

ملازمت کے اختتام پر ناظر رامپور چلے گئے جہاں نواب حامد علی خاں نے اُنہیں پانچ گاؤں آبادی کے لیے عطا کر رکھے تھے۔ پانچ سال وہاں رہنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں چک نمبر ۱۵۸ رکھ برانچ چک جھمرہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں رہائش اختیار کی جہاں ان کی اراضی تھی۔ انگریز سرکار نے ان کی اِنتظامی اور علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر اُنہیں "خان بہادر" کا خطاب دیا۔

چک نمبر۱۵۸ میں قیام کے دوران ناظر گرمیوں میں کشمیر چلے جاتے اور گزرے سمے کی سندر یادوں سے اَپنے بڑھاپے کی بے کیف سنجیدگی کو کم کرتے۔ سری نگر میں ایسے ہی ایک قیام کے دوران یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو عالم فانی سے کوچ کر گئے اور کشمیر سے ان کی محبت نے وہاں کی مٹی کو مجبور کر دیا کہ وہ اُنہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ ان کی قبر گگری بل سری نگر میں ہے۔

خوشی محمد ناظر اَپنے دور کے ممتاز ترین شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی (۱۸۶۶۔۱۹۵۵ء) نے پنجاب کے جن تین صاحب قلم حضرات کو اُردو زبان کا محسن قرار دیا ہے اِن میں اِقبال اور ظفر علی خان کے علاوہ تیسری شخصیت ناظر ہیں۔ (۱۲)

ناظر کا کلام "نغمہ فردوس" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۹۳۷ء میں جبکہ دوسری جلد ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۷۱ء میں دونوں جلدوں کو باریک ٹائپ میں یکجا شائع کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں دونوں جلدوں سے منتخب کلام قدیر شیدائی نے شائع کیا ہے۔ (۱۳)

اِقبال اور ناظر

ارکانِ مشیّدہ:۔

اِقبال کثیر الاحباب ہستی تھے۔ بیسیوں افراد کی ان سے دوستی اور سیکڑوں کی راہ ورسم تھی۔ مگر ناظر ان محفل کے "ارکان مشیدہ" میں سے تھے۔ اِقبال اَپنے ایک اور قریبی دوست حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام ایک خط محررہ ۲۵ مئی ۱۹۰۳ء میں لکھتے ہیں۔

"میر نیرنگ تشریف لائے تھے، چوہدری خوشی محمد تھے، مولانا گرامی بھی تھے۔ غرضیکہ محفلِ اَحباب کے سب ارکانِ مشیدہ موجود تھے" (۱۴)

مندرجہ بالا تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء تک ناظر اور اِقبال ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے اور ناظر اِقبال کی بے تکلف دوستوں میں شامل ہو چکے تھے۔ گویا ان کی ملاقات بہت پہلے ہو چکی تھی۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:۔

"ناظر سے محمد اِقبال کی ملاقات کب ہوئی یہ معلوم نہیں، لیکن ناظر کا شمار بہت جلد اس حلقے میں ہونے لگا جو مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور میر ناظر اور پھر آگے چل کر "مخزن" کی بدولت لاہور میں قائم ہوا۔ جس میں آزاد اور حالی کی کوششوں کا بھی دخل ہے۔ جیسے بازار حکیماں کی محفلوں، انجمن حمایت اسلام کے جلسوں اور آگے چل کر "مخزن" کو بھی۔ ناظر کا کلام مخزن میں چھپتا۔ میاں شاہدین سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ چنانچہ میاں صاحب ہی کی ایک نظم ہے جو اکتوبر ۱۹۰۱ء میں "مخزن" میں شائع ہوئی (۱۵) گمان ہوتا ہے کہ محمد اِقبال کی شاید اس سے بہت پہلے ناظر سے ملاقات ہو چکی تھی، ان سے ادبی روابط قائم تھے۔ میاں صاحب کہتے ہیں۔

اعجاز دیکھ تو سہی یہاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
اِقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
ناظر کمان فکر سے مار ایک دو خدنگ
از نغمہ ہائے دِلکش ایں چار یارِ ما
پنجاب خوش نوا است ہمایوں دیار ما" (۱۶)

ناظر اور اِقبال کی پہلی ملاقات غالباً ۱۸۹۸ء میں ہوئی جب ناظر نواب ممدوٹ کے اتالیق تھے اور ان کا قیام ایچسن کالج میں تھا۔ فرصت کا یہ زمانہ اُنہوں نے عربی اور فارسی زبان و ادب کے مطالعہ پر صرف کیا اور لاہور کی علمی، ادبی اور سماجی مجالس میں اپنے دِلکش کلام سے ایک معزز مقام پیدا کیا۔ بقول شیخ عبدالقادر (۱۷) "وہ شریف، خلیق اور ملنسار تھے۔ چنانچہ ان کے لیے ایسی مجالس میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور حالی کے شاگرد تھے اور اِقبال سے پہلے لاہور کے ادبی و علمی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے۔"

'مخزن' کے پہلے شمارے (اپریل ۱۹۰۱ء) میں اِقبال، میر نیرنگ اور خوشی محمد ناظر کا کلام شائع ہوا۔ اور یہ تینوں نام مخزن کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہو گئے۔ یوں مخزن بھی اِن دوستوں کو یکجا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔

ناظر نے ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کے بعد چند سال گجرات میں گزارے' جہاں اُنھوں نے باذوق دوستوں کی ایک مجلس اَدب بنا رکھی تھی۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ شادی کے بعد اِقبال جب گجرات آتے تھے تو اس مجلس میں ناظر سے ملاقات ہوئی اور مراسم بڑھے۔

اَنجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں:۔

اس دور میں اَنجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں ہندوستان بھر سے نامور شعراء شرکت کرتے اور اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ جسٹس (ریٹائرڈ) سجاد احمد جان (م۔۱۹۸۶ء) اَنجمن کی اَدبی خدمات کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "یہ بات ناقابل فراموش ہے کہ اَنجمن کے پلیٹ فارم سے ہی اَنجمن کے سالانہ جلسوں میں مولانا حالی' اَکبر الہ آبادی' چودہری خوشی محمد ناظر' سائل دہلوی' سیماب اَکبر آبادی مولانا ظفر علی خاںؒ اور علامہ اِقبال جیسے بلند پایہ شعراء نے اپنا حیات افروز کلام سنا کر ملت اسلامیہ کے دِل میں زِندگی کا نیا جذبہ پیدا کیا اور اسے سیرت و کردار کی تفسیر کا درس دیا"۔ (۱۸)

اِقبال نے اپنی بہت سی شہرہ آفاق نظمیں (۱۹) اَنجمن کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں۔ اور ناظر نے بھی اپنا بہت سا کلام اسی پلیٹ فارم سے پیش کیا اور خود کو نامور قومی شعراء کی صف میں شامل کروا لیا۔ (۲۰) اِقبال کی شہرت دیکھ کر بہت سے شعراء نے ان کی تقلید میں قومی اور ملی موضوعات پر نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں لیکن ناظر اِقبال سے قبل بھی قومی موضوعات پر لکھتے رہے تھے۔ کیونکہ قیام علی گڑھ اور وہاں سرسید' حالی اور ان کے دیگر رفقائے کار نے ناظر کے دِل میں یہ احساس بیدار کر دیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ میں طالب علمی کے دور میں بھی' جہاں ناظر طلباء کے "ملک الشعراء" تھے' ان کی نظموں میں قوم کا درد اور احساس زیاں کا پرتو ملتا ہے۔ اَنجمن حمایت اسلام کے جلسے مسلمانان ہند کے علمی و اَدبی ذوق کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ناظر' کشمیر' لداخ اور رام پور سے آ کر اِن جلسوں میں شریک ہوتے۔ آخری عمر میں جب وہ چک جھمرہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد رہائش پذیر تھے' تو باقاعدگی سے اَنجمن کے جلسوں میں شرکت کرتے' پرانے دوستوں سے ملتے اور گزرے سمے کی محفلوں کا ایک بار پھر لطف اٹھاتے' ناظر' "نغمہ فردوس" میں اِنہی محفلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ہوا زندہ دِل نامِ پنجاب جن سے — وہ دِل آ کے دیکھیں زباں آ کے دیکھیں
نگاہیں ترستی ہیں جن صورتوں کو — اُنہیں جلوہ فرما' یہاں آ کے دیکھیں
وہ اعیانِ پنجاب کی اَنجمن میں — مشاہیرِ ہندوستاں آ کے دیکھیں

شریعت کے دیکھیں وہ تابندہ اختر　　فصاحت کے معجز بیاں آ کے دیکھیں
وہ ناظر کہ اک پیرِ خلوت گزیں ہے　　اسے انجمن میں جواں آ کے دیکھیں (۲۱)

"تنقیدِ ہمدرد" کا جواب:۔

اِقبال ناظر کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے اور اُنہیں "حضرت ناظر" کہتے تھے' وہ ذاتی سطح پر تو دوست تھے ہی' اَدبی میدان میں بھی ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ ۱۹۰۲ء میں ایک اخبار میں "تنقید ہمدرد" کے عنوان سے اِقبال اور ناظر کے کلام پر زبان وفن کی بنیاد پر بہت سے اعتراضات کیے گئے۔ جواب میں اِقبال نے "اُردو زبان پنجاب میں" کے عنوان سے ایک دندان شکن مضمون لکھا اور اَپنے اور ناظر کے کلام پر تنقید کو نہایت مدلل اور مستند انداز سے رد کر دیا۔ یہ مضمون اکتوبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" میں شائع ہوا۔ مضمون کے شروع میں علامہ نے لکھا۔

"ایک صاحب "تنقیدِ ہمدرد" جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اَپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ناظر و اِقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اڑاتے ہیں" (۲۲)

آگے جا کر لکھتے ہیں:۔

"اس مضمون کا مقصد صرف ان اعتراضات کا جواب دینا ہے جو "تنقیدِ ہمدرد" صاحب نے میرے اور ناظر کے اشعار پر کیے ہیں۔ میں نے یہ جواب اس وجہ سے نہیں لکھا کہ صاحب تنقید نے میرے یا میرے دوست حضرت ناظر کے کلام کو اپنی نکتہ چینی کا آماجگاہ بنایا ہے بلکہ میری غرض صرف یہی ہے کہ ایک منصف مزاج پنجابی کی حیثیت سے اِن غلطیوں کا ازالہ کروں جو عدم تحقیق کی وجہ سے اہل پنجاب کی اُردو کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اگرچہ "تنقیدِ ہمدرد" صاحب نے بالخصوص حضرتِ ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دلآزار الفاظ استعمال کیے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کرونگا کیونکہ فن کا پہلا اصول یہی ہے کہ اسکا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو تنقید کی بنا دوستی' محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہیے نہ یہ کہ مضمون تو آپنے خیال میں ازراہِ دوستی لکھیں اور طرز بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں'

مے مخور چنداں کہ نشناسد زگل گلچیں ترا

پاسبانِ حسن پاک خویشتن بودن خوش است

حضرتِ ناظر کے کلام پر جو اعتراض "تنقیدِ ہمدرد" صاحب نے کیے ہیں ان کا جواب انبالوی صاحب نے شافی طور پر دے دیا ہے......(۲۳)

مضمون کے آخر میں لکھا:۔

"مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے' اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرتِ ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گزار وادی ہے کہ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے' قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائیگی کے' شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں ورنہ مجھے زباندانی کا دعوی ہے نہ شاعری کا۔ راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں' (۲۴)

نیم من درشمارِ بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستاں قفس مشت پرے دارم"

اَنجمن مفرح القلوب:۔

کشمیر میں منشی سراج الدین احمد (میر منشی ریزیڈنسی کشمیر) اور ناظر نے کچھ اور دوستوں کے ساتھ مل کر "اَنجمن مفرح القلوب" کے نام سے ایک اَدبی اور ثقافتی مجلس قائم کر رکھی تھی' جس میں ریزیڈنسی اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار مسلمان شامل تھے۔ منشی صاحب اور ناظر اس اَنجمن کے روح رواں تھے۔ دیگر ارکان میں صادق علی صادق' نورالدین عنبر' اور مرزا مبارک بیگ شامل تھے۔ ناظر لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں ہم نے چند اَدب دوست اَحباب کی ایک لیمیٹڈ کمپنی یا اَنجمن بنا رکھی تھی۔ جس کا نام "اَنجمن مفرح القلوب" تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک یہ اَنجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی" (۲۵)

اس اَنجمن کے تحت اَحباب کی محفلیں جمتیں' شعروسخن اور موسیقی کا بازار گرم ہوتا۔ ہر اتوار کو باغوں اور ڈل کی با جماعت سیر ہوتی اور صاحبان ذوق کی یہ جماعت اَحباب کی ہمراہی اور فطرت کے حسن سے لطف اندوز ہوتی۔ ناظر کی اکثر شاہکار نظمیں جیسے "جوگی"' "پانی میں"' "ملمودری"' "کانگڑی"' اسی دور کی یادگار ہیں جسے ناظر نے "عہدِ مفرح" کا نام دیا ہے۔

منشی سراج الدین احمد بھی اِقبال کے نہایت مخلص دوست تھے۔ اُنہوں نے اور ناظر نے

متعدد بار اِقبال کو اس محفل یاراں میں شریک ہونے اور کشمیر جنت نظیر کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دی مگر اِقبال شدید خواہش کے باوجود اس دور میں کشمیر نہ جا سکے۔ وہ سفر سے کتراتے تھے اس لیے دوستوں کا ساتھ نہ دے پاتے تھے۔ جسٹس شاہدین ہمایوں جو اِقبال اور ناظر کے بے تکلف دوست تھے اور اکثر انجمن مفرح القلوب کی رونقوں میں شریک ہوتے تھے اپنی نظم بعنوان "شالامار" (مطبوعہ "مخزن" بابت جون ۱۹۰۳ء) میں ناظر کو مخاطب کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں '

ناظر! بڑا مزہ ہو جو اِقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

یہاں شیخ سے مراد شیخ عبدالقادر ہیں جو اس "چار یاری" کے چوتھے رکن تھے۔

اِقبال کشمیر میں:۔

آخر جون ۱۹۲۱ء میں اِقبال زِندگی میں پہلی بار کشمیر گئے۔ یہ دورہ ایک مقدمہ کے سلسلے میں تھا اور منشی طاہرالدین اور مولوی احمد دین ایڈووکیٹ اِقبال کے ہمراہ تھے۔ اِقبال تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں ٹھہرے۔ اور ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ قانونی موشگافیوں سے فراغت کے بعد شکارے میں بیٹھ کر جھیل ڈل کی سیر کو جاتے تھے۔ احباب کے ہمراہ نشاط باغ اور شالامار باغ میں وقت گزارتے۔ نظم "ساقی نامہ" جو بعد میں "پیام مشرق" کی زینت بنی اِقبال نے نشاط باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ ایک شام شکارے میں بیٹھے ڈل کی سیر سے واپس آ رہے تھے' صاحبزادہ محمد عمر' اِن کے ہمراہ تھے وہ لکھتے ہیں۔ (۲۶)

"دونوں وقت مل رہے تھے کہ شکارہ (ہلکی کشتی) اس انجمن ادب کو لیے ڈل میں پہنچ گیا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا' شفق پھولی ہوئی تھی اور اس منظر کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں شرر افشانی کر رہا تھا۔ اس کیف آور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ جس نے علامہ ممدوح کے دِل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفہ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو درِ شہوار نکال لائے۔ نقاش فطرت کی قدرت دیکھنا! دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے۔

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام ... دِید شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر ... زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب"

ناظر نے اس سے بہت پہلے 'ڈل' کے حسن سے متاثر ہو کر اپنی مشہور نظم "پانی میں" لکھی تھی

اس کے چند شعر دیکھئے۔ (۲۷)

آبِ ڈل حسن و لطافت میں ہے گر آبِ حیات
صورتِ خضر ہے ہر شاخ سمن پانی میں
بزمِ ناظر کی بھی مستانہ نوائیں سن کر
رقص کرتے تھے کبھی اہلِ سخن پانی میں
مغتنم صحبتِ احباب ہے ڈل میں ناظر
غرق کر کشتی افکار و محن پانی میں

اِقبال نے گو مناظر فطرت پر بھی نظمیں لکھیں لیکن ان کا اصل میدان یہ نہ تھا۔ ناظر نے دیگر موضوعات پر بھی لکھا لیکن ان کی شہرت' مناظر فطرت پر لکھی ہوئی نظموں سے ہوئی۔ مثلاً "پانی میں"' "کانگڑی"' "چنار"' "لمووری"' "جوگی"' وغیرہ۔ آپنے ایک شعر میں ناظر اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

فلسفے کی وادیوں میں کر تلاش اِقبال کی
ناظرِ گم گشتہ کو قدرت کے نظاروں میں دیکھ

باہمی خط و کتابت:۔

ناظر اور اِقبال کی باہمی خط و کتابت بھی رہی۔ مگر افسوس اِقبال کے خطوط بنام ناظر دست برد زمانہ کی زد میں آگئے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ ناظر نے اپنی سوانح بھی لکھی تھی (۲۸) مگر اس کا انجام بھی یہی ہوا۔ اگر یہ دونوں دستاویزات محفوظ ہوتیں تو کس قدر قیمتی معلومات کا خزانہ ہوتیں! ناظر' اِقبال کے ان دوستوں میں شامل تھے' جنہیں وہ آپنے اور آپنے دیگر احباب کے کسی کام کے لیے کہتے عار محسوس نہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں علامہ کے گہرے دوست مولانا گرامی نے آپنے ایک دوست سید صفدر علی شاہ کے کسی کام کے لیے اِقبال سے کہا۔ علامہ نے کئی دوستوں سے رجوع کیا مگر کام نہ ہو سکا۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں ناظر کو بھی لکھا مگر ان کی کوشش بھی بے سود رہی اِقبال' گرامی کو لکھتے ہیں۔

"کشمیر میں چودھری خوشی محمد کو لکھا تھا' وہاں سے بھی مایوسی ہوئی۔ یہ خط چودھری صاحب کا ہے' شاہ صاحب کو دے دیجئے" (۲۹)

گو کام نہ ہو سکا' مگر چودھری صاحب نے اپنی پوری کوشش کی ہو گی۔ کام کی نوعیت کے متعلق خود اِقبال سے سنئے:

"افسوس ہے کہ سید صفدر علی شاہ صاحب کا کام نہ ہو سکا..... ایک تو معاملہ ہی

ایسا تھا کہ جس میں کم از کم مجھے توقع کامیابی کی نہ تھی۔ دوسرا وہ معاملہ ایسے لوگوں سے تھا جن سے مسلمانوں کو زمانہ حال میں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے شر سے ہی محفوظ رکھے تو غنیمت سمجھنا چاہیے" (۳۰)

مشترک دوست:۔

اقبال کے بہت سارے مخلص دوستوں مثلاً سر شیخ عبدالقادر' سر راس مسعود' مولانا حالی' منشی سراج الدین احمد' منشی محمد الدین فوق' صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' نواب حبیب الرحمن شروانی' میاں سر فضل حسین' جسٹس شاہدین ہمایوں' میاں شاہ نواز' سردار عبدالغفور درانی' میر غلام بھیک نیرنگ اور مولانا گرامی سے ناظر کے بھی دوستانہ مراسم تھے۔

سفارشی خط:۔

چودہری خوشی محمد ناظر' اقبال کے ان دوستوں میں سے تھے جن کا اخلاص اور عقیدت مثالی تھی۔ اور یہ جذبہ اقبال کی زندگی تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ ان کے بعد بھی اس کا اظہار ہوتا رہا۔ ۱۹۳۹ء میں علامہ کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال کو ملازمت کے حصول میں دشواری کا سامنا تھا۔ اقبال کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کی نظر اس سلسلے میں مدد کے لیے' اقبال کے جس دوست پر پڑی' وہ چودہری خوشی محمد تھے۔ چودھری صاحب ان دنوں چک جھمرہ میں رہائش پذیر تھے لیکن گرمیاں گزارنے کے لیے کشمیر گئے ہوئے تھے۔ شیخ عطا محمد ان کے پاس گئے اور ان سے مسئلہ بیان کیا۔ چودہری صاحب نے ایک خط لکھ کر شیخ صاحب کو دیا جس میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سرکردہ اصحاب نواب مظفر خان' نواب نثار علی خان وغیرہم سے علامہ اقبال کی حیثیت اور انجمن کی طویل عرصہ خدمت کے اعتراف کے طور پر ان کے صاحبزادے آفتاب اقبال کو اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت دینے کی بھرپور سفارش کی گئی تھی۔ شیخ عطا محمد نے ۲۵ جون ۱۹۳۹ء کو یہ خط آفتاب اقبال کے نام ارسال کیا اور ایسی ہی کوششوں اور آفتاب کی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں اسلامیہ کالج میں شعبہ انگریزی کے صدر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ (۳۱)

فکری ہم آہنگی:۔

ذاتی مراسم کے علاوہ' اقبال اور ناظر کے کلام میں جا بجا ہمیں دونوں میں فکری ہم آہنگی اور نظریاتی قربت نظر آتی ہے۔ سید عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ "ناظر کے اسلوب نظم گوئی کا

اثر اقبال پر بہت گہرا ہوا ہے" (گجرات میں اردو شاعری ص ۵۷)۔ تاہم چند ایک مقامات پر یوں لگتا ہے جیسے ناظر نے دانستہ اِقبال کی تقلید کی کوشش کی ہے۔ مگر ناظر نے کلیتہً اِقبال کا رنگ اپنانے کی بجائے اپنی الگ پہچان قائم رکھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔ (۳۲)

ترے در پہ خالقِ ذوالمنن جو مری جبینِ نیاز ہو
مجھے بے کسی پہ غرور ہو' مجھے بے نوائی پہ ناز ہو
مجھے سوزِ عشق کا ساز دے' مجھے دردِ زہرہ گداز دے
مری مثل شمع کے آبرو' یہی میرا سوز و گداز ہو
ہو شہود شاہدِ راز کا' یہ مٹے طلسم مجاز کا
کبھی اے حقیقتِ مستتر ترے رخ سے پردہ جو باز ہو

ایک اور جگہ کہتے ہیں:۔

ہوا و حرص سے ناظر رہے جو پاک نظر
تو ہمسری نہ حقیقت کی کیوں مجاز کرے

صدرِ مجلس حضرت اِقبال:۔

ناظر کے کلام میں سنجیدہ آہنگ کی کثرت ہے۔ تاہم نغمۂ فردوس کی جلد اول میں اُنھوں نے "مثنوی ہیر رانجھا" کے عنوان سے ایک ہلکی پھلکی نظم لکھی ہے اور اس میں اِقبال کو بھی ایک کردار سونپا ہے۔ اس دلچسپ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ (۳۳)

دیکھ کر رسم و رہ دورِ زمن — عاشقوں نے اک بنائی انجمن
صدرِ مجلس حضرتِ اِقبال تھے — جو غمِ اُلفت سے مالا مال تھے
سر گروہِ حلقۂ احرارِ عشق — منکشف جن پر ہوئے اسرارِ عشق
عشق کا حضرت نے احیا کر دیا — عشق کے کشتوں کو زندہ کر دیا

شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی

حکیم الامت کے نبض شناس حکیم محمد حسن قرشی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اقبال کا معالج ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے نہایت مخلص اور قریبی دوست کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

محمد حسن ۱۸۹۶ء میں گجرات شہر کے محلہ خواجگان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی فضل الدین اپنے دور کے نامور علماء میں سے تھے۔ وہ مفتی صدر الدین آزردہ (۱۷۸۹۔۱۸۶۸ء) کے تلمیذ تھے۔ وہ شاعر' ادیب اور صوفی باعمل تھے۔ دربار کابل سے منسلک رہے ریاست کشمیر میں محکمہ تاریخ میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ "اجوبۃ السائلین" اور "انوار نعمانیہ" کے مصنف تھے۔ محمد حسن نے ابتدائی تعلیم گجرات میں حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں لاہور آئے۔ کچھ عرصہ مدرسہ نعمانیہ میں زیر تعلیم رہے۔ پھر اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ مگر کالج کی تعلیم بوجوہ جاری نہ رکھ سکے اور طب کی طرف آ گئے۔ حکیم حاذق اور زبدۃ الحکماء کے امتحانات طبیہ کالج دھلی سے پاس کئے جہاں آپ کو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کی خاص توجہ حاصل رہی اور اُن سے اکتساب فیض کا بھرپور موقع ملا۔ دوران تعلیم آپ نے علاؤالدین قرشی کی ایک فارسی کتاب طب کا اُردو ترجمہ کیا۔ حکیم محمد اجمل یہ ترجمہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ اور آپ کو "قرشی" کا خطاب دیا۔ جو حکیم محمد حسن اور ان کی نسل کی پہچان بن گیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد طبیہ کالج دہلی سے بطور مدرس وابستہ ہو گئے پھر بمبئی کے طبیہ کالج کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور آ گئے اور دل محمد روڈ پر اپنا مطب قائم کیا۔ ۱۹۲۶ء میں طبیہ کالج لاہور کے پہلے باقاعدہ پرنسپل مقرر ہوئے۔ اِسی دور میں قرشی صاحب نے پنجاب میں اطباء کی تنظیم کی جانب خاص توجہ دی۔ وہ پنجاب طبی کانفرنس کے بانی صدر تھے۔ آل اِنڈیا آیورویدک و یونانی طبی کانفرنس کے جلسوں کی صدارت بھی کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد قرشی صاحب نے پاکستان طبی کانفرنس کی تاسیس کی۔ حکومت کے قائم کردہ طبی بورڈ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۵ء کے صدر مقرر ہوئے۔

طبِ یونانی کی پاکستان میں بقاء کی جدوجہد' قرشی صاحب کی جدوجہد کی داستان ہے۔ طب پر متعدد بیش قیمت کتب تصنیف کیں' بہت سی عربی' فارسی کتب طب کے تراجم کئے۔ حکیم صاحب کی لکھی ہوئی کتب سے بہت سے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھ گیا اور حکمت ایک راز سے ایک علم میں بدل گئی۔ انکی اہم کتب میں طبی فارما کوپیا' جامع الحکمت' سلک

مروارید' مطب قرشی' کتاب الکلیات' دستور الاطباء' بیاضِ مسیحا شامل ہیں۔ حکیم قرشی نے طب کے احیاء اور ترقی کیلئے باقاعدہ ایک جنگ لڑی۔ حکومت انگریز کی ہو یا اپنوں کی طب یونانی کے خلاف ہر یورش کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ قیادت کی خوبیوں سے بھی مالا مال تھے اور خداداد تنظیمی صلاحیتوں سے بھی۔ حق گوئی و بیباکی' بلند مقصد' دلنوازی' پرسوزی جان' غرضیکہ میرکارواں کی سبھی خوبیوں کا مرقع تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حکیم اجمل خان نے اپنی خرابی صحت کے انتہائی زمانے میں فرمایا تھا۔

"اطباء پریشاں نہ ہوں میرے بعد طبی قافلے کی رہنمائی حکیم محمد حسن قرشی کریں گے"

طب میں حکیم قرشی کی گرانقدر خدمات کے علاوہ انکی قومی خدمات کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی تحریک خلافت' تحریک پاکستان اور تحریک اتحادِ اسلامی۔

قرشی صاحب تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے۔ علی برادران سے خصوصی مراسم تھے۔ لاہور خلافت کمیٹی کے نائب صدر رہے۔ تحریک پاکستان میں صف اول میں رہے ۱۹۴۶ء میں ان کا نام مسلم لیگ کے ڈکٹیٹر کے طور پر تجویز ہوا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے نائب صدر بھی رہے قیام پاکستان کے بعد جہاد کشمیر میں پیش پیش تھے۔ اُنہوں نے خود محاذ کشمیر کا دورہ کیا اور مجاہدین کا حوصلہ بڑھایا۔ کشمیری مہاجرین کی خدمت میں بھی نہایت سرگرمی سے شامل رہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد حکیم صاحب کی توجہ کا اصل مرکز تحریک اتحادِ اسلامی تھا۔ وہ پاکستان میں موتمر عالم اِسلامی کے صدر رہے۔ ان کی قیادت میں لاہور اتحاد عالم اِسلام کا مرکز بن گیا تھا۔ مفتی اعظم فلسطین' مفتی اعظم شام' مفتی اعظم تاشقند اور بہت سے دیگر اکابرین لاہور تشریف لائے اور بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ ۱۹۵۶ء میں حکیم صاحب نے حج کی سعادت حاصل کی اور شاہ عبدالعزیز بن السعود کے مہمان رہے۔ ۱۹۶۲ء میں موتمر کے اجلاس بغداد میں شرکت کی اور بلاد مقدسہ کا دورہ کیا۔

حکیم قرشی کے شخصیت کی ایک اور نمایاں خصوصیت عشق رسول تھی۔ قرآن سے والہانہ عشق تھا اور طبیعت میں استغناء اور درویشی نمایاں تھی آپنے حسن اخلاق سے مریضوں کو بہت جلد اپنا گرویدہ کرلیتے تھے بقول حفیظ جالندھری (۱۹۰۰۔ ۱۹۸۲ء)

"شفاء الملک محض جسمانی عوارض دور کرنے کے طبیب نہ تھے۔ وہ جسمانی عوارض کیلئے ادویہ دیتے لیکن ساتھ ہی جسمانی دکھوں کی بہت سی جڑیں ذہنی طور پر معلوم کرلیتے اور اپنی محبت اور خوش گفتاری سے مریض کے ذہن کو جسمانی آسودگی کے ساتھ روحانی توانائی سے بھی بھر دیتے۔" (۳۴)

حکیم محمد حسن قرشی نے ایک بڑے مقصد کو سامنے رکھ کر مومنانہ زِندگی بسر کی اور آخر یہ جامع الکمالات ہستی ۶ دسمبر ۱۹۷۴ء کو اَپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ قبرستان میانی صاحب (لاہور) میں آپ کی آخری آرامگاہ بنی۔ (۳۵)

اِقبالؒ اور قرشی

"میرا علاج یہی ہے کہ حکیم صاحب میرے پاس بیٹھے رہیں"۔ اِقبال۔

اِقبال سے عقیدت رکھنے والا ہر شخص حکیم محمد حسن قرشی کو بھی احترام سے یاد کرتا ہے اور اِسکی وجہ وہ خلوص ' تندہی اور خدمت ہے جو حکیم صاحب نے اِقبال کے حضور ایک دوست اور ایک معالج کی حیثیت سے پیش کی۔

حکیم صاحب نے اپریل ۱۹۱۱ء(۳۶) کی ایک سہ پہر کو پہلے پہل حضرت علامہ کو اَنجمن حمایت اِسلام لاہور کے جلسہ میں دیکھا جب وہ اپنی نظم "شکوہ" سنا رہے تھے۔ حکیم صاحب تب فورتھ ہائی کے طالبعلم تھے اور اِقبال کو سننے کیلئے خصوصی طور پر گجرات سے آئے تھے میٹرک کے بعد وہ لاہور آگئے اور اِقبال کو سننے کیلئے تواتر سے جلسوں میں شرکت کرتے رہتے اور یہ سلسلہ اُن کے قیام دہلی اور بمبئی کے دوران بھی جاری رہا۔

۱۹۲۸ء میں قرشی صاحب کی علامہ سے باقاعدہ ملاقات ہوئی جس میں طب یونانی کی خصوصیات اور افادیت پر طویل گفتگو ہوئی۔ اِس کے بعد ۱۹۳۵ء تک گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی۔ والدہ جاوید کی بیماری میں بھی ایک دفعہ علامہ نے اُنہیں طلب فرمایا ' پھر جب علامہ کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تو قرشی صاحب سے کبھی کبھار مشورہ کیا جاتا۔ کبھی وہ خود جاوید منزل حاضری دیتے اور بیماری ' غذا ' پرہیز ' علاج پر گفتگو ہوتی اور پھر اَدبی ' سیاسی اور مذہبی امور زیر بحث آتے۔ آہستہ آہستہ مریض اور معالج کا تعلق دوستی کے پرخلوص رشتے میں بدل گیا اور اِقبال کو حکیم قرشی کی ذات سے کچھ ایسا لگاؤ ہوگیا کہ کہا کرتے ' میرا علاج صرف یہی ہے کہ حکیم صاحب میرے پاس بیٹھے رہیں۔" علامہ کی وفات سے پانچ چھ ماہ قبل ' قرشی صاحب روزانہ جاوید منزل حاضری دیتے وہ خود لکھتے ہیں۔

"اِس عرصہ میں مجھے روزانہ حاضری کا اتفاق ہوتا رہا۔ اگر کسی وجہ سے تاخیر ہو جاتی تو سید نذیر نیازی صاحب یا میاں محمد شفیع صاحب یا میاں علی بخش کو بھیج دیتے۔ میں اکثر رات کو آٹھ نو بجے جاتا اور گیارہ بجے تک وہیں ٹھہرتا۔ بعض اوقات شام کو سات بجے اِس خیال سے جاتا کہ نو بجے واپس آجاؤں گا مگر پھر بھی گیارہ بجے تک ٹھہرا لیتے۔ شام کے علاوہ کبھی کبھی میں صبح کو سیر کرتے

ہوئے چلا جاتا تھا۔ بعض اوقات رات کو تکلیف ہوتی تو صبح پانچ بجے ہی شفیع
صاحب کو بھیج دیتے تھے۔ اکثر مجھے جگا کر ساتھ لے جاتے۔ کبھی وہ دو تین بجے
دِن کو بھی یاد فرما لیتے تھے۔ مگر ایسا عموماً کم ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا
کہ میں نے اضطراب سا محسوس کیا اور اِسی وقت چلا گیا اور جا کر دیکھا تو ڈاکٹر
صاحب بے چین ہیں۔ اضطراب کا تذکرہ کرنے پر فرمانے لگے "میں تکلیف
محسوس کر رہا تھا چاہتا تھا کہ آپ آجائیں۔" (۳۷)

اِقبال کے حضور

انہی ایام کی یاداشتوں پر مبنی 'سید نذیر نیازی کی کتاب "اِقبال کے حضور" میں جگہ جگہ قرشی صاحب کا ذِکر ملتا ہے۔ ذیل میں اِس کتاب سے چند مناظر (اقتباسات) پیش کئے جاتے ہیں جن سے اِقبال اور حکیم قرشی کے تعلق خاطر' باہمی اعتماد و محبت اور اُن کے معمولات کا پتہ چلتا ہے نیز علامہ کی محفل میں حکیم صاحب کی حیثیت بھی واضح ہوتی ہے۔

"ارشاد ہوا "حکیم صاحب ماشاء اللہ بڑے سمجھدار ہیں 'لاہور میں اُن کا دم
غنیمت ہے۔ پھر فرمایا "میں چاہتا ہوں اُن کا تعارف اعلیٰ حلقوں سے ہو جائے۔
اُن کا ایک دواخانہ بھی ہونا چاہئے۔" ۴ جنوری۔ ۱۹۳۸ء (۳۸)

اِس موقع پر علامہ نے قرشی صاحب کو اَپنے دوست میاں شاہ نواز (۱۸۷۴-۱۹۳۸ء) سے متعارف کروایا۔ اِقبال جیسے فرد کا علاج کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ اُن کی جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ اُن کی ذہنی حالت کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ قرشی صاحب کو خدا نے یہ اہلیت دی تھی کہ وہ مریض کی جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ذہنی کیفیت کو بھی جان لیتے تھے چنانچہ اِقبال کے علاج میں اُنہوں نے دواؤں' پسندیدہ غذاؤں اور ذہنی و فکری غذا' سب کو اچھی طرح پیش نظر رکھا۔ کبھی ہلکی پھلکی باتیں ہوتیں کبھی سنجیدہ گفتگو اور دقیق علمی امور پر بحث ہوتی اور کبھی لطائف اور بذلہ سنجی۔ کبھی جان بوجھ کر خاموشی کو توڑا جاتا اور کبھی حسب موقع بات مختصر کر دی جاتی۔ غرضیکہ یہ ایک مشکل ذمہ داری تھی جسے قرشی صاحب جیسا زیرک' تجربہ کار اور غیر معمولی ذھانت کا مالک معالج ہی نباہ سکتا تھا۔

حکیم صاحب جب جاوید منزل آتے تو کرسی قریب کرکے علامہ کی چارپائی کے ساتھ بیٹھ جاتے ان کی خیریت دریافت کرتے۔ گذشتہ دن میں صحت کے مدوجذر پر بات ہوتی اور ساتھ ساتھ وہ علامہ کے ہاتھ سہلاتے رہتے اگر فوری اقدام کی ضرورت ہوتی تو کرتے۔ دواؤں کے اثرات' ردو بدل' غذاؤں کے فوائد اور پرہیز پر بات ہوتی۔ علامہ کے

سوالات کے جوابات دیتے اور جب تک حکیم صاحب بیٹھے رہتے علامہ مطمئن اور مسرور نظر آتے۔ علامہ کے ساتھ گفتگو میں شریک ہونے کیلئے جو ذہنی معیار درکار تھا حکیم صاحب اِس پر پورا اترتے تھے۔ چنانچہ وہ علامہ کی فکری الجھنوں کا مداوا بھی تلاش کرتے رہتے۔ ۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو سید نذیر نیازی لکھتے ہیں۔

"پھر (علامہ) کچھ رک گئے اور بڑے افسوسناک لہجے میں کہنے لگے' اسپین کیا! مسلمان اپنی ساری تاریخ سے بے خبر ہیں۔"

یہ شعر و شاعری کیا ہے کچھ بھی نہیں! کاش میں نے شاعری نہ کی ہوتی۔" قریشی صاحب نے کہا" لیکن آپ نے تو شاعری کے پردے میں وہ سارا کام کر ڈالا جو فلسفیوں اور مؤرخوں' علماء اور فقہاء کے کرنے کا تھا آپ یہ کیسے کہتے ہیں آپ نے شاعری نہ کی ہوتی' ہمیں تو اِس شاعری پر ناز ہے حتی کہ وہ جو کہا گیا ہے۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

غالب نے دراصل آپ ہی کیلئے کہا تھا اِس سے کسے اِنکار ہو سکتا ہے۔ آپ کو تو غالب کی طرح یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں

تو اے کہ محوِ سخن گستران پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست

حضرت علامہ نے قدرے تبسم فرمایا' مگر کہا کچھ نہیں' میں' چودھری صاحب اور قریشی صاحب کے اشارے سے پھر واقعات بیاں کرنے لگا۔ زیادہ تر اُندلس اور تاریخ اُندلس ہی کے بارے میں۔ قریشی صاحب اور چودھری صاحب بھی کسی نہ کسی بات کا اضافہ کر دیتے تاکہ واقعات کی دِلچسپی قائم رہے۔ یوں دس پندرہ منٹ گزرے تو ہم نے دیکھا کہ حضرت علامہ پر غنودگی طاری ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔ چودھری صاحب اور قریشی صاحب بھی خاموش تھے وقت بھی زیادہ ہوگیا تھا بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ چپ چاپ خواب گاہ سے باہر نکل جائیں تاکہ حضرت علامہ کی نیند میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ حضرت علامہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئے اور جیسے ہم سے خطاب مقصود ہو' اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہ شدت تاثر سے اور بھی گلوگیر ہو رہی تھی' بڑے دردناک انداز میں ارشاد فرمایا!۔

تہنیت گوید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بردل ما آمد و ایں آفت ازمینا گزشت

اور دوسرا مصرع پڑھتے پڑھتے اتنا روئے کہ ہم پریشان ہوگئے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی
کبھی سو جاتے کبھی کوئی بات کرتے کبھی مسلمانوں کی حالت پر اشک باری فرماتے۔
ہم خاموش تھے اور پریشان بھی۔ حضرت علامہ پھر لیٹ گئے، علی بخش اور رحما اُن کا
بدن دابنے لگے 'م۔ ش شانے اور کمر' قرشی صاحب بھی جیسا کہ اُن کا معمول تھا' حضرت
علامہ کے ہاتھ سہلاتے رہے وہ کرسی کو آگے بڑھائے حضرت علامہ کے پلنگ سے لگے بیٹھے
تھے۔ اُن کی اُنگلیاں حضرت علامہ کی نبض پر تھیں اور گویا اشارتاً ہم سے کہہ رہے تھے کہ
اطمینان رکھیں حضرت علامہ کو نیند آ رہی ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ تھوڑی دیر کیلئے سو بھی
گئے۔ مگر پھر جلدی ہی اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے علی بخش چائے کا اِنتظام کرو یہ لوگ کب سے
بیٹھے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا جب علامہ یونانی طب کی افادیت کے چنداں معترف نہیں تھے (۴۰)۔ مگر
اب یہ حالت تھی کہ وہاں نہ صرف اِس طریقہ علاج کے معترف تھے بلکہ اُس کی ترقی کے
بھی خواہاں تھے۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

> "قرشی صاحب ماشاء اللہ سمجھدار ہیں۔ کیوں نہ وہ ایک طبی ادارہ قائم کریں
> یوں اُن کی شہرت پنجاب اور بیرون پنجاب میں پھیل جائے گی ممکن ہے یہ امر
> طب کی ترقی کا باعث ہو۔ (۴۱)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

> "میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ علاج صرف طبی ہوگا۔ یوں مشورے میں کوئی حرج
> نہیں۔ مجھے طبی ادویات پر زیادہ بھروسا ہے۔ پھر ارشاد ہوا "طبی علاج
> سینکڑوں برس کے تجربات پر مشتمل ہے سینکڑوں برس سے طبی ادویات آزمائی
> جا رہی ہیں اُن کی تاثیر اور فائدہ مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ انسانی مزاج
> طبیعت اور جسم کے زیادہ قریب ہیں۔" (۴۲)

علامہ صاحب حکیم نابینا اور حکیم قرشی کے علاج سے خاصے مطمئن تھے اور اِس طریقہ علاج
سے اِسقدر متاثر تھے کہ اِس کی ترقی و ترویج کیلئے ایک تحریک چلانے کا مشورہ دیتے تھے۔

> "طب کا مستقبل جب ہی ممکن ہے کہ اِس کی حفاظت کیلئے کوئی منظم کوشش
> کی جائے۔ اِس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بڑے پڑھے لکھے اور سمجھدار
> اطباء باہم مل کر کوئی ادارہ قائم کریں۔ مثلاً پنجاب میں قرشی صاحب ہی اگر
> اس قسم کی کوئی تحریک اٹھائیں تو ہو سکتا ہے کوئی ایسا ادارہ قائم ہو جائے اور
> طب کی نشوونما کی ایک صورت نکل آئے" (۴۳)

(علامہ کی اِسی ہدایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ' بعد میں حکیم صاحب نے "پنجاب طبی کانفرنس" کی بنیاد رکھی اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان طبی کانفرنس کا اجراء کیا)۔

علامہ کو حکیم صاحب پر بے حد اعتماد تھا اور ہوتا کیوں نہ! حکیم صاحب نے بھی تو اپنی تمام تر محبتیں اور عقیدتیں علامہ کے قدموں میں نچھاور کر دی تھیں ایک موقع پر فرمایا۔

"میں نے طے کر لیا ہے کہ ایلو پیتھک دوائیں اِستعمال نہیں کروں گا۔ حکیم صاحب جو تدبیر کریں گے' اسی پر عمل رہے گا۔ آج بھی اُنہیں کی دوا سے بڑا فائدہ ہوا۔ عرق گل گاؤزبان تو بہت راس آتا ہے" قرشی صاحب نے کہا' دوالمسک کی ایک خوراک کھا لیجئے اور آرام فرمایئے آپ کو آرام کی ضرورت ہے ہمیں اجازت دیجئے باری باری سے آپ کا بدن دابیں۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ یہ سب کچھ ہم حصول ثواب کیلئے کہہ رہے ہیں ورنہ علی بخش' رحما اور دیوان علی حاضر ہیں شب و روز آپ کی خدمت کر رہے ہیں"۔

علامہ نے مسکرا کر کہا "بہت بہتر" (۴۴)

دگر دانائے راز آید کہ ناید:

یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ علامہ کے آخری ایام قریب آگئے۔ ان دنوں کے بارے میں حکیم صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب کے مرض کی حالت میں مدوجذر ہوتا رہتا تھا۔ مگر یونانی علاج سے اُنہیں کافی فائدہ ہوگیا تھا۔ بہ ظاہر ایک حد تک اُن کی حالت امید افزا ہوگئی تھی تاہم اندرونی عوارض و اثرات کم و بیش باقی رہتے تھے۔ اِسی عرصہ میں مجھے پنجاب کی طبی کانفرنس میں راولپنڈی جانا پڑا۔ میرے جانے کے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر صاحب کی طبیعت یک بیک زیادہ خراب ہوگئی۔ یہ صورت دیکھ کر اُنھوں نے مجھے واپس آنے کیلئے تحریر فرمایا مگر میں جلد تعمیل ارشاد نہ کر سکا۔ میرے پہنچنے سے پہلے لاہور کے معروف ترین ڈاکٹروں کا ایک بورڈ علاج شروع کر چکا تھا جس سے دو روز کچھ فائدہ محسوس ہوا مگر انیس اپریل کو حالت خراب ہونی شروع ہوئی۔ تھوک میں خون آنے لگا تھا اور نبض بہت خفیف ہو چکی تھی۔ شام کو جب میں نے اور تین چار ڈاکٹروں نے دیکھا تو حالت

اطمینان بخش نہیں تھی تاہم حواس اُسی طرح صحیح و سالم تھے اور ظاہری حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں معلوم ہوتا تھا میں اِس رات بارہ بجے تک پاس بیٹھا رہا چودھری محمد حسین صاحب سید نذیر نیازی صاحب' پروفیسر مظفر الدین صاحب اور شفیع صاحب بھی موجود تھے۔ ایک آدھی دفعہ میں نے اجازت چاہی تو فرمایا کہ ابھی ٹھہریں اور علی بخش کو بلا کر کہا کہ حکیم صاحب کیلئے چائے بناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی میں نے کھانا نہیں کھایا' گھر جا کر کھانا کھاؤں گا فرمانے لگے پھر تو آپ کو کھانا کھانا چاہیئے تھا۔ شفیع صاحب نے کہا کہ سب نے حکیم صاحب کو کہا تھا مگر اُنہوں نے اعتراض کیا فرمانے لگے یہ ہمیشہ اعتراض کرتے ہیں جب آخری دفعہ رکا تو میں نے علی بخش سے کہا' اب چائے بنوالاؤ' اِس پر (علامہ نے) علی بخش سے فرمایا میم صاحب نے جو بسکٹ بنائے ہیں حکیم صاحب کو کھلاؤ۔ چنانچہ میں نے اور چودھری صاحب نے اور نیازی صاحب نے چائے پی ـــــــ تین بجے کے قریب بے چینی شروع ہوئی تو میاں محمد شفیع صاحب کو میرے پاس بھیجا۔ مکان کا دروازہ بند تھا مگر باہر ملازم سویا ہوا تھا۔ شفیع صاحب نے اُسے کوئی دوسرا آدمی سمجھ کر نہ جگایا۔ اور چند آوازیں دیں' جواب نہ پا کر واپس چلے گئے ـــــــ جب شفیع صاحب ویسے ہی واپس چلے گئے تو فرمایا کہ افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ اُسکے بعد پونے پانچ بجے راجہ حسن اختر صاحب کو بلوایا اور اُن سے فرمایا کہ قرشی صاحب کو بلا لائیں اُنہوں نے فرمایا کہ وہ رات کو بہت دیر سے گئے ہیں اور اِس وقت اُن کو بیدار کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ اِس پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا جس کی اِس قدر شہرت ہو چکی ہے

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے اَز حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب نے اِس قطعہ کا مطلب سمجھتے ہی کہا کہ میں ابھی حکیم صاحب کو لا رہا ہوں۔ وہ پانچ منٹ پر جاوید منزل سے نکلے اِس کے بعد فرمایا کہ پلنگ ساتھ کے کمرے میں لے چلو۔ جب اندر پلنگ لے گئے تو فرمایا کہ کندھا دبایا جائے علی بخش نے شانہ دبایا۔ اِس کے بعد ہی فرمایا کہ دل پر تکلیف ہے اور اِس کے ساتھ ہی پانچ بج کر چودہ منٹ پر جان جان آفرین کے سپرد کر دیا۔

جب میں جاوید منزل پہنچا تو معلوم ہوا کہ طلوع آفتاب کیساتھ ہی علم و ادب

کا یہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو چکا ہے وہ اِس وقت پہلو کے کمرے میں پلنگ پر اکیلے پڑے تھے۔ میں نے چادر منہ سے سرکائی اور یہ خیال کیا کہ حسب معمول "آیئے حکیم صاحب" کی شیریں آواز سامع نواز ہوگی مگر یہ خیال ایک ایسی آواز بن کر رہ گیا جس سے ہمیشہ دِل میں خلش پیدا ہوتی رہے گی۔ آخری وقت میں اُن کے یاد کرنے کی یا تو یہ وجہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ان آخری لحات میں اُن کے پاس رہوں یا اُن کا خیال ہوگا کہ ان خطرناک لحات میں جواہر مہرہ' اکسیر عنبری وغیرہ اِستعمال کراؤنگا کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی نبض بہت کمزور اور طبیعت نڈھال ہوگئی اور جواہر مہرہ وغیرہ کے اِستعمال سے طبیعت سنبھل گئی۔ بہرحال کوئی بھی وجہ ہو میرے لئے یہ امر موجب اضطراب رہے گا کہ میں اُن کی خواہش کے باوجود آخری لحات میں اُنکے پاس نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی موت کا ہم میں سے کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ جب رات کو گیارہ بجے تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو سب کا خیال تھا کہ ہم سب جاوید منزل جائیں گے۔ چودھری محمد حسین صاحب اُن کو دِن بھر کے واقعات سنائیں گے جو اُن کے جنازے کے پر عظمت جلوس' جمہور کی اشک باری اور شاہی مسجد کے باغ میں اُن کی تدفین کے اِنتظامات پر مشتمل ہونگے راجہ حسن اختر صاحب مزار کے نقشے اور مجلس اِقبال کی تشکیل کے متعلق اُن سے مشورہ کریں گے۔ سید نذیر نیازی صاحب اُن کو بغداد کا کوئی ایسا خواب اور افسانہ سنائیں گے جس سے وہ ہمیشہ کے لیے سکھ کی نیند سو جائینگے۔ میاں محمد شفیع اور میاں علی بخش اُن کے کندھے کو اِس طرح دبائیں گے کہ پھر وہ کبھی درد کی شکایت نہ کریں گے اور میں اُن کی نبض دیکھ کر ایسی خوشگوار دوائیں اور لذیذ غذائیں تجویز کرونگا کہ اُن کے کام و دہن جنت کے لذائذ و نعائم کا سا لطف محسوس کریں گے۔

اب بھی صبح کے وقت جب کوئی جگانے کیلئے آواز دیتا ہے تو میں دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ اٹھ بیٹھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو پھر کچھ تکلیف ہوگئی ہے جو صبح ہی صبح اُنہوں نے یاد فرمایا ہے۔ شفیع صاحب دوسرے تیسرے روز مطب میں آتے ہیں اور اُنکو دیکھ کر بدن میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی حالت بتانے کیلئے آئے ہیں مگر جب وہ کہتے

ہیں شیخ عطا محمد صاحب (ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی) بخار میں مبتلا ہیں ' علی بخش کو سینہ میں درد ہے۔ عزیز جاوید اِقبال کو کھانسی ہے تو میں کھو سا جاتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب ہمیں چھوڑ کر بادلوں سے بھی پرے بہت دور کسی ایسے مقام پر چلے گئے ہیں جو اِن کے تخیل کی طرح بلند و بے پایاں ہے اور جہاں دوستوں کی آہ و بکا اور عزیزوں کے نالہ و شیون کا گزر نہیں ہے۔ (۴۵)

اِقبال کے دوست مصنّفین کا قرشی صاحب کو خراجِ تحسین:

اِقبال کے دوستوں اور عزیز و اقارب نے قرشی صاحب کا ذِکر ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں کیا اور قرشی صاحب کی اِقبال سے محبت و عقیدت اور بطور معالج اُن کی پر خلوص کوششوں کو ایک درخشندہ مثال کے طور پر یاد کیا۔

علامہ کے دوست ' نامور ادیب اور صحافی مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۵-۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں۔

"معالجوں میں جس شخصیت نے مرحوم (علامہ اِقبال) کی علالت کے آخری دور میں سب سے بڑھ کر اور اِنتہائی محبت و عقیدت کیساتھ خدمات انجام دیں وہ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی ہیں۔ حضرت مرحوم کے تمام نیاز مند حکیم صاحب ممدوح کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے" (۴۶)

علامہ کے ایک اور دوست ذِکرِ اِقبال کے مصنف جناب عبدالمجید سالک نے قرشی صاحب کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

"حکیم محمد حسن قرشی طبیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اِنتہائی مخلص عقیدتمند کی حیثیت سے حضرت علامہ کے علاج میں مصروف تھے۔ گھنٹوں بلکہ بعض اوقات رات کے ایک ایک بجے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے خوشگوار دوائیں کھلاتے ' خوشگوار باتیں کرتے علامہ کو بھی اُن پر بڑا اعتماد تھا" (۴۷)

آخری ایام میں بہت قریب رہنے والے ' علامہ کے دوست سید نذیر نیازی حکیم صاحب کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"قطع نظر اس خلوص ' محبت اور دِلسوزی کے جو قرشی صاحب کو حضرت علامہ سے تھی' قرشی صاحب آتے تو اطمینان ہو جاتا کہ عوارض کی جیسی بھی کیفیت ہوگی ' قرشی صاحب اِس کا کوئی نہ کوئی مداوا سوچ ہی لیں گے" (۴۷)

"سرگذشتِ اِقبال" کے مصنف' جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں۔

"علامہ کا علاج ڈاکٹر بھی کرتے تھے اور طبیب بھی۔ حکیم نابینا کا علاج بھی رہا۔ لیکن حکیم محمد حسن قرشی نے زیادہ تسلسل کیساتھ علاج کیا اور وہ بھی بڑی محبت کیساتھ۔ وہ جانتے تھے کہ علامہ کڑوی کسیلی دوائیں ناپسند کرتے ہیں اور اُن سے مضطرب بھی ہوتے ہیں۔ اِس لیے حکیم قرشی نے ہمیشہ ایسی دوائیں تجویز کیں جو لذیذ بھی ہوں' مفرح بھی اور جن سے مرض میں بھی افاقہ ہو۔ اُنہوں نے علامہ کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دِن میں دو تین بار آتے تھے اور شام کے چھ بجے سے قریب قریب نصف شب تک کا وقت توکئی دِن علامہ کیساتھ بسر کرتے رہے۔ اِس سے ایک تو علامہ کا حوصلہ بڑھتا تھا دوسرے جب کوئی غیر معمولی پیچیدگی پیدا ہوتی تو ازالے کی فوری صورت نکل آتی تھی۔" (۴۹)

حکیم محمد حسن قرشی بطور اِقبال شناس:

حکیم محمد حسن قرشی کو خدا نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اور اُنہوں نے اُن صلاحیتوں کا بھرپور اِستعمال بھی کیا۔ وہ اعلیٰ اَدبی ذوق کے مالک تھے اور قلم کا اِستعمال بھی خوب جانتے تھے۔ طب کے علاوہ اَدبی موضوعات پر اُن کی تحریریں اُنکے نفیس ذوق اور منفرد اسلوب کی عکاس ہیں۔ اُن کی تقاریر بھی علم و دانش سے مزین ہوا کرتی تھیں۔ اِقبال سے اَپنے تعلق اور اُن کے کلام پر اَپنے خیالات کا اظہار' قرشی صاحب نے بہت سے مضامین میں کیا ہے جو اِقبال کی وفات سے لے کر حکیم صاحب کی وفات تک وقتاً فوقتاً اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔

حکیم مشرق	ماہنامہ شیراز لاہور مئی ۱۹۳۸ء
علامہ اِقبال اور طب اِسلامی	روزنامہ اِمروز ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء
اِقبال کی آخری رات	ہفت روزہ آفاق لاہور ۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء
اِقبال سے ایک ملاقات	روزنامہ اِمروز ۲۲ اپریل ۱۹۵۶ء
اِقبال مجالس میں	روزنامہ اِمروز ۲۱ اپریل ۱۹۵۷ء
تذکرہ اِقبال	روزنامہ اِمروز ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء
اِقبال اور محمد علی جوہر	روزنامہ اِمروز ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء
اِقبال کے پسندیدہ اشعار	روزنامہ اِمروز ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء

علامہ اِقبال اور سیاسیات	ہفت روزہ افریشیا لاہور ۲۴ اپریل ۱۹۶۱ء
اِقبال کی شاعری کا دوسرا دور	ہفت روزہ قندیل لاہور ۱۸ اپریل ۱۹۶۵ء
مکالمہ خضر و اِقبال	مقالات یوم اقبال کراچی ۱۹۶۶ء
اِقبال اور تحریک اتحادِ اسلامی	مقالات یوم اِقبال کراچی ۱۹۶۷ء

حوالہ جات و حواشی:

(۱) ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے آپنے مضمون " اقبال اور گجرات" مطبوعہ سہ ماہی ' اقبالیات" لاہور جنوری مارچ ۱۹۸۸ء میں گجرات کے درانی خاندان کے سربراہ کا نام محمد افضل خاں اور قبیلہ " ماموں زئی" لکھا ہے جو کہ درست نہیں۔

(۲) سرسید احمد خان پنجاب میں آز مولوی سید اقبال علی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ھاؤس دھلی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۶۹، ۳۷۰

(۳) خفتگان خاک گجرات صفحہ ۲۱۰

(۴) نذر اقبال۔ آز محمد حنیف شاہد ' بزم اقبال لاہور ۱۹۷۲ء ص ۳

(۵) نقوش اقبال نمبر ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء ۔ مضمون اقبال کا قیام لاہور آز حکیم احمد شجاع ص ۵۵۵

(۶) " دانائے راز" آز سید نذیر نیازی اقبال اکادی لاہور ۱۹۸۸ء ص ۲۵۱

(۷) باقیات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۷

(۸) اقبالنامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۴۷

(۹) نذر اقبال مرتبہ محمد حنیف شاہد ص ۱۲۵، ۱۲۶

(۱۰) ڈائک کون تھا؟ اِس بارے میں ڈاکٹر آکبر حسین قریشی (مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال)اور ڈاکٹر گیان چند (ابتدائی کلام اقبال) کھوج لگانے میں ناکام رہے۔ تاہم سید نذیر نیازی کی تحقیق کے مطابق (دانائے راز ص ۳۰۱) ڈائک (Dyke)چک (Czeck)شاعر تھا اور وہ ۱۸۷۷ء میں فوت ہوا

(۱۱) دانائے راز ص ۳۰۱ و باقیات اقبال ص ۱۰

(۱۲) ہفت روزہ "چیلنج " گجرات۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء مضمون مظفر حسن ملک

(۱۳) (الف) نغمہ فردوس آز خوشی محمد ناظر لاہور ۱۹۷۱ء

(ب) نغمہ فردوس آز خوشی محمد ناظر(انتخاب) مرتبہ قدیر شیدائی مکتبہ فانوس لاہور ۱۹۹۲ء

(۱۴) راقم کے پاس اقبال نامہ حصہ اول کا جو نسخہ ہے اِس میں یہ تحریر موجود ہے تاہم راقم کی نظر سے ایسے نسخے بھی گزرے ہیں جن میں یہ تحریر موجود نہیں ہے ۔ اقبالنامہ میں کئی مقلات پر اِسی تبدیلیاں کی گئی تھیں ۔ تاہم اصل نسخے کی پہلی سو کاپیاں نکل چکی تھیں جو اِن تبدیلیوں کی زد سے بچی رہیں (تفصیل کیلئے دیکھئے " مظلوم اقبال" آز اعجاز احمد صفحات ۳۲۴ تا ۳۲۹ اور " اقبال کی اردو نثر" از زیب النساء صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۲)

(۱۵) جسٹس میاں شاہدین ہمایوں کی اِس نظم کا نام " چمن کی سیر" ہے اور درج بالا اشعار اِس نظم کا آخری بند ہے

سید اعجاز حسین اعجاز' علامہ کے دوست تھے اور گورنمنٹ کالج میں ایک سال سینئر تھے۔

میر غلام بھیک نیرنگ ' علامہ کے دوست تھے اور گورنمنٹ کالج میں دو سال جونیئر تھے ۔

(۱۶) دانائے راز از سید نذیر نیازی ص ۱۶۰
(۱۷) عروج اِقبال از پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بزم اِقبال لاہور' ۱۹۸۷ء ص ۱۵۸
(۱۸) اِقبال اور انجمن حمایت اِسلام از محمد حنیف شاہد لاہور' ۱۹۷۷ء ص ۲۹
(۱۹) اِقبال نے ۱۹۰۰ء میں انجمن کے جلسے میں سب سے پہلی نظم - نالہ یتیم - پڑھی پھر ۱۹۳۶ء تک کئی نظمیں مثلاً یتیم کا خطاب ہلال عید سے۔" اِسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے ' "فریاد امت" ' "تصویر درد" ' "درد دِل" ' "دین و دُنیا" ' "شکوہ" ' "بلال" ' "شمع اور شاعر" ' "خضر راہ" ' "طلوع اِسلام" وغیرہ پڑھیں۔
(۲۰) ناظر نے انجمن کے جلسوں میں جو نظمیں پڑھیں اُن میں "خواتین سے خطاب" ' "درس عشق" ' "اخوت" ' "پیام حالی" ' "خیر مقدم" ' "سرودِ افلاک" ' "آیات بینات" ' اور "قومی غزلیں" وغیرہ شامل ہیں۔
(۲۱) نغمہ فردوس جلد دوم ص ۴۲
(۲۲) مقالات اِقبال مرتبہ سید عبدالوحد معینی ۔ آئینہ ادب لاہور ۱۹۸۸ء ص ۵۱
(۲۳) ایضاً ص ۵۴
(۲۴) ایضاً ص ۷۳
(۲۵) نغمہ فردوس(انتخاب) از خوشی محمد ناظر۔ مکتبہ فانوس لاہور ۱۹۹۲ء ص ۲۱
(۲۶) زندہ رود جلد دوم ص ۲۵۷ ۔ بحوالہ مضمون اِقبال اور کشمیر از عبداللہ قریشی
(۲۷) نغمہ فردوس جلد اول ۔ لاہور ۱۹۳۷ء ص ۱۱۵
(۲۸) نغمہ فردوس جلد اول ص ٦
(۲۹) مکاتیب اِقبال بنام گرامی ۔ اِقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۹ء ص ۲۰۴
(۳۰) ایضاً
(۳۱) علامہ اِقبال اور اُنکی پہلی بیوی از سید حامد جلالی نقوی ۔ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۸۰
(۳۲) نغمہ فردوس جلد اول نظم مناجات ' ۱۹۳۷ء لاہور ص ۱۹
(۳۳) نغمہ فردوس جلد اول ص ۱۸۵
(۳۴) ماہنامہ " قومی صحت " لاہور ۔ قرشی نمبر۔ بابت دسمبر ۱۹۸۸ء
(۳۵) مندرجہ ذیل ماخذات سے مدد لی گئی ہے۔
(الف) ماہنامہ قومی صحت ۔ (مذکورہ بالا) و ماہنامہ ' صدائے قاسمی " کراچی " قرشی نمبر" نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء
(ب) کاروان شوق از حکیم آفتاب احمد قرشی ۔ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور ۔ ۱۹۸۴ء ص ۴۸۲ تا ۴۸۴
(ج) اِقبال اور انجمن حمایت اِسلام لاہور مرتبہ محمد حنیف شاہد

(د) اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی ۔ اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء

(۳۶) حکیم محمد حسن قرشی نے اپنے مضمون "حکیم مشرق" مشمولہ ملفوظات اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی) میں ۱۹۰۹ لکھا ہے مگر یہ سن ۱۹۱۱ء میں ہونا چاہئے کیونکہ اقبال نے شکوہ انجمن کے ۱۹۱۱ء کے اجلاس میں پڑھا تھا۔

(۳۷) حکیم مشرق از حکیم محمد حسن قرشی ۔ مشمولہ ملفوظات اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص ۲۸۲

(۳۸) اقبال کے حضور از سید نذیر نیازی ص ۱۸

(۳۹) ایضاً ص ۲۷۳، ۲۷۴

(۴۰) ملفوظات اقبال ص ۲۷۹

(۴۱) اقبال کے حضور ص ۱۸۴

(۴۲) ایضاً ص ۳۸۷

(۴۳) ایضاً ص ۲۴۵

(۴۴) ایضاً ص ۲۵۰

(۴۵) ملفوظات اقبال ص ۲۸۶ تا ۲۹۱

(۴۶) اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ۔ اسلامک پبلیکیشنز لاہور ص ۳۹۱ بحوالہ ہفت روزہ چٹان لاہور ۔ ۲۳ اپریل ۶۲ء

(۴۷) ذکر اقبال از مولانا عبدالمجید سالک ۔ بزم اقبال لاہور ۱۹۸۳ء ص ۲۱۹

(۴۸) اقبال کے حضور ص ۲۳۴

(۴۹) سرگذشت اقبال از عبدالسلام خورشید ۔ اقبال اکادمی لاہور ۔ ۱۹۷۷ء ص ۵۴۹

حصہ دوم: وسعتِ محفلِ اَحباب

- سید عطاء اللہ شاہ بخاری
- مولانا اصغر علی روحی
- ڈاکٹر محمد شجاع ناموس
- پروفیسر محمد اکبر منیر
- پروفیسر قاضی فضل حق
- سید حبیب جلالپوری

"انسانی قلب کیلئے اِس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اِس کا خلوص پر وردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ اللہ نے اِس (اِقبال) کو نگاہ بلند اور دِلِ غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے":

(اِقبال بنام شاد۔ ۷ مارچ ۱۹۱۷ء)۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

طاقت کے نشے میں مخمور فرنگی کے ایوانوں میں اپنی آتش بیانی اور حریت ایمانی سے لرزہ پیدا کرنے والا برصغیر کا یہ عظیم مقرر بھی گجرات کا سپوت ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بزرگوں میں سے سید عبدالغفار' بخارہ سے کشمیر آئے اور ۱۸۴۸ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کا سودا کیا تو سید عطاء اللہ کے دادا سید نور شاہ کشمیر سے ہجرت کر کے گجرات کے گاؤں ناگڑیاں میں آکر آباد ہوگئے۔ سید عطاء اللہ کے والد سید ضیاء الدین گجرات سے پشمینے کی سوداگری کیلئے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ وہیں اِن کی شادی حافظ سید احمد اندرابی کی صاحبزادی حافظہ سیدہ فاطمہ سے ہوئی اور اِسی سرزمین کو شاہ جی کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے جہاں آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے

آپکا بچپن زیادہ تر ننھیال میں گزرا۔ چار سال کی عمر میں والدہ داغ مفارقت دے گئیں ۲۲ سال کی عمر تک آپ حفظ قرآن کے علاوہ قرآت اور دیگر مروجہ اِسلامی علوم میں دسترس حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں آپ کی شادی ناگڑیاں میں سید میر مرتضٰی کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ شادی کے بعد دوبارہ امرتسر گئے اور تفسیر و حدیث کا عمیق مطالعہ کیا۔ یہیں سے آپ کی خطابت کا آغاز ہوا۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ (۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء) آپ کو سیاست کی طرف لے آیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس امرتسر میں مولانا شوکت علی (۱۸۷۳۔۱۹۳۸ء) کی صدارت میں آپ نے پہلی سیاسی تقریر کی جسے بہت سراہا گیا۔

۱۹۲۰ء میں لاہور میں علامہ اِقبال کی صدارت میں پہلی خلافت کمیٹی قائم کی گئی مگر اگلے روز ہی اُسے سر مائیکل اڈوائر کے اشارے پر توڑ دیا گیا۔ کچھ دِنوں بعد شاہ صاحب لاہور آئے ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا اور علی الاعلان نئی خلافت کمیٹی تشکیل دی جس کا صدر سید حبیب مدیر "سیاست" کو مقرر کیا گیا۔ پوری تحریک خلافت میں شاہ صاحب صف اول میں رہے۔ ترک موالات کے نتیجے میں بچوں کو سرکاری سکولوں سے ہٹا لیا گیا تو انکی تعلیم کیلئے جامعہ ملیہ کے تحت ملک بھر میں درسگاہیں قائم کی گئیں۔ شاہ جی نے گجرات میں آزاد مسلم ہائی سکول کی بنیادی رکھی جس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۰۔۱۹۵۸ء) نے کیا۔ اُنہوں نے ضلع گجرات میں ۱۳۰۰ (تیرہ سو) خلافت کمیٹیاں قائم کیں اور لوگوں نے دِل کھول کر چندہ دیا۔ مردوں نے عمر بھر کی جمع پونجی اور عورتوں نے اپنے زیور تک شاہ جی کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔ گجرات اس دور میں شاہ جی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا پھر انکی خطابت اور بے باکی کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بجنے لگا۔

تحریکِ خلافت کے علاوہ تحریکِ ختمِ نبوت اور تحریکِ شاتمِ رسول میں شاہ جی نے مرکزی کردار ادا کیا۔ غازی علم الدین شہید (۱۹۰۸۔۱۹۲۹ء) نے آپ کی تقریر سن کر ہی شاتم رسول کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔ اِن تحریکوں میں آپ کئی مرتبہ گرفتار ہوئے اور قید و بند میں رکھے گئے۔ شاردا ایکٹ کی بھی آپ نے دھجیاں اڑا دی تھیں۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں "مجلسِ احرار" کی بنیاد رکھی گئی تو شاہ صاحب کو اِس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۰ء کے "انجمنِ خدام الدین" کے سالانہ اجلاس میں شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کاشمیری نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو "امیرِ شریعت" کا خطاب دیا۔ اُنکے بعد تقریباً پانچ سو علماء نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جن میں مولانا احمد علی لاہوری (۱۸۸۶۔۱۹۶۲ء) مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳۔۱۹۵۶ء) اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (۱۸۹۶۔۱۹۵۶ء) شامل تھے۔

آپ کی زِندگی انگریز کے خلاف لڑتے ہوئے گزری۔ آپ کی للکار اُن پر ہیبت طاری کر دیتی تھی۔ تحریکِ ختمِ نبوت ہو تحریکِ مسجد شہید گنج ہو یا تحریکِ کشمیر آپ کی جرأت و بے باکی ہر میدان میں قابلِ دید رہی۔ اُن کی زِندگی کے بیشتر لمحات سٹیج پر گزرے، ریل میں صرف ہوئے یا جیل میں کٹے۔

آپ کی خطابت میں بلا کا جوش تھا قوتِ ایمانی اور جذبۂ حریت سے بھرپور یہ تقاریر سننے کیلئے لوگ دور دور سے آتے اور موسم و ماحول سے بے نیاز گھنٹوں آپ کی ایمان افروز باتیں سنتے۔ تقریر سے قبل آپ نہایت پر سوز آواز میں تلاوت قرآن حکیم فرماتے جس سے سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ آپ کو متعدد بار قتل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریز سرکار آئے دِن آپ پر طرح طرح کے مقدمات بنائے رکھتی مگر آپ نے جھکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ شاہ جی کی تمام تر توانائیاں ہمیشہ اِسلام اور مسلمانوں کی بہتری کیلئے صرف ہوئیں۔ اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام کا دوست اُنکا دوست اور دشمن اُن کا دشمن تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد آپ اپنے وطن میں بھی قید رہے کیونکہ وہ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہ آئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُنکی سرگرمیاں مدہم پڑتی گئیں اور صحت بھی کمزور ہوتی گئی تاہم ختمِ نبوت کے سلسلے میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ آخر ایک بھرپور مجاہدانہ زِندگی گزار کر یہ فقید المثال خطیب اور سراپاٗ حریت خادمِ اِسلام ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو ملتان میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ملتان میں ہی دفن ہوئے۔

اِقبال اور بخاری

"شاہ جی اِسلام کی چلتی پھرتی تلوار ہیں"۔ اِقبال (۲)

اِقبال اور بخاری ' خیالات میں مکمل ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود ذاتی سطح پر ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ وہ اِقبال کے حلقۂ احباب کے اہم رکن تھے۔ مراسم میں گرم جوشی ' اعتماد اور بے تکلفی کے عناصر پوری طرح موجود تھے۔ اِقبال ' شاہ جی کی تلاوت کے والہ و شیدا ' اُنکی خطابت کے مداح اور اُنکے جہادِ حریت کے حامی اور دعاگو تھے۔ جبکہ شاہ جی ' اِقبال کی حکیمانہ شاعری مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کیلئے تڑپ اور بصیرت و دانش کے دِل و جان سے قائل تھے۔

اُس دور کے حالات اور شاہ جی اور اِقبال کے مقام کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ دونوں کے درمیان مخلصانہ تعلقات موجود تھے۔ یہ درست ہے کہ شاہ جی کی طوفانی زِندگی طویل ملاقاتوں کیلئے وقت نہ دیتی تھی۔ شاہ جی کی زِندگی ریل میں گزری یا جیل میں گزری چنانچہ طویل ملاقاتیں ' ہم نشینیوں اور ہم سخنیوں کے مواقع کثرت سے میسر نہ آسکے ' مگر اِس بات سے ان کے تعلق خاطر اور دوستانہ روابط کی نفی کیونکر ممکن ہے رہی بات سیاسی اختلافات کی تو علامہ ہندوستان کے بہت سے سیاستدانوں سے سیاسی اختلافات رکھتے تھے اور بہت سی تحریکوں کو "بے فائدہ" سمجھتے تھے مگر یہ اختلافات سیاسی میدان تک محدود تھے۔ ذاتی تعلقات میں اُنہیں زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ پھر شاہ جی کی تحریک سے تو علامہ کو "کسی قدر بہتری کی امید" تھی۔

شورش کاشمیری (جو شاہ جی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے) نے اَپنے ایک مضمون اِقبال اور بخاری" (مطبوعہ ہفت روزہ چٹان" لاہور سالنامہ ۱۹۶۲ء) میں علامہ اِقبال اور بخاری کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی ہے ذیل میں وہ مضمون نقل کیا جارہا ہے۔

اِقبال اور بخاری

از شورش کاشمیری

"اج اوہ ہوندا تے انہاں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدار اے کہ فداکار۔
میں کنوں کھواں ' میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وِچھڑ گئے تے یاں پچھڑ گئے نیں"

علامہ کا ذِکر ہو رہا تھا ' شاہ جی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا آج وہ (اِقبال) زندہ ہوتا تو

اِن کر گسوں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فداکار۔ میں کس سے کہوں کہ میرے تو ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ گئے یا پچھڑ (پیچھے رہ) گئے ہیں۔

شاہ جی فرماتے تھے"

جب کبھی میں ان (اقبال) کے ہاں حاضر ہوتا وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے' حقہ سامنے ہوتا' دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں۔ صدا دیتا" یا مرشد" فرماتے " آ بھئی پیرا' بہت دِناں بعد آیاں اے " علی بخش سے کہتے حقہ لے جاؤ اور کلی کیلئے پانی لاؤ۔ کلی فرماتے' پھر ارشاد ہوتا" ایک رکوع سناؤ" میں پوچھتا حضرت کوئی تازہ کلام۔ فرماتے۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ عرض کرتا" لائیے" کاپی منگواتے۔ پہلے رکوع سنتے پھر وہ اشعار جو حضور سے وابستہ ہوتے۔ قرآن پاک سنتے وقت کانپنے لگتے تھے۔ لیکن جب حضور کا ذِکر ہوتا یا اُن کے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشکبار ہو جاتا۔ حضور کا ذِکر ہمیشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود اُن کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضور کے ذِکر پر اِس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں کے بغیر روتا ہے"۔

افراد و اشخاص اور واقعات و حالات کے بارے میں ان کا (اِقبال کا) تجزیہ حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا۔ شاہ جی کا بیان ہے " مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور اِن کی سیرتوں کا اجمالی خاکہ پیش فرماتے۔ سرکار کی بیشتر باتیں اُنہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے پھر احتراز فرماتے " بھئی دِلی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتادو گے۔"

پھر بتا بھی دیتے۔ فرماتے " اپنی ذات تک محدود رکھنا" لطف یہ تھا اپنے سبھی معتمدین کو بتاتے چلے جاتے اور سبھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے تک محدود رکھنا اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے " تم لوگ راز نہیں رکھ سکتے ہو" عرض کی جاتی آپ نے ہی تو فلاں فلاں کو بتایا ہے پھر مسکراتے " اچھا تو عام ہو جانے دو اِس میں راز کی کونسی بات ہے۔

ایک دفعہ (بروایت شاہ جی) جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے رہے' کہنے لگے " عامتہ المسلمین میں بڑی جان ہے' اِس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے یہ بجھنے کیلئے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے خواص تو خیر عضو معطل ہیں۔ اُنہیں اپنے جسم کا عیش چاہیے۔ لیڈر گم کردہ راہ ہیں' لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے۔" عرض کیا" حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی۔ آپ کیلئے عامتہ المسلمین کس طرح تڑپ رہے ہیں لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں۔" (کہنے لگے) " نہیں پیر جی۔ یہ بات نہیں میرا مجمع میری کتابیں ہیں۔ میں ہجوم افکار میں اِس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ بسا

اوقات فرصت کے اوقات ہی عنقا ہو جاتے ہیں۔

"ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی۔"

"او شاہ جی تساں تے دِلاں تے دماغاں دیاں مٹیاں جھاڑدے او"

(ارے شاہ جی آپ تو دِلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہیں)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا

"ہائے کیا اِنسان تھا۔ جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطہ معراج! چونکہ میاں سے محبت کرتے تھے۔ اِس لئے اللہ نے اُن پر علم و دانش اور فکر و نظر کی بھی راہیں کھول دی تھیں۔ وہ اِس میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن علم اِس کا خانہ زاد تھا۔

"آج جو پشتینی وفادار ------ شاہ جی نے فرمایا۔ "اُس کا نام لے لے کر اُس کے ہم نشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں۔ کسی علمی مسئلے پر اِقبال نے کبھی اُن سے مخاطبت کی؟ کبھی اُن سے کوئی دینی سوال کیا؟ کبھی ملی امور پر اُن سے خود گفتگو کی؟ ' کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال اِن سے زیر بحث لاتے رہے؟ ان کیساتھ تو اُن کے زیادہ سے زیادہ لاغر قسم کے مجلسی روابط تھے۔"

شاہ جی نے کہا۔

"یہی وہ لوگ ہیں جو اِقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے۔ اُنہی لوگوں نے اِقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور اُنہیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے۔ اِقبال نے مجھ سے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا تھا۔" شاہ جی نے بتایا۔ یہ بیان کرتے ہی اُن کا بدن کانپنے لگا کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل ' سیہ رو اور گندہ ضمیر ہو جاتا ہے۔

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگی کی دشمنی سے اُن کے خون کا قطرہ قطرہ انگاروں میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ یورپی تہذیب ' یورپی دانش ' یورپی سیاست اور یورپی سج دھج کے سخت دشمن تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ اپنے خصائص کھو چکا ہے۔ اِس کے اندر مشرق کی روح بالکل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کی خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے۔ لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر نٹوں کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندانوں کا ذِکر بڑی حقارت سے کرتے۔ یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا کہ جن سے نفرت کرتے اُنہیں اپنے گھر میں بھی گھسنے نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اسے دھتکار کر نکال دیتے۔ ورنہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا" شاہ جی میں مطمئن ہوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ و پے میں اتر رہا ہے لیکن ابھی کارواں تیار ہو رہا ہے۔ ابھی کاروان بنا نہیں۔ سفر' رستہ اور منزل تو دور کی

چیزیں ہیں۔ جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں اُس وقت تک مشرق کی عظمت کا سورج نہ کبھی ابھر سکتا ہے اور نہ اُس کے نصف النہار پر پہنچنے کا سوال ہی زیرِ غور آسکتا ہے۔

شاہ جی عموماً یہ فرماتے

"کاش اِقبال آج زندہ ہوتے۔ اُن کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ جب کبھی اُن کی ہم نشینی کا موقع ملتا، معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھل گیا ہے۔" (۳)

پہلی ملاقات

اِقبال اور بخاری کی پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کے جلسے میں ہوئی، جہاں شاہ جی نے زِندگی کی پہلی سیاسی تقریر کی اور اُن کی عظیم خطابت کا آغاز ہوا۔ اور خواص و عام اُن کی خطابت و بیباکی کے گرویدہ ہوگئے۔ اِس ملاقات کے بعد دونوں میں سیاسی میدان میں فکری ہم آہنگی مدوجزر سے گزرتی رہی لیکن ذاتی مراسم خلوص اور عقیدت سے ہمیشہ بھرپور رہے۔

اِقبال سیاسی میدان میں اختلاف کے باوجود احرار کے ایثار دینی حمیت اور جذبہ حریت کے قائل تھے

ازل سے فطرتِ احرار میں ہے دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

نظم "اسیری"

اِقبال کی نظم "اسیری" (بانگِ درا) کے بارے میں عام روایت (۴) یہ ہے کہ اِقبال نے یہ نظم دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اُس وقت پڑھی تھی جب مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جیل سے رہا ہو کر جلسے میں پہنچے تھے۔ تاہم دوسری روایت (۵) کے مطابق اِقبال نے یہ نظم اس وقت کہی تھی جب تحریکِ خلافت کے دور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو گرفتار کر کے تین سال کے لیے قید فرنگ میں ڈال دیا گیا۔ خود شاہ جی کی روایت تھی کہ یہ نظم اِقبال نے اُنہیں خود سنائی تھی (۶)۔ ممکن ہے اِقبال نے نظم کے مضمون اور تاثر کی وجہ سے اِسے دونوں موقعوں پر سنایا ہو کیونکہ اِس کے اشعار شاہ جی کی ذات پر بہت موزوں نظر آتے ہیں۔ ذیل میں یہ نظم درج کی جاتی ہے۔ (۷)

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے' اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت' مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
"شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

تحریکِ ختمِ نبوت

تحریکِ ختمِ نبوت (ناموس رسالت) کے دوران جب مجلسِ خلافت کے ارکان نے اپنی گرفتاری پیش کی تو اِقبال نے فرمایا'

"مجھے مجلسِ خلافت کے اُن ارکان سے ہمدردی ہے جو اپنی مجلس کی تجویز کے مطابق نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہوئے گرفتار ہوئے کہ وہ ایک پاک مقصد کی خاطر ایثار کر رہے ہیں' خاص کر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی ایسے مشہور کارکنوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ ہمیں اُن کی بعض رائیوں سے اختلاف بھی ہو لیکن عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ وہ قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت بڑا ایثار دکھاتے ہیں" (۸)

تحریک مسجد شہید گنج

تحریک مسجد شہید گنج کے دِنوں میں محمد حسین عرشی نے ایک ملاقات میں علامہ سے دریافت کیا کہ ان (اِقبال) کے نزدیک موجودہ ہندی اِسلامی تحریکوں میں کونسی تحریک مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے؟ آپ نے بتایا "عموماً اِن تحریکوں کے قائد جاہل ہیں" احرار کے متعلق کہا "اُن سے کسی قدر اصلاح کی امید ہو سکتی ہے"۔ (۹)

تبادلۂ خیال

شاہ جی کے بہت سے دوست اِقبال کے قریبی احباب میں شامل تھے جیسے حکیم فیروز طغرائی' احمد دین امرتسری' عبدالمجید سالک' غلام رسول مہر' محمد دین تاثیر' مولانا گرامی' شیخ عبدالقادر' شیخ حسام الدین امرتسری' اور چوہدری افضل حق۔ اِس ضمن میں مولانا انور شاہ

کشمیری(۱۸۷۵۔۱۹۳۳ء) کا ذِکر خصوصیت کا حامل ہے۔ جن سے اِقبال کو بہت عقیدت تھی۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں اَنجمنِ خدام الدین کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں خصوصیت سے علمائے دیو بند نے شرکت کی تھی جن میں سید انور شاہ کشمیری' مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی(م۔۱۹۲۹ء) مولانا شبیر احمد عثمانی(۱۸۸۵۔۱۹۴۹ء) مفتی عزیز الرحمٰن خاص طور پر قابلِ ذِکر ہیں۔ علامہ نے اَپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں یہ حضرات خصوصی طور پر مدعو تھے اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو بھی بلایا گیا تھا۔ ضیافت سے قبل اور بعد میں بہت سے علمی اور دینی مسائل زیرِ بحث آئے جن میں سود کا مسئلہ بھی شامل تھا۔(۱۰)

حمایت

۱۹۲۶ء میں اِقبال نے جب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو اکثر زعماء نے اُن کی بھرپور حمایت کی۔ اِسی سلسلے میں ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو شام سات بجے بیرون دہلی دروازہ میونسپل پارک لاہور میں پنجاب الیکشن خلافت بورڈ کے زیرِ اہتمام مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان اجتماع علامہ اِقبال کی حمایت اور تائید کے لیے منعقد ہوا۔ اِس اجلاس میں علامہ کے علاوہ جن شخصیات نے شرکت کی اور علامہ کی حمایت میں تقاریر کیں ان میں مولانا ظفر علی خاں' خواجہ عبدالرحمٰن غازی وغیرہم کے ساتھ سید عطا اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے (۱۱) اور علامہ کی واضح اکثریت میں شاہ جی کی جادوئی خطابت کا سحر بھی شامل تھا۔

فتنۂ شاتمِ رسول

اِقبال کی باقی تمام حیثیتیں ایک طرف اور عشقِ رسول ایک طرف! اور شاہ صاحب کی زندگی جس جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اس کا سب سے بڑا مقصد ناموسِ رسالت تھا۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک علامہ اور سید صاحب نے ملکر ناموسِ رسالت کے لیے اَپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کام کیا۔ شاتمِ رسول راج پال کے ہائی کورٹ سے بری ہونے سے لیکر غازی علم دین کی پھانسی تک دونوں نے اِس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ شاہ جی سول نافرمانی پر زور دیتے تھے جبکہ اِقبال گفت و شنید کا رستہ اپنانے کے حق میں تھے۔ اِس سلسلے میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور شاہ جی کو متعدد بار گرفتار کیا گیا۔ ایک مرتبہ اُنہیں علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے باہر سے گرفتار کیا گیا۔

تحریکِ کشمیر اور قادیانیت

قادیانیت کے بارے میں اِقبال کے رویہ اور قادیانیت کے خلاف اُنکا علمی اور عملی جہاد' اِقبال اور بخاری کے تعلقات میں توسیع اور تقویت کا باعث بھی تھا اور ثمر بھی۔ آج تک قادیانی بلبلا رہے ہیں کہ اِقبال کو محاسبہ قادیانیت پر "احراری بھکاووں" نے اکسایا۔ اِس سلسلے میں مولانا انور شاہ کشمیری' مولانا احمد علی لاہوری' اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے اِقبال کے روابط کی تفاصیل منظر عام پر آچکی ہیں۔

تحریک کشمیر ایک اور محاذ تھا جہاں اِقبال اور شاہ جی دوش بدوش جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں شملہ میں کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ مرزا بشیرالدین محمود احمد (۱۸۸۹۔۱۹۶۵ء) کو اِس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اِس اجلاس میں اِقبال بھی شامل تھے۔ مگر جلد ہی کشمیر کمیٹی کے ارکان نے محسوس کیا کہ قادیانی صدر کے زیر سرپرستی قادیانی اِس تحریک کی آڑ میں دراصل قادیانیت کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اِقبال اور شاہ جی کی کئی ملاقاتیں ہوئیں جن کے نتیجے میں قادیانیت کے بارے میں اِقبال کے خیالات میں نہایت واضح اور بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ جس کا اِقبال نے برملا اظہار کیا اور اِسی دور سے اِقبال کے خیالات میں وہ صراحت پیدا ہوئی جس کی بنا پر اُن پر قادیانیت سے متاثر ہونے کا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔ اِنہی ملاقاتوں کے نتیجے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمانوں کو کفروارتداد (قادیانیت) سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مرزا بشیرالدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت اور عبدالرحیم درد کو سیکریٹری شپ کے عہدے سے ہٹایا جائے اور کشمیر کی آزادی کی باگ ڈور مجلس احرار کے سپرد کی جائے۔ چنانچہ ۷ مئی ۱۹۳۳ء کو بشیرالدین نے استعفیٰ دیدیا۔

اِسی تحریک کشمیر کے سلسلے میں موچی دروازہ لاہور کے باغ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت علامہ اِقبال نے کی۔ شاہ جی نے ہمیشہ کی طرح معرکتہ الآراء تقریر کی۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے رہے۔ آخر میں لوگوں نے اصرار کیا کہ علامہ بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔ شاہ صاحب نے علامہ کی علالت کا جواز پیش کیا' مگر مجمع کا اصرار' اعتذار پر غالب آگیا اور علامہ نے مٹھی ہوا میں بلند کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا (۱۳)۔

لا اِلٰہ گوئی بگو از روئے جاں
لا اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

سورۂ مزمّل سنانے کی فرمائش

سید عطا اللہ شاہ بخاری کے صاحبزادے سید عطا المحسن بیان کرتے ہیں (۱۴) کہ شاہ جی نے بارہا اِقبال سے وابستہ یادیں' باتیں اور ملاقاتیں تازہ کیں۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ اِقبال اُن سے اکثر ملاقاتوں میں سورہ مزمل سنانے کی فرمائش کرتے تھے اور خود بھی شاہ جی کی فرمائش پر اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ اُنہوں نے ایک مرتبہ "مرگ" کے زیر عنوان نظم سنائی تھی۔

۱۹۳۱ء میں باری علیگ نے "اِقبال اور بخاری" کے عنوان سے "زمیندار" میں ایک مضمون لکھا جس سے اُس دور کی ہندوستانی سیاست میں اِقبال اور بخاری کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اِقبال اور بخاری سیاست میں جن رجحانات کے نقیب تھے اور مسلم زعماء میں دونوں کا جس قدر طوطی بولتا تھا اسکی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔ نیز اس ذہنی فضا کا سراغ لگایا گیا ہے جس میں دونوں قوم کے ملی شعور کی پرورش کرنا چاہتے تھے (۱۵)۔

شیخ حسام الدین امرتسری نے شاہ جی اور اِقبال کی صحبتوں کا ذکر کیا ہے جسے سلیم تابانی نے ماہنامہ "تبصرہ" لاہور نومبر' دسمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ عبداللہ چغتائی نے بھی دونوں کے دوستانہ روابط کا ذکر کیا ہے ("بینات" کا بنوری نمبر۔ "المعارف" کا اِقبال نمبر) (۱۶)

ایک تعزیتی فقرہ

اِقبال کی وفات پر مسجد خیرالدین امرتسر میں تعزیتی جلسے میں شاہ جی کا خطاب اُن کے جذبات کا مظہر تھا۔ آپ کا ایک فقرہ تھا۔

> "اِقبال کو نہ انگریز نے سمجھا نہ قوم نے۔ اگر انگریز سمجھتا تو اِقبال بستر پر نہ مرتے بلکہ پھانسی کے تختے پر لٹکائے جاتے اور اگر قوم سمجھ لیتی تو آج تک غلام نہ رہتی" (۱۷)

مولانا اصغر علی روحؔی

مولانا اصغر علی روحی 'عربی' فارسی کے عالم بے بدل' اُستاد کامل اور شاعر باکمال تھے۔ ۱۸۶۷ء کے لگ بھگ گجرات کے گاؤں کٹھالہ چناب میں پیدا ہوئے۔ انکے والد قاضی شمس الدین نامور اور عالم دین اور فقیہہ تھے۔ اصغر علی کے بچپن میں ہی والد کا اِنتقال ہوگیا۔ مولانا روحی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ آپ کی ذہانت اور مزید تعلیم کی خواہش کو دیکھتے ہوئے آپ کی والدہ آپ کو ساتھ لے کر لاہور آگئیں۔ یہ ۱۸۸۱ کی بات ہے لاہور میں آپ نے حافظ عبدالوہاب سے "پٹولیاں والی مسجد" (اندرون لوہاری) میں صرف و نحو کا درس لینا شروع کیا بعد ازاں اورنٹیل کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۲ء تک پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل' مولوی فاصل اور ایم او ایل کی اسناد امتیازی حیثیت سے حاصل کیں۔ آپ کو مولانا فیض الحسن سہارنپوری (۱۸۱۶ـ۱۸۸۷ء) مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (۱۸۵۰ـ۱۹۲۰ء) مولانا عبدالحکیم کلانوری جیسے نامور اساتذہ سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ علم حدیث کیلئے مولانا نذیر حسین دھلوی (۱۲۲۰ـ۱۳۲۰ھ) کے سامنے زانوئے اَدب تہہ کیا۔

اَنجمن حمایت اِسلام لاہور کے عمائدین نے آپ کی شہرت سن کر آپ کو اِسلامیہ کالج میں عربی اور فارسی کا اُستاد مقرر کیا'۔ جہاں آپ ۱۸۹۲ء سے ۱۹۳۱ء تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے اور پروفیسرو صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی ریٹائرمنٹ پر اَنجمن نے آپ کیلئے ۳۰۰ روپے ماہوار وظیفہ تازیست مقرر کیا۔ ایسا خصوصی وظیفہ صرف آپ ہی کو دیا گیا۔

۱۸۹۴ء میں اَنجمنِ حمایتِ اِسلام کا وفد ریاست بہاولپور پہنچا تو مولانا نے والیٔ ریاست کے دربار میں اپنا بے نظیر قصیدہ پیش کیا۔ جس پر اَنجمن کیلئے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ آپ اَنجمن کے ابتدائی اکابرین میں سے تھے اور یہ تعلق تادم زیست قائم رہا۔

مولانا شروع میں اندرون موری دروازہ جنڈی والی مسجد کیساتھ "ذیلداراں دی گلی" میں رہتے تھے اور جنڈی والی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں یہاں ہندو بڑی تعداد میں رہتے تھے اور مسلمان شرک جیسی برائی میں مبتلا تھے۔ مولانا کی مسلسل کوششوں سے یہ لعنت بہت حد تک کم ہوگئی۔ علم و اَدب کی دُنیا میں مولانا بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ آپ سے ایک عہد فیض یاب ہوا۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳ـ۱۹۶۳ء پرنسپل اورنٹیل کالج) حمید نظامی (م۔۱۹۶۲ء) غلام رسول مہر' عبدالمجید

سالک، پروفیسر عبدالقیوم بٹ، پروفیسر ڈاکٹر صدر الدین، خوشی محمد ناظر، چوہدری محمد علی (۱۹۰۵۔۱۹۸۰ء سابق وزیر اعظم)۔ ملک غلام محمد (۱۸۹۵۔۱۹۵۶ء) سابق گورنر جنرل) محمد حسن قرشی، میاں امیر الدین۔ چوہدری رحمت علی (۱۸۹۷۔۱۹۵۰ء) ڈاکٹر غلام جیلانی برق (۱۹۰۱۔۱۹۸۵ء) سید نذیر نیازی، خواجہ دل محمد (۱۸۸۴۔۱۹۶۱ء) سراج الدین پال (۱۸۹۶۔۱۹۷۶ء) قاضی فضل حق، چوہدری محمد حسین (۱۸۹۴۔۱۹۵۰ء) اور دیگر سینکڑوں نامور ہستیاں شامل ہیں۔

مولانا روحی حق بات کہنے سے کبھی نہیں ڈرتے تھے۔ جنگ عظیم اول کے دنوں میں حکومت ہند نے ہندوستان کے تمام علماء سے ترکوں کے خلاف جنگ کا فتویٰ حاصل کرنے کی مہم چلائی۔ مولانا نے ہر قسم کے دباؤ اور لالچ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اِس فتوے پر دستخط کرنے سے اِنکار کر دیا۔ مولانا تمام عمر سیاست سے دور رہے لیکن اُنکی صدائے حق گاہے گاہے ایوان حکومت میں بھی سنی جاتی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں آپ نے انگریز فوج میں نوکری کو حرام قرار دینے کا فتوی جاری کیا۔ اِسی طرح عدم تعاون کی بھی تائید کی۔ مولانا ایک عظیم عالم دین، اُستاد، مقرر، خطیب، شاعر، مصنف اور مفتی تھے۔ مولانا کے مکان پر ہر مکتب فکر کے لوگ حاضر ہوتے اور زبان و اَدب، تاریخ و سیاست اور دیگر معاملات میں راہنمائی حاصل کرتے۔ اُس دور کے بہت سے اکابرین مثلاً علامہ اِقبال، سر محمد شفیع (۱۸۶۹۔۱۹۳۲ء) سر شیخ عبدالقادر (۱۸۷۴۔۱۹۵۰ء) مولانا احمد علی، سر شہاب الدین (۱۸۶۵۔۱۹۴۹ء) سر میاں فضل حسین (۱۸۷۷۔۱۹۳۶ء)، مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب اور علامہ عبداللہ یوسف علی آپ کے علم و فضل کے معترف تھے۔

مولانا نے عربی، فارسی میں درجنوں کتب تصنیف و تالیف کیں۔ جن میں سے "دبیر عجم" "مافی الاسلام" "امیر الکلام من کلام الامام"، "العروض والقوافی"، "ترجمہ قصیدہ بردہ" "سیطرۃ الاسلام علی النصاری الانام" اور عربی اور فارسی دیوان مطبوعہ ہیں، قرآن پاک کے آخری دو پاروں کا ترجمہ و تفسیر، خطبات عربی غیر مطبوعہ ہیں۔ مولانا نے ۱۹۰۳ء میں لاہور سے ایک علمی و اَدبی رسالہ "الہدیٰ" بھی جاری کیا جس کے دو تین سال مدیر رہے۔

علم و اَدب کے فلک کا یہ درخشندہ ستارہ ۳۱ مئی ۱۹۵۴ء کو غروب ہوا اور کٹھالہ (گجرات) میں جی ٹی روڈ کے کنارے اپنی تعمیر کی ہوئی مسجد کے ساتھ آسودہ خاک ہوئے۔ کتبہ قبر پر آپ کا اپنا کلام درج ہے جو آپ نے اِسی مقصد کیلئے لکھا تھا۔ (۱۸)

اِقبال اور روحی

"اِس شخص میں علم کا دریا بند ہے"۔ اِقبال (۱۹)

مولانا اصغر علی روحی ان بلند مرتبہ علمی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے علم و آدب کا نہ صرف اِقبال نے اعتراف کیا بلکہ علمی اور دینی مسائل پر اُن کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

پہلی ملاقات

مولانا روحی اور اِقبال کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملاقات اُس دور میں ہوئی جب اِقبال اور مولانا روحی دونوں اندرون بھاٹی دروازہ میں ہوتے تھے اور دونوں حکیم شہباز الدین کی بیٹھک کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ بیٹھک ۱۸۹۵ء سے ۱۹۲۲ء تک لاہور کے اہل سخن کی آماجگاہ تھی' جہاں اُس دور کے سبھی اہل ذوق مثلاً شیخ عبدالقادر ' سرشہاب الدین ' میاں محمد شفیع ' مفتی عبد اللہ ٹونکی' ارشد گورگانی (۱۸۵۰-۱۹۰۶ء) ناظر حسین ناظم ' فقیر سید افتخار الدین ' مرزا سلطان احمد ' شیخ گلاب دین (م-۱۹۳۷) مولانا عبدالحکیم کلانوری ' خواجہ رحیم بخش ' جسٹس شاہ دین ہمایوں (۱۸۶۸-۱۹۱۸ء) اکٹھے ہوتے اور ہر شام یہاں علم و آدب اور فکر و دانش کا بازار گرم ہوتا اور شعر و سخن سے حظ اٹھایا جاتا۔ اِقبال اور مولانا روحی بھی اِس مجلس کے اراکین میں شامل تھے۔ بعد میں جب مراسم بڑھے تو اِقبال علمی و دینی امور میں راہنمائی کیلئے مولانا کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ گھنٹوں مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوتا۔

اَنجمن حمایت اِسلام

"مولانا روحی اَنجمن حمایت اِسلام کے ابتدائی اراکین میں سے تھے اُس اَنجمن کے جلسے اُس دور کی ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں۔

"اِسلامیت کے احیا میں اَنجمن کے کارناموں کا ایک اور پہلو بھی ہے جس میں اَنجمن کو یگانہ حیثیت حاصل ہے۔ وہ اِس کے سالانہ اجلاس ہیں۔ یہ اجلاس دین حق ' اِسلامی اقدار ' اِسلامی علوم اور اِسلامی ثقافت کے فروغ اور نشرو اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے۔ پاک و ہند کے تمام بڑے بڑے عالم ' خطیب ' شاعر محقق اِن جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ مولانا حالی ' مولانا شبلی ' مولانا سلیمان پھلواروی ' مولانا اصغر علی روحی ' مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی ' مولانا ثناء

اللہ ' مولانا نذیر احمد دھلوی ' اور سینکڑوں دوسری ممتاز ہستیاں یہاں آتی تھیں اور ہر سال تین دِن تک مسلمانوں کا بہت بڑا اجتماع عوام و خواص میں زِندگی کی تازہ روح پھونکنے کا باعث بنا رہتا تھا۔" (۲۰)

اِقبال جب باقاعدہ طور پر اَنجمن کے جلسوں میں اپنی نظمیں سنانے لگے اور اُنکا کلام "مخزن" کے صفحات کی زینت بننے لگا تو مولانا نے اُن کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کی جو حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ اَنجمن کے پلیٹ فارم سے دونوں کے مراسم میں قربت آئی۔

علمی مسائل پر مشورہ

جن دِنوں علامہ "خطبات مدراس" کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ بعض علمی اور دینی مسائل پر مولانا سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۴ء) نے اپنی کتاب "اِقبال کی صحبت میں" میں خطبات مدراس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ (۲۱)

"میں علامہ کے حکم پر اُن کی خدمت میں مولوی سید طٰہٰ ' مولوی اصغر علی روحی اور مولوی غلام مرشد صاحب کو لے کر گیا اور اُن کے ساتھ طویل ملاقاتیں ہوئیں۔"

مزید لکھتے ہیں۔

"ایک روز مولانا علامہ کی کوٹھی پر گئے تو علامہ کوٹھی کے صحن کے درمیان چارپائی پر بیٹھے تھے اور حقے کی نے ہاتھ میں تھی۔ مولانا نے بے تکلفی سے حقے کا رخ اپنی طرف کرلیا اور زور کا کش لگایا۔ مگر حقہ بجھا ہوا ہونے کی وجہ سے بدمزہ ہوئے اور کہنے لگے ' یہ کیسا مذاق ہے! آپ اِس طرح حقہ پیتے ہیں" اِس پر علامہ نے فرمایا "حضرت میں حقہ پی نہیں رہا تھا محض اِس سے باتیں کر رہا تھا" یہ کہہ کر علی بخش سے حقہ تازہ کرنے کو کہا اور مولانا اَپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ بعض حوالوں کے سلسلے میں مولانا کہنے لگے۔ "وہ لوگ بکتے ہیں جو کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں۔ نہیں! ہر لفظ الگ الگ اپنا خاص معنی و مفہوم رکھتا ہے۔"

شاعری میں مشورہ

علامہ فارسی شاعری پر بھی مولانا روحی کی رائے لیا کرتے تھے۔ اِقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام اَپنے ایک خط محررہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں اپنے کچھ اشعار میں اِستعمال کردہ

بعض تراکیب اور الفاظ کی اسناد پر بحث کی ہے۔ سند نمبر۱۹ پر لکھتے ہیں
"شاہِ رمز آگاہ شد محوِ نماز خیمہ برزد از حقیقت در مجاز
نعرہ زد شیرے از دامانِ دشت دشت و دد از ہیبتش لرزندہ گشت
اِن اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے اُس سے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اِسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے۔"(۲۲)
بعد میں اِقبال نے درج بالا اشعار میں سے دوسرے شعر میں تبدیلی کر کے اُسے یوں کر دیا تھا:۔(۲۳)

شیر بر آمد پدید از طرف دشت
از خروشِ او فلک لرزندہ گشت

اُن دِنوں جب یہ خط لکھا گیا علامہ اِقبال اِسلامیہ کالج میں پروفیسر ہیگ کی اچانک موت کے بعد فلسفہ پڑھانے کی خدمت سرانجام دے رہے تھے اور مولانا اِسی کالج میں عربی اور فارسی پڑھانے پر مامور تھے' چنانچہ اُس دور میں تبادلہ خیال کے زیادہ مواقع میسر تھے۔
۱۹۳۱ء میں "جاوید نامہ" کی ترتیب کے وقت بھی شیخ محی الدین ابن عربی کی بعض عبارات کی تشریح کیلئے علامہ' مولانا روحی سے رجوع کیا کرتے تھے۔(۲۵)

نصاب کمیٹی میں

اَنجمن حمایت اِسلام نے اشاعت اِسلام کی غرض سے "مدرسہ تدریب المبلغین" قائم کر رکھا تھا۔ اُسکے طلباء کی اکثریت میٹرک پاس ہوا کرتی تھی اور نصاب کی بعض کتب اُن کی استعداد سے بالا تر تھیں' چنانچہ ۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو نصاب میں ضروری ردوبدل کیلئے ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولانا روحی اور اِقبال دونوں شامل تھے۔ اِس کمیٹی کے کام کے دوران بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا(۲۶)

ایک واقعہ۔ اِقبال کی زبانی

یہ اُس دور کا ذِکر ہے جب اِقبال بھاٹی دروازہ کے اِندر قیام پذیر تھے اور حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق وہ اور مولانا روحی دوسرے شعراء کیساتھ بھاٹی دروازہ میں ہونیوالے مشاعرہ میں شریک ہوتے تھے۔ اِقبال اِس مشاعرہ کے علاوہ مولانا کے گھر بھی جایا کرتے تھے۔ اُنہیں دنوں مندرجہ ذیل واقعہ پیش آیا جو خود علامہ مرحوم نے اِن الفاظ میں بیان کیا:۔

" کچھ عرصہ ہوا ایک دولت مند، تعلیم یافتہ ، روشن خیال اور کاروباری ہندو مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس آیا۔ اُس نے مولانا سے درخواست کی" آپ ایک الگ کمرے میں آجائیں" مولانا اُس کی درخواست کے مطابق تنہا کمرے میں چلے آئے اور فرمایا" کیا ارشاد ہے؟" نووارد نے کہا" مولانا! مجھے مسلمان بنائیے" مولانا نے اِسلام کی تلقین کی۔ خدا کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار لیا اور پوچھا کہ آپ اِس طرح تنہائی میں کیوں داخل اِسلام ہوتے ہیں۔ نووارد نے بیان کیا، میں نے کوئی اِسلامی کتاب نہیں پڑھی کسی مسلمان عالم سے اِسلام کو نہیں سمجھا لیکن خوش قسمتی سے کئی مرتبہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے۔ اب میں حضور کی محبت میں بے تاب ہوں اور اِسلام قبول کرنے پر مجبور ہوں ۔ مولانا نے پوچھا " پھر آپ فیروز پور سے چل کر لاہور کیوں آئے اور کھلے بندوں کیوں اِسلام قبول نہیں کیا؟" نووارد نے اِس سوال کے جواب میں اپنی تعلیم ، ملازمت ، کاروبار اور جائیداد وغیرہ کے حالات مولانا کے سامنے بیان کیے اور کہا " اِن حالات کی بناء پر میں اعلان کرنے سے معذور ہوں لیکن میں آپ کو اَپنے اِسلام پر گواہ بنانے آیا ہوں۔ میں اللہ کی وحدت اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔ آپ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرے ایمان کی شہادت دیجئے۔ میری یہ عرصے سے آرزو تھی کہ میں اِس دُنیا میں کسی نیک مسلمان کو اَپنے ایمان کا گواہ بنالوں۔ خدا کا شکر ہے کہ آج میری یہ آرزو پوری ہوئی۔"

(کریسنٹ ۱۹۹۲ء۔ اِسلامیہ کالج لاہور صفحہ ۱۲۰)

ڈاکٹر محمد شجاع ناموس

ذکاء الملک ' فریدون زماں ڈاکٹر خواجہ محمد شجاع ناموس ممتاز ماہر تعلیم ' ماہر لسانیات ' سائینسدان ' موٴرخ ' شاعر ' دانشور اور اِقبال شناس تھے۔ اِقبال کے فیض یافتہ مداح اور کلام اِقبال کے شیدائی اور شارح تھے۔

محمد شجاع ۱۹۰۰ء میں گجرات شہر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں مشن ہائی سکول گجرات سے میٹرک کیا اور پورے ضلع میں اول آئے۔ اِسی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں ایم ایس سی کر کے فارغ ہوئے۔ دوران تعلیم کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔ فٹ بال ٹیم اور ڈرامیٹک کلب کے فعال رکن اور جونز سائنٹیفک سوسائٹی کے سیکرٹری اور نائب صدر رہے۔

اُنہوں نے عملی زِندگی کا آغاز ایک اُستاد کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۲۲ء میں حبیبیہ کالج کابل میں صدر شعبہ سائنس کے طور پر ایک سال تک کام کیا۔ پھر شملہ چلے گئے اور حکومت ہند کے محکمہ موسمیات میں ملازمت کرنے لگے۔ ۱۹۲۷ء میں محکمہ تعلیم میں شمولیت اختیار کی اور ایس ای کالج بہاولپور میں صدر شعبہ سائنس مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں فارسی زبان کے مطالعہ کی غرض سے ایران روانہ ہوئے۔ وہاں سے واپسی پر اِنڈین اِنسٹیٹیوٹ برائے فروغ سائنس کلکتہ میں نوبل اِنعام یافتہ ہندوستانی سائنسدان سر سی وی رامن کی زیر نگرانی طبیعات میں تحقیقی کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں عربی زبان و آدب کے مطالعہ کیلئے عراق کا سفر اختیار کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی ' ایم ایس سی کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کے امتحانات پاس کیے۔ ایم اے اُردو بھی کیا اور ۱۹۳۸ء میں لائبریری سائنس کی خصوصی تربیت حاصل کی۔ اِسی سال ایم اے تاریخ کا امتحان پاس کیا اور "اِسلامی ثقافت اور سائنس کی تاریخ" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیلئے مقالہ لکھنا شروع کیا جس پر بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈگری دی گئی۔ علامہ اِقبال کی تحریک پر پشتو زبان سیکھی اور صوبہ سرحد کا مطالعاتی دورہ کیا۔ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کی رائل سوسائٹی آف لٹریچر کے رکن بنے۔ علاوہ ازیں وہ برطانیہ اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور فوٹوگرافک سوسائٹی کے بھی ممبر رہے۔ امریکہ کی اَنجمن تاریخ و سائنس کے بھی رکن رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کیلئے میٹرک کیلئے اُردو ' پنجابی اور ہندی میں سائنسی اصطلاحات تیار کیں اور انکی تشریحات لکھیں

۱۹۴۲ء میں ایس ای کالج بہاولپور کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں وہاں

سے سبکدوش ہوئے ۔ ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا مگر اسی سال پبلک سکول پشاور چھاؤنی کی بنیاد رکھی گئی اور آپ اِس کے پرنسپل مقرر ہوئے ۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک گلگت اور بلتستان کے افسر تعلیمات رہے اِسی دوران شنا زبان پر تحقیق کی اور "گلگت اور شنا زبان" کے نام سے تفصیلی کتاب لکھی جو اِس موضوع پر اولین کتاب شمار ہوتی ہے ۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۷ء تک پنجاب یونیورسٹی میں افسر بکار خاص رہے ۔ ۱۹۵۷ء میں ایشیا فاؤنڈیشن سکالر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کالج برائے ہوم اینڈ سوشل سائینسز لاہور میں لیکچرار رہے ۔ اگلے سال گورنمنٹ اسمٰعیل کالج بھکر کے پرنسپل ہوئے اور اِس کالج کی تعمیر و ترقی کیلئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں ۔

ڈاکٹر ناموس ایک ہمہ جہت شخصیت تھے ۔ گو عملی سیاست سے دور رہے مگر علمی محاذ پر مسلم لیگ کے موقف کی بھرپور تائید کی ۔ تقسیم سے قبل اُنہوں نے ایک پمفلٹ میں ہندوستان کی قومی اکثریت کی بناء پر تقسیم کا منصوبہ پیش کیا تھا ۔ ڈاکٹر ناموس علم و تحقیق کے سچے عاشق اور عظیم ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ اُنہوں نے ۳۵ کے لگ بھگ کتب لکھیں اور درجنوں مقالات قلمبند کیے ۔ ۱۹۳۶ء میں رسالہ "محقق" بھی جاری کیا ۔ اُنکی کتب کے موضوعات سے اُن کے وسیع المطالعہ اور جامع الکمالات ہونے کا پتا چلتا ہے ۔ اُنکی کتب میں "صبح ازل" (مجموعہ کلام) آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان ' آزاد قوم کا نظام تعلیم اور پاکستان ' بزم فردوس ' گلگت اور شنا زبان ' حکمت اِسلامی کے مغرب پر احسانات ' مسلم ثقافت ' ایران ' دھلی ' سفرنامہ حج و حجاز ' فوٹوگرافی ' ہاتھ میں قسمت (پامسٹری) وغیرہ شامل ہیں ۔

بہاولپور میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ "الفردوس" اور لاہور میں "ناموس نگر" علمی و اَدبی سرگرمیوں کا مرکز تھے ۔ جہاں علم و فضل کے شیدائی جمع ہوتے اور مختلف علمی اور فکری موضوعات پر بحث ہوتی ۔

ناموس صاحب نے عمر کا آخری حصہ لاہور میں گزارا جہاں وہ ۵ جنوری ۱۹۸۱ء کو فوت ہوئے اور قبرستان میانی صاحب میں دفن کیے گئے ۔ (۲۶)

اِقبال اور ناموس

اِقبال اور ناموس میں ایک اُستاد' شاگرد اور ایک مُرشد و مرید کا تعلق تھا۔ اِس تعلق کی تمام تر تفصیلات خود ڈاکٹر ناموس نے قلمبند کر دی تھیں جن کے ذریعے ہم دونوں کے باہمی تعلقات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ناموس کا ایک مضمون بعنوان "اُستاد سے شاگرد کی چند ملاقاتیں" روزنامہ اِمروز لاہور کے اِقبال نمبر مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اِس مضمون کو رحیم بخش شاہین نے "اوراقِ گم گشتہ" میں شامل کیا' جہاں سے اس مضمون کے ضروری حصے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ (مضمون کے شروع میں ڈاکٹر ناموس نے جن شاہ صاحب کا ذکر کیا ہے ان کا نام سلامت اللہ شاہ تھا۔ بالِ جبریل کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ہی شائع کیا تھا۔ یونائیٹڈ آکشن مارٹ کے نام سے نیلام گھر چلاتے تھے)

اُستاد سے شاگرد کی چند ملاقاتیں

آز ڈاکٹر محمد شجاع ناموس

"میرے اُستاد ڈاکٹر علامہ اِقبال باغ و بہار طبیعت لے کر اُس عالم فانی میں وارد ہوئے تھے۔ فراست' حقیقت میں ذوق سلیم اور انوار کلیم کی دوسری شکل ہے۔ بات سے مزاح کی بات نکال لیتے۔ مطالب کے قالب کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے۔ ڈال سے پات نکلتے چلے جاتے۔ فلسفیانہ نکتوں کو چند لفظوں میں اِس طرح حل کر دیتے کہ سب حاضرین مجلس حیران رہ جاتے۔ ان میں سربرآوردہ تھے جناب سید نذیر نیازی' جناب حکیم محمد حسن قرشی' جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور شاہ صاحب جن کا میکلوڈ روڈ پر نیلام گھر تھا۔ شاہ صاحب تو اللہ کو پیارے ہوگئے مگر نیلام گھر اب بھی موجود ہے۔ میں اکثر علامہ اِقبال کے ہاں حاضری دیا کرتا تھا۔

۱۹۱۶ء کا ذکر ہے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی کا طالبعلم تھا۔ فٹ بال کھیلتا شعر کہتا تھا۔ کالج میں مشاعرہ کا غلغلہ بلند ہوا' پارٹی کے طلباء' رؤساء اور خود ساختہ شعراء نے مصرع طرح پر غزلیں کہیں۔ ہماری پارٹی کے ارکان نے بھی غزلیں کہیں اور علامہ اِقبال کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ غزلوں کی اصلاح کیلئے میں اُن کے ساتھ گیا۔ اِقبال اُس دور میں انارکلی میں رہتے تھے۔ جہاں اب شیخ عنایت اللہ کی دوکان ہے اُس کے سامنے انکا چوبارہ تھا سلام و پیام کے بعد سلسلہ کلام شروع ہوا۔ علامہ اِقبال لاہور گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے۔ یہاں پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ اِس لیے گورنمنٹ کالج سے اُنکو قلبی محبت

اور روحانی مودت تھی۔ پارٹی کے سربراہ نے مشاعرے کا ذکر کیا تو علامہ اِقبال نے فرمایا "اچھا مصرع طرح کیا ہے؟" لڑکوں نے اپنی اپنی غزل پڑھنی شروع کی اور علامہ اِقبال حسب ضرورت اشعار کی اصلاح کرتے رہے گویا علمی تفریح ہو رہی تھی۔

علامہ اِقبال عام طور پر آپنے روز مرہ کے معمولات میں ہمیشہ پنجابی میں گفتگو کیا کرتے تھے جب تک کہ اُن کو اُردو یا انگریزی بولنے پر مجبور نہ کیا جائے اور جب انگریزی بولتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پنجابی نژاد انگریزی بول رہا ہے۔ میرے دِل نے مجھ سے کہا' اِس عظیم ہستی نے بڑا دماغ پایا ہے۔ اِس کے بعد لڑکوں نے فرداً فرداً اپنی غزلیں پڑھیں کوئی آدھا گھنٹہ گزر گیا تو مجھے ہوش آیا۔ اوسان واپس آگئے۔ اور میں محسوس کرنے لگا کہ کہاں بیٹھا ہوں اور کیا ہو رہا ہے۔ میں نے بھی اشعار کی اصلاح میں چونچ مارنی شروع کی۔ وہاں محفل آرائی تھی اور ہر کوئی آزادی سے اپنی رائے پیش کر رہا تھا۔ آخری صاد علامہ کا ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ غزل کو عمدہ شکل دینے کا یہ بہت کامیاب طریقہ ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت علامہ نے مجھ سے پوچھا۔ "اوئے توں کونڑ ایں؟" میں نے عرض کیا "جناب میں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی میں پڑھتا ہوں" فرمایا "اوئے توں میرے کول کدی کدی آیا کر"۔ گورنمنٹ کالج کے طلبہ کا انارکلی راہ گزر ہے اور میں کواڈرینگل ہوسٹل میں رہتا تھا۔ دِن رات یہی گردش 'جب موقع ملا سلام کیا' بیٹھے' بات ہوئی' چلے آئے۔

زمانے کی تسبیح نے روز و شب کے منکے رولے۔ ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال بنتے چلے گئے۔ میں ایم ایس سی کا امتحان ۱۹۲۱ء میں پاس کر لیا۔ پھر حاضر ہوا تو فرمایا "دیکھو! دور جدید میں ہمیں فارسی عربی کے دیوانوں کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اقوام عالم کے سامنے فصاحت کیساتھ اِن علوم و فنون کو نمایاں کریں جو اُن کے بزرگان نے آپنے سنہری عہد میں تحقیق و تخلیق کیے تھے اور جن کی بناء پر آج کی دُنیا اُس عروج تک پہنچ سکی۔ یورپ تو تجاویز بنا کر صرف کثیر سے اِسلام کی عظمت کو پس پشت ڈال رہا ہے اور آپنے علماء کے کارناموں کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ہے اگر چہ عہد متوسط کے یورپ کے تمام علوم و فنون کے ماخذ اِسلامی علوم ہیں اور اکثر اوقات تو وہ اِسلامی علوم کے تراجم ہیں جو یورپ کے عالموں نے آپنے نام سے شائع کر دیئے۔ تم اُس تحقیق کی تکمیل کرو اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اِنگریزی زبان فزکس' کیمسٹری' باٹونی' ذوالوجی' ریاضی تو سبقاً سبقاً کالج میں پڑھ لی مگر جب تک تم فارسی' عربی پر مکمل عبور حاصل نہیں کرو گے تم اِس اہم اِسلامی فریضہ کو ادا نہیں کر سکو گے۔ اِس لئے لازم ہے کہ تم فارسی اور عربی پڑھو اور اتنی

پڑھو کہ تم براہ راست مسلمان علماء کی کتابوں سے بلا تکلف اِستفادہ کر سکو جو عربی میں لکھی ہیں۔

علامہ نے میرے علمی کیریئر کو خود تجویز کیا اور اِس کو عملی جامہ پہنایا اور ہر قدم پر میری رہبری کرتے رہے۔ علی گڑھ سے فارسی کا ایم اے کرنے کا حکم دیا تو اَپنے ہاتھ سے وائس چانسلر اور جناب پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کو خط لکھ کر میرے ہاتھ بھجوایا۔ اِس کے بعد میں نے فاضل فارسی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔

اب عربی کی باری آئی تو فرمایا": او واہی کاکا ایہہ تے تینوں پڑھنی ای پوے گی۔ عربی وچ ای تے سارے اِسلامی علوم لکھے ہوئے نیں۔ توں ریسرچ کی کریں گا جے تینوں عربی زبان تے کامل عبور ناں ہووے گا' پڑھ' شاباش میں جانڑناں توکرلیں گا' بس توں شروع کر دے" اتنی میٹھی اور من موہنی گفتگو وہ بہت کم کیا کرتے تھے چونکہ اِس میں شفقت کی شیرینی اور قدسی رنگینی کا امتزاج راج کر رہا تھا' میں نے یقین کر لیا کہ یہ ضرور کوئی میری بھلائی کی بات ہے جو میرے راہنما فرما رہے ہیں' میں نے اِس حکم پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

اَپنے ہاتھوں سے عربی کے ماہر فاضلوں کو رقعہ جات لکھ کر دیئے کہ اِس کو عربی پڑھاؤ اِنکو خیال ہو گا کہ یہ سائنس کا آدمی ہے بھاگ جائے گا میں نے عربی ایم اے حکم کے مطابق پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا' عربی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا پھر ایم او ایل کی ڈگری ملی۔ اُستاد گرامی کے حکم کے مطابق پشتو کا امتحان بھی پاس کیا۔ پہلے میں نے کچھ سر پھیرا۔ پشتو کونسی کلاسیکی زبان ہے اور اِس محنت سے مجھے کیا حاصل ہو گا۔ اُستاد کچھ گرم ہو گئے۔ میں ڈر گیا اور "بہت اچھا جناب" کہہ کر سر تسلیم خم کر دیا۔

ہم سب شام کی بزم اِقبال کے شرکاء حضور کا بے حد احترام کرتے تھے۔ کسی کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ سامنے جواب دے یا اِنکار کرے یا بحث شروع کر دے۔ یوں لطیفے بھی ہوتے چٹکلے بھی چلتے' شعروشاعری بھی ہوتی' چونکہ یہی علامہ کی روحانی غذا تھی اور طعام بے نمک' غذا بے مصالحہ بد مزا ہوتی ہے اِسی سبب سے علامہ کو فضیلت اور تفکر میں ہم وزن' بزم کے شرکاء کی ضرورت رہتی تھی۔ تاکہ وہ اَپنے تعمیری تخیل کو تنقید کی کسوٹی سے خود صیقل کرتے رہیں۔ اسی فاضلانہ ماحول میں اُستاد گرامی کے لب مبارک سے ہزاروں باریک نکتے آز خود حل ہوتے چلے جاتے اور ہم اَپنے سینے کے خزانے میں طلائی حروف سے لکھ کر محفوظ کر لیتے۔ حکم اُستاد سے فرار کفر کا اظہار ہے۔ میں نے پشتو زبان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اِس موقع پر اُنہوں نے کہا کہ دُنیا میں مسلمانوں کی پانچ عظیم زبانیں ہیں عربی اِسلام کی مذہبی زبان ہے اور فارسی ثقافتی' ٹرکش اِسلام کی تلوار ہے اور اُردو سب سے زیادہ بولی

جانے والی زبان کا درجہ رکھتی ہے اور پشتو پڑھے بغیر تم پشتون عوام کی تاریخ' ثقافت اور زبان کا مطالعہ نہیں کر سکتے اور نہ اُن کی تعلیم و تحقیق لکھ سکتے ہو۔"

علامہ اقبال کا کرم صرف یہ نہیں کہ اُنھوں نے مجھے چند الفاظ پڑھائے یا پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری میں بہ نفس نفیس میرے ساتھ کام کرتے رہے یا گھنٹوں میری رہبری کرتے رہے بلکہ یہ کہ میرے سینے میں سوز و ساز کا ایک بیج لگایا' اِس میں کونپل نکلی تو اُس کی آبیاری کی' کبھی اِس کو زبان مبارک کے آب کوثر سے سینچا' لو کے گرم تھپیڑوں کا مزہ چکھنے کیلئے کبھی اِسے دھوپ میں کھڑا کر دیا"(۲۷)

ڈاکٹر ناموس نے اقبال پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان ہے۔

A Discussion on Iqbal's Philosphy of Life

یہ تحریر انگریزی زبان میں ایس ای کالج بہاولپور کے مجلّے ' نخلستان ' میں دوبارہ شائع ہوئی۔ رحیم بخش شاہین نے اپنے مقالہ (۲۸) میں اس کا اُردو ترجمہ پیش کیا ہے۔اِس سے بھی دونوں شخصیات کے مراسم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

خطوط اقبال بنام ناموس

ڈاکٹر ناموس کے مندرجہ بالا مضمون سے اُن کے اقبال سے مراسم کی نوعیت تفصیلی طور پر سامنے آتی ہے۔ ناموس کو اقبال سے جو محبت اور عقیدت تھی اُس کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ دوسری طرف اقبال کے خطوط بنام ناموس سے ہمیں فریق ثانی کے جذبات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اقبال اور ناموس کی باہمی خط و کتابت سے بھی اُن کے باہمی تعلقات کی قربت کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی ناموس کی محبت اور خلوص کی قدر کرتے تھے نیز اُنکی ذہنی صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے۔

دستیاب خطوط کی تعداد چھ ہے اور اُن کا عرصہ ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء سے ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء تک ہے۔ دوسرے اور تیسرے خط میں جس کتاب "سر السماء" کا ذکر ہے وہ اقبال کو کافی عرصے سے درکار تھی۔ زمان و مکان کے مسئلے پر لکھنے کے لئے اُنہیں کسی ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا حال درج ہو۔

مولوی محمد صالح کے نام ایک خط محررہ جون ۱۹۳۰ء میں لکھتے ہیں

"حضرت خواجہ نظام الدین صاحب سے یہ معلوم کیجئے کہ آیا اُن کے بزرگوں کے کتب خانے میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا وہ رسالہ موجود ہے جس میں اُنہوں نے آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا ذکر کیا ہے' مجھے اُس کی مدت

سے تلاش ہے" (۲۹)

مولوی صاحب نے جواباً "سرالسماء" نامی کتاب کے بارے میں اطلاع دی، جس میں مطلوبہ موضوع پر بحث تھی۔ علامہ نے ۱۹ جون ۱۹۳۰ء کو لکھا۔

"سرالسماء کا ذکر میں نے آج تک نہیں سنا، اِس کتاب کی تلاش بھی جاری رکھیے شاید بہاولپور سے ملے" (۳۰)

۲۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو لکھتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ اِس کے مطالعے سے گوہر مقصود ہاتھ آئے گا۔۔۔۔
کتاب سرالسماء کے حصول میں عجلت فرمائیے" (۳۱)

۹، اگست ۱۹۳۰ء کو مولوی صاحب کو لکھتے ہیں۔ (۳۲)

"مجھے اندیشہ ہے کہ مولوی احمد سعید صاحب کتاب عاریتاً نہ دیں گے۔ بہتر ہو گا کہ خواجہ صاحب بہاولپور سے کسی ایسے آدمی کو مقرر فرمائیں جو اِس کتاب کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ وہ مولوی صاحب کی موجودگی میں کتاب مذکورہ کا وہ حصہ دیکھیں جس کا تعلق سیارات سماوی اور متعلقہ امور سے ہے"

آخر یہ سعادت ڈاکٹر ناموس کے حصے میں آئی کہ وہ اِقبال کیلئے وہ کتاب تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے، جس کی اُنہیں مدت سے تلاش تھی۔

چوتھے خط سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر ناموس، اِقبال کی پسند و ناپسند سے بھی واقف تھے اُنھوں نے علامہ کو شلغم کا اچار بھیجا ہے اور وہ شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

چھٹے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ناموس صاحب نے شہتوت کا ایک درخت محض اِس خیال سے محفوظ کیے رکھا کہ ربِ شہتوت اِقبال کی گلے کی بیماری میں مفید ہو سکتا تھا۔ اِقبال نے جواب میں بہت پیارا فقرہ لکھا

"اگر اِس کا پھل فائدہ نہ بھی کرے تو ممکن ہے آپ کے اخلاص کی برکت سے فائدہ ہو جائے"

یہ خطوط اِقبالنامہ حصہ اول صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۱ سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ خط نمبر ۲ کو اِقبالنامہ میں "بلا تاریخ" ظاہر کیا گیا ہے۔ اندازاً یہ خط اگست ستمبر ۱۹۳۱ء کا ہے۔ تیسرے خط پر تاریخ ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء ظاہر کی گئی ہے۔ متن سے ظاہر ہے کہ یہ خط ۲۰ جنوری ۱۹۳۲ء کا ہے (نئے سال کے شروع میں یہ غلطی عموماً ہو جاتی ہے) پانچویں خط کا عکس صفحہ پر ہے۔

(۱)

لاہور

۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء

ڈیئر خواجہ شجاع ' السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کیلئے سراپا سپاس ہوں

بڑی خوشی سے تشریف لایئے۔ میں ۱۴ فروری کو غالباً لاہور ہی میں ہوں گا۔ اگر کہیں باہر جانے کا اتفاق ہو گیا تو لکھ بھیجوں گا۔ فوٹو میرے پاس اِس وقت موجود نہیں۔ لیکن میں کوشش کرونگا کہ آپ کی تشریف آوری تک دستیاب ہو جائیں۔ باقی رہے منظومات! سو یہ ہندی فارسی ہے ایک ایرانی کو کیا پسند آئیگی۔ میرے زیر نظر حقائق اخلاق و ملی ہیں۔ زبان میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے بلکہ فن شعر سے بھی میں بحیثیت فن نابلد ہوں اگر ان خیالات کو کوئی شخص اُن کی مروجہ زبان میں لکھ دے تو شاید اُن لوگوں کیلئے مفید ہو۔ بہرحال جو کچھ شائع ہو چکا ہے حاضر کر دیا جائے گا آخری نظم "جاوید نامہ" جس کے دو ہزار شعر ہونگے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائین کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اِس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہو گا اور اِس میں غالباً ہندو ایران بلکہ تمام دُنیائے اِسلام کیلئے نئی باتیں ہونگی۔ ایرانیوں میں حسین ابن منصور حلاج ' قرۃ العین ' ناصر خسرو علوی وغیرہ کا نظم میں ذِکر آئے گا۔ جمال الدین افغانی کا پیغام ' مملکت روس کے نام ہو گا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا

مخلص محمد اقبال

(۲)

لاہور

مائی ڈیئر مسٹر شجاع

آپ نے کتاب " سرالسماء " کے سلسلے میں جو زحمت گوارہ فرمائی اِس کیلئے نہایت ممنون ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کتاب کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ مجھے صرف اِس قدر اطلاع کی ضرورت ہے کہ آیا اِس کتاب کا موضوع فلکیات سے ایک سائینٹفک بحث ہے یا صرف اِس میں آسمان کی کیفیات ' تخیل یا مذہبی تجربہ یعنی مشاہدہ روحانی یا وحی و الہام کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔ اکثر مسلمان صوفیاء نے آسمانوں سے اِسی انداز بحث کی ہے۔ اگر کتاب پر مؤخر الذکر صورت کا اطلاق ہوتا ہو تو میں یا خود آؤں گا یا چودھری محمد حسین صاحب کو بھیجوں گا۔

آپکا محمد اقبال

(۳)

لاہور

۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء

ڈیئر خواجہ شجاع ' اَلسلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کیلئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے کتاب کی عبارت نقل کرنے میں بڑی زحمت اٹھائی۔ میر سراج الدین صاحب میرے پرانے مہربان ہیں۔ میں نے انکو بھی اِس کتاب کیلئے لکھا تھا۔ بہرحال اب معلوم ہوا کہ کتاب میرے مطلب کی نہیں ہے۔

آپ لاہور تشریف لائیں تو فہرست ہمراہ لیتے آئیں ' ممکن ہے بعض کتابیں یا کُل پنجاب یونیورسٹی خرید لے۔ پروفیسر شفیع جو پنجاب یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ہیں اور جن کو غالبا آپ بھی جانتے ہونگے ' وہ بھی اِس فہرست کو دیکھ لیں گے اور دیکھنے کے بعد یونیورسٹی میں رپورٹ کر سکیں گے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اِقبال

(۴)

لاہور

۸ مئی ۱۹۳۲ء

جناب منعمی صاحب۔ اَلسلام علیکم

اچار کیلئے بہت بہت شکریہ! واقعی مجھے اچار شلغم سے بہت محبت ہے۔ خورجہ سے خود بھی ایک منگوایا تھا مگر وہ کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ جیسا سنا تھا اُس سے کم پایا۔ آپ کے خط میں نے خورجہ کو خواجہ پڑھا اور اِس سے یہ سمجھا کہ "ساخت خواجہ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ اچار آپ نے خود بنایا ہے۔ بہرحال شکریہ قبول کیجئے۔ والسلام

محمد اِقبال

(۵)

لاہور

۲۱ اگست ۱۹۳۲ء

ڈیئر منعمی صاحب۔ السلام علیکم!

میں آج صبح دھلی سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہندوستان سے باہر ہیں۔ بہرحال جس طرح آپ نے ایران میں رہ کر فارسی سیکھی اِسی طرح اب عربی

سیکھنے کا موقع ہے۔ خوب سیکھئے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ عربی دانی سے آپ کی دلچسپی جو آپ کو فارسی لٹریچر سے ہے کم ہو جائے گی۔ کوئی آدمی عربی زبان کے "چارم" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے طالبعلمی کے زمانے میں عربی خاصی سیکھ لی تھی مگر بعد میں اور مشاغل کی وجہ سے اُس کا مطالعہ چھوٹ گیا۔ تاہم مجھے اُس زبان کی عظمت کا صحیح اندازہ ہے۔

آپ کے خط کے ساتھ ہی اِنگلستان کی Aristotelion Society کا دعوت نامہ پہنچا کہ اِنگلستان آکر اِس سوسائٹی کے سامنے لیکچر دوں۔ ابھی جواب نہیں لکھ سکا۔ اگر عراق کی طرف سے بھی دعوت آگئی تو کیا عجب مزید کشش کا باعث ہو جائے اور میں ایک دفعہ پھر گھر سے باہر نکل سکوں۔ اگر اب کے نکلا تو سپین کی سیر کا بھی قصد ہے۔ اِنشاء اللہ عربوں کے قدیم شہر بھی دیکھوں اور ان پر لکھوں گا بھی۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

والسلام۔ مخلص، محمد اِقبال

(۶)

بھوپال

۱۵ اگست ۱۹۳۵ء

ڈیر مسٹر شجاع

میں بغرض علاج برقی بھوپال میں مقیم ہوں اور اگست کے اخر تک یہیں رہوں گا۔ میری صحت عامہ پہلے کی نسبت بہت اچھی ہے اور آواز میں بھی کسی قدر فرق ہے۔ امید ہے کہ اِس دفعہ کے علاج سے بہت فائدہ ہو گا۔

رب شہتوت کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا لیکن بعض لوگوں نے مجھ سے کہا ہے کہ مفید ہے۔ بہرحال آزمانے پر معلوم ہو گا۔ میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے محض میرے اِس درخت کی حفاظت کی۔ اگر اِس کا پھل فائدہ نہ بھی کرے تو ممکن ہے آپ کے اخلاص کی برکت سے فائدہ ہو جائے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے

والسلام۔ محمد اِقبال

پروفیسر محمد اکبر منیر

محمد اَکبر منیر اِقبال کے اَحباب میں شامل تھے۔ وہ اقبال اور مولوی سید میر حسن دونوں کے فیض یافتہ بھی تھے۔ اِن کی علامہ سے خط و کتابت بھی رہی اور ملاقاتیں بھی۔

اَکبر منیر کا تعلق بنیادی طور پر گجرات سے نہیں تھا مگر وہ کم و بیش ربع صدی تک گجرات میں رہے اور "اَکبر منیر گجراتی" کہلانے لگے (۳۳)۔ اُن کے خود نوشت حالات (۳۴) کے مطابق وہ ۱۹ مارچ ۱۸۹۵ (بمطابق ۲۱ رمضان ۱۳۱۲ھ) کو ضلع سیالکوٹ کے گاؤں مراد پور میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں شہر سیالکوٹ سے مغرب کی جانب تقریباً ۴ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اَکبر منیر کے والد حکیم محمد حسین اَپنے وقت کے نامور عالم دین ' طبیب اور شاعر تھے اِن کے ہاتھ پر بہت سے خاندانوں نے اِسلام قبول کیا تھا۔ (۳۵) اَکبر منیر کے مورث اعلی شمس الدین ' نو مسلم راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اَکبر شہنشاہ کے عہد میں بسلسلہ ملازمت دہلی سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔

اَکبر منیر نے پرائمری تک تعلیم اَپنے گاؤں میں حاصل کی ۔ گورنمنٹ ہائی سکول سیالکوٹ سے ۱۹۱۲ء میں میٹرک کیا۔ ایف سی کالج لاہور سے ۱۹۱۴ء میں ایف اے کیا اور بی اے کیلئے اِسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے لیکن ایک سال بعد ۱۹۱۵ء میں کلکتہ چلے گئے اور اکتوبر ۱۵ء سے مارچ ۱۶ء تک چھ ماہ مولانا ابو الکلام آزاد کے "دار الارشاد" میں قرآن حکیم پر لیکچرز میں شرکت کرتے رہے واپسی پر اورنٹیل کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد دوبارہ اِسلامیہ کالج آئے اور ۱۹۱۸ء میں بی اے اور ۱۹۱۹ء میں ایم اے عربی کیا (۳۶)۔

ایم اے کے بعد پانچ سال بلاد اِسلامیہ کی سیر کرتے رہے۔ اِن پانچ سالوں (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء) میں وہ معلم بھی رہے اور متعلم بھی ۔ ایک سال بحرین ' دو سال شیراز ' ایک ماہ اصفہان ' ایک ایک سال طہران اور بغداد میں ٹھہرے ۔ بحرین اور بغداد میں اُنہوں نے عربی زبان و اَدب کا مطالعہ کیا اور ایران میں فارسی زبان و اَدب پر کتب اُن کے زیر مطالعہ رہیں ۔ ایران میں ملک الشعراء بہار ' یوسف اعتصام الملک ' علی اصغر خان حکمت شیرازی رشید یاسمی ' مرزا عباس خان اِقبال آشتیانی اور سعید نفیسی سے اَکبر منیر کا میل جول رہا۔

اگست ۱۹۲۴ء میں وطن واپس آئے اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے ۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں اُنہوں نے ایمرسن کالج ملتان سے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کیا اور مارچ ۱۹۵۱ء تک مختلف کالجوں مثلاً گورنمنٹ کالج لاہور ' انٹر کالج گجرات ' گورنمنٹ کالج ہوشیار پور اور

جالندھر میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اِنٹر کالج گجرات میں اُن کے قیام کا زمانہ اندازاً ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ زمیندار کالج گجرات سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۴ء تک عربی کے اُستاد کے طور پر کام کرتے رہے۔ اُس کے بعد وہ مستقلاً گجرات میں رہائش پذیر ہو گئے اور پہلے محلہ مسلم آباد میں ریکس سینما کے سامنے گلی میں اور پھر محلہ حسن پورہ (عقب ریکس سینما) میں مقیم رہے۔ وفات سے کچھ برس پہلے اپنے آبائی گاؤں (ڈسکہ سیالکوٹ) چلے گئے تھے۔ جہاں اکتوبر ۱۹۸۱ء میں فوت ہوئے۔

پروفیسر اَکبر منیر کی اُردو شاعری کی باقاعدہ ابتداء ۱۹۱۴ء میں لاہور میں ہوئی۔ اور جلد ہی اُن کی نظمیں ماہنامہ "صوفی" (منڈی بہاؤ الدین) جیسے اہم پرچوں میں چھپنے لگی تھیں۔ اُن کی فارسی شاعری کا غاز ۱۹۲۱ء میں اُن کے قیام شیراز کے دوران ہوا۔ وہاں اُن کی نظمیں، غزلیں وہاں کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔

اَکبر منیر کو اعلیٰ اَدبی ذوق ورثے میں ملا۔ مولوی میر حسن کی شاگردی، پھر لاہور کا قیام، ابوالکلام آزاد کے لیکچرز ایران و بغداد کا قیام، اِقبال کی حوصلہ افزائی، اُن کی ذاتی کاوشیں اور سب سے بڑھ کر اُن کے جبلی ذوق نے اُنہیں اُردو اور فارسی شعراء میں ایک معزز مقام حاصل کرنے میں مدد دی۔ وہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۲ء تک ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں کشمیر جنت نظیر میں گزارتے رہے، جہاں دِلکش مناظر فطرت نے اِن کی شاعری کو ایک خوبصورت پس منظر فراہم کیا۔

اَکبر منیر کی فارسی شاعری کا مجموعہ "ماہ نو" ۱۹۲۸ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے مولوی مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اُس میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک کا کلام شامل تھا۔ "ماہ نو" کو ہندوستان اور ایران کے بزرگ شعراء و اُدباء نے بہت سراہا۔ اَکبر منیر کی دیگر مطبوعہ کتب میں "نقشِ حق" (۱۹۴۲) اِس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں اِقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے) اور "لالۂ صحرا" (۱۹۳۸) اور جبرئیل و ابلیس (۱۹۴۱ء) شامل ہیں لالہ صحرا اور جبرئیل و ابلیس اُردو نظمیں ہیں جو اُنہوں نے اَنجمنِ حمایتِ اِسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھیں۔ اَکبر منیر کی غیر مطبوعہ کتب میں "مہرِ منیر" (اُردو مثنوی)، تفسیر سورہ فاتحہ، قرآن کا فلسفۂ محبت، تصوفِ اِسلام کی حقیقت، زہد کا قرآنی تصور، اِسلام اور ڈسپلن شامل ہیں۔ (۳۸) اِن میں سے کچھ مکمل اور کچھ نامکمل ہیں۔

اِقبال اور اَکبر منیر

اَکبر منیر اُن خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہیں علامہ کی صحبت کا موقع ملا' جنہیں اِقبال سے شاباش ملی اور جنہیں اُن کی صحبت سے اَپنے دِل و دماغ اور روح کو معطر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اَکبر منیر اور اِقبال کے مراسم میں اُنکے بلند پایہ ذوق کے علاوہ بھی کچھ عوامل کار فرما تھے۔ جیسے

☆ اَکبر منیر نے سیالکوٹ کی سرزمین پر جنم لیا۔

☆ اکبر منیر بھی مولوی سید میر حسن کے فیض یافتہ تھے۔

☆ اور سب سے بڑھ کر اَکبر منیر کے ذاتی ذوق اور خلوص نے اُنہیں اِقبال کے بہت قریب کر دیا اور اِقبال سے اُن کے ذاتی تعلق اور اُن کے افکار سے گہری وابستگی نے اَکبر منیر کی شاعری کو ہی نہیں بلکہ اُن کے قلب و ذہن کو بھی متاثر کیا اور اُنکے فکری ارتقاء کیلئے ایک بنیاد فراہم کی۔

حوصلہ افزائی:

اَکبر منیر کی اِقبال سے پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی جب وہ اورنٹیل کالج میں منشی فاضل کے طالبعلم تھے۔ اُنہوں نے ۱۹۱۴ء سے اُردو شاعری شروع کر رکھی تھی اور اُن کی نظمیں "صوفی" جیسے معتبر اور معیاری پرچے کی زینت بنتی تھیں' اِس وقت اِس رسالے میں چھپنا بذات خود اِس بات کا ثبوت تھا کہ اُن کے کلام میں فکر اور فن دونوں موجود تھے۔ اِس وقت اُنکی عمر صرف بیس سال تھی اور اتنی کم عمری میں اَکبر الہ آبادی' اِقبال' سیماب اَکبر آبادی اور ظفر علی خاں کیساتھ جگہ پانا ایک غیر معمولی بات تھی۔ جب پہلی دفعہ اَکبر منیر نے اپنی شاعری علامہ کے پاس بغرض اصلاح بھیجی تو علامہ نے نہ صرف اُنکی حوصلہ افزائی کی بلکہ اُن کو مشق سخن جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اِقبال ہر کسی کو یہ مشورہ نہ دیتے تھے۔ اگر دیکھتے کہ اصلاح کیلئے کلام بھیجنے والے میں شاعرانہ فکر کا فقدان ہے تو صاف لکھ دیتے:

> "دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اَپنے فرصت کے اوقات کیلئے شاعری سے بہتر مصرف تلاش کریں" (۳۹)

لیکن اَکبر منیر کی نظم پڑھ کر اُنہوں نے جواباً لکھا:۔

> "آپ کی نظم جو ملفوف تھی میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھی ہے۔ اگر آپ نے مشقِ سخن جاری رکھی اور غور و فکر کی عادت ڈالی تو ایک روز آپ کو اِس میدان میں بڑی کامیابی نصیب ہوگی۔" (۴۰)

راہنمائی:

بعد میں اکبر منیر بحرین ' ایران اور بغداد میں رہے تو خط و کتابت جاری رہی ' وہ علمی مسائل میں علامہ سے راہنمائی طلب کرتے رہے اور علامہ یہ راہنمائی بہم پہنچاتے رہے۔ اکبر منیر عربی سیکھنا چاہتے تھے۔ علامہ نے لکھا

"میری رائے میں مصر ' بیروت سے بہتر ہے"

اور جب اکبر منیر نے فلسفے میں دلچسپی ظاہر کی تو علامہ نے انہیں کتب جمع کرنے اور خریدنے میں راہنمائی فراہم کی از خود بھی وقتاً فوقتاً کتابیں منگواتے رہے۔ اکبر منیر نے انہیں "لطائفِ غیبی" (لٹریری ہسٹری آف پرشیا از ڈاکٹر براؤن جلد اول صفحہ ۲۸۳ کے مطابق اس کتاب کا نام "لطیفۂ غیبیہ" ہے۔ اور یہ تہران میں ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی) "تفسیرِ قرآن از ملا صدر الدین شیرازی" (۱۵۷۲-۱۶۴۰ء) اور دیگر کئی کتب ارسال کیں۔ علامہ کے خطوط بنام اکبر منیر پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ علامہ اُن کے ذوق اور صلاحیتوں کے قائل تھے اور اُنکی قدردانی کے ساتھ وہ اُنہیں اِس قابل بھی سمجھتے تھے کہ وہ علامہ کی شاعری کو سمجھ سکتے ہیں اور ایران میں اِن کے تعارف کو وسیع کر سکتے ہیں' چنانچہ وہ اُنہیں اپنا تازہ کلام اور کتابیں بھیجتے رہتے تھے۔ جب اکبر منیر ایران گئے تو اقبال نے خوشی کا اظہار کیا' کیونکہ بقول اُنکے ' اُنہیں ایران سے ایک نسبت قلبی تھی۔ ایران کے رسائل میں اکبر منیر کا کلام دیکھ کر علامہ نے اُنہیں لکھا:

"عصرِ آزادی" میں آپ کی دونوں نظمیں دلآویز ہیں۔ اِنشاء اللہ آپ کی زبان شستہ ہو جائے گی اور ایران کا قیام آپ کی شاعری کیلئے نہایت مفید ہو گا"

(مکتوب محررہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ء)

"اخبارِ استخر جس میں آپ کی نظم شائع ہوئی بِلاحظہ سے گزرا۔ آپ کی زبان میں صفائی بہت ترقی کر رہی ہے اللھم زد فزد! خیالات کے لیے طبیعت پر زور دینا چاہیے مطالب جلیلہ کی مشرقی نظم کو بہت ضرورت ہے۔ حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیرِ نظر رکھنا چاہیے۔ ایرانی اخبارات میں اِس قسم کی نظمیں شائع کیا کیجئے" (مکتوب محررہ ۸ مئی ۱۹۲۲ء)

"اشعار جو آپ نے بھیجے ہیں ' نہایت دِلچسپ ہیں اور بالخصوص "مسلمانے نمی بینم" نے تو مجھے رُلا دیا۔ اللھم زد فزد!" (۴۱) (مکتوب محررہ ۲ مئی ۱۹۲۴ء)

"ماہِ نو ضرور مرتب کیجئے۔ اِس سے بہت فائدہ ہو گا" (مکتوب ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء)

"ماہِ نو" پر رائے:

اَکبر منیر نے اِقبال کی حوصلہ افزائی ' اجازت اور مشورے سے "ماہ نو" کے نام سے سے اپنا فارسی کلام مرتب کیا اور اکتوبر ۱۹۲۸ء میں اسے مطبع معارف اعظم گڑھ نے نہایت دِلکش صورت میں شائع کیا۔ اَکبر منیر نے ایک کاپی حضرت علامہ کی خدمت میں بھی ارسال کی۔ "ماہ نو" میں اَکبر منیر نے اِقبال کا شکریہ اِن الفاظ میں ادا کیا تھا:-

"جرم حق ناشناسی و بے مروتی را مرتکب خواہم بود اگر الطاف بزرگانہ شاعرو فیلسوف سترگ معاصر حضرت آقای دکتر اِقبال را کہ ہموارہ نسبت بہ این بندہ مبذول داشتہ اند درا ینجامتذکر نشوم ' اَز روزیکہ فیض خدمتشان را نائل شدہ ام معظم لہ ہمیشہ حقیر را بیات اَدبی صحیح تشویق نمودہ اند حتی در مسافرتہای ایران وابین النہرین ہم بار سال نامجات اَز افاضات عالیہ دریغ نداشتہ وبدین واسطہ قلب بندہ را اَز حق شناسی واحترام ومحبت خود مملو ساختہ اند" (۴۲)

اِقبال نے ماہِ نو کو بہت دِلچسپی سے پڑھا اور جواباً اَکبر منیر کو لکھا (۴۳)

("آپ کا قیام ایران آپ کیلئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اِس کی بدولت آپ کے کلام میں ایک سادگی ' قوت اور جلا آگئی ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ "ماہِ نو" جلد بدرِ کامل میں بدل جائے گا")

مکاتیب اِقبال بنام اَکبر منیر

یہ خطوط "اقبالنامہ" جلد دوم صفحات ۱۵۴ تا ۱۶۹ پر موجود ہیں۔ ان کی تعداد ۹ ہے۔ پہلا خط ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء کا ہے جب مکتوب الیہ اسلامیہ کالج لاہور میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ دوسرا خط (۲۱ اپریل ۱۹۲۰ء) اور تیسرا (۴ 'اگست ۱۹۲۰ء) بحرین کے پتہ پر لکھے گئے۔ چوتھا (۳۰ ' جنوری ۲۲ء) اور پانچواں (۸ ' مئی ۲۲ء) (۴۴) ایران بھیجے گئے۔ چھٹا خط (۲ 'فروری ۲۴ء) بغداد کے پتہ پر ہے۔ ساتواں خط (۱۷ 'مارچ ۲۵ء) ملتان بھیجا گیا جہاں اکبر منیر ایمرسن کالج میں استاد مقرر ہو چکے تھے۔ آٹھواں خط ۹ 'نومبر ۲۸ء اور نواں مارچ ۳۳ء کے دور کا ہے۔ اس کتاب کے حساب سے ان خطوط کی ضخامت سات صفحات بنتی ہے۔ اقبال اور اکبر منیر کی باہمی مراسلت پر ایک فاضل دوست کی کتاب زیر طبع ہے۔ اس لئے یہاں یہ خطوط نقل نہیں کئے جارہے۔

پروفیسر قاضی فضل حق

قاضی فضل حق علم و ادب کے ایک درخشاں باب کا نام ہے۔ جن کی فارسی اور پنجابی ادب کیلئے خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

قاضی صاحب کا تعلق گجرات کے قصبے "حاجی والہ" سے تھا۔ جہاں پر مقیم اُنکے بزرگ کئی نسلوں سے علم و فضل کے میدان میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ قاضی صاحب اگست ۱۸۸۷ء میں حاجیوالا میں قاضی محمد دین کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاجیوالہ اور قریب کے دیہات کے دینی مدارس سے حاصل کی۔ اعوان شریف میں حضرت قاضی سلطان محمودؒ سے بھی اکتساب علم کیا۔ مڈل کا امتحان مشن سکول جلالپور جٹاں سے پاس کیا۔ اور میٹرک بھی امتیاز کیساتھ اِسی ادارہ سے کیا۔ اِن کی ذہانت، لگن اور محنت اور دیکھتے ہوئے اُن کے اُستاد مولوی نیک عالم نے اُنہیں مزید تعلیم حاصل کرنے اور اِس غرض سے لاہور چلے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے اِسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۹ء میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۱۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی اعلیٰ درجے میں پاس کیا۔ اِسی دوران منشی فاضل کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔

ایم اے میں امتیازی حیثیت کی بناء پر قاضی صاحب کو میکلوڈ عریبک ریسرچ سکالر شپ ملا اور عربی زبان و ادب پر تحقیق کیلئے آپ بحیثیت ریسرچ ایسوسی ایٹ ۱۹۱۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ اِسی قیام علی گڑھ کے دوران اُنہوں نے عبرانی، فرانسیسی، جرمن اور آسوری زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں آپ پراونشل ایجوکیشن سروس کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج راجشاہی میں عربی، فارسی کے لیکچرر تعینات ہوئے۔ اِسی دور میں آپ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی رکنیت حاصل کی۔

۱۹۱۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور آئے اور فارسی کے پہلے مستقل لیکچرر مقرر ہوئے۔ ترقی کی منازل طے کرتے کرتے سینئر پروفیسر اور صدر شعبہ کے عہدے تک پہنچے اور گورنمنٹ کالج کی تاریخ میں یادگار نقوش چھوڑے۔ آپکی تنخواہ کا ایک خاص گریڈ تھا جو آپ کے علاوہ کسی اور کو نہ ملا۔ گورنمنٹ کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں کے فروغ میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ پرشین سوسائٹی، بزم سخن، پنجابی سوسائٹی، پنجابی موومنٹ اور ایمبولینس کلب کے صدر رہے۔ مسلم مجلس جو مسلمان طلباء کے حقوق کی حفاظت کیلئے بنائی گئی تھی، کے بانی تھے۔ علاوہ ازیں وہ پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی کے رکن، مجلہ "روشنی" کے

اعزازی معاون مدیر اور انڈین اور نٹیل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے نمایاں رکن تھے۔ ادارہ معارف اسلامیہ کے قیام میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی تازیست تعلق رہا۔ اس کی تالیف و طبع کمیٹی کے اعزازی چیئرمین بھی رہے۔ پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس' پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی مختلف انتظامی حیثیتوں میں وابستہ رہے۔ قاضی صاحب کا گورنمنٹ کالج سے ۲۵ سالہ تعلق' خدمت' محنت اور سرگرمی کا زریں باب تھا۔ بقول پروفیسر عبدالقیوم

" قاضی صاحب کا زمانہ علم و ادب کے حوالے سے بڑا تابناک تھا۔ اُس زمانے میں لاہور کے مختلف کالجوں میں بڑے علم دوست اور محقق اساتذہ عربی اور فارسی کی تدریس پر مامور تھے۔ اساتذہ کی اِس پُر تمکین محفل میں قاضی صاحب کا اپنا ایک مقام تھا۔ اور وہ آپنے علمی وقار کی وجہ سے بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے"(۴۵)

قاضی فضل حق کی فارسی اور خصوصا پنجابی ادب کیلئے خدمات کی تفصیل بیان کرنے کیلئے کئی دفاتر درکار ہیں۔ آپ کے سینکڑوں تحقیقی مضامین و مقالات اُس دور کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اُن کی شاندار تحقیق اور بے مثال تدریسی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت وقت نے ۱۹۳۳ء میں اُنہیں "خان صاحب" کا خطاب دیا۔ قاضی کے بیشتر مقالات کتابی صورت میں شائع نہیں ہوسکے۔ اُنکی مطبوعہ کتب میں

☆ سخنوران ایران
☆ چِٹھیاں دی وار (ترتیب)
☆ مرتب کردہ نصابی کتب
☆ نکھیڑے: تذکرہ پنجابی شعرائے قدیم

قاضی صاحب کے بلند پایہ تحقیقی مقالات' اور "تذکرہ آدبیاتِ پنجاب" بھی قاضی صاحب کا عظیم علمی و تحقیقی کارنامہ ہے۔ جو ہنوز تشنہ طباعت ہے۔

تحقیق و تدریس کی دُنیا کا یہ درخشندہ ستارہ ۵۲ سال کی عمر میں اپنی پوری روشنی کے دور میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۹ء کو غروب ہوگیا۔ قاضی صاحب کو اُن کی وصیت کے مطابق حاجیوالہ میں اُن کے آبائی قبرستان میں اُن کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ (۴۶)

اقبالؒ اور قاضی فضل حق

قاضی صاحب ' علامہ اِقبال کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے وہ علامہ کے مداح تھے اور علامہ اُنکی علم دوستی اور تحقیقی کاوشوں کے معترف تھے۔

رفیقِ کار

دونوں حضرات کی اکثر ملاقاتیں پنجاب یونیورسٹی کے فارسی عربی بورڈ آف سٹڈیز کے اجلاسوں یا دیگر علمی اجتماعات میں ہوئیں۔ دونوں حضرات پنجاب یونیورسٹی کے فیلو' ممتحن اور بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر تھے۔ اُس حوالے سے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک اور ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک دونوں کی ملاقاتیں بورڈ آف سٹڈیز کے اجلاسوں میں ہوتی رہیں۔ اُن ملاقاتوں میں اُس دور کے کچھ اور نامور اہل علم حضرات مثلاً ڈاکٹر صدر الدین ' مولوی محمد شفیع ' مولانا اصغر علی روحی بھی شامل ہوتے تھے۔(۴۷)

مثال کے طور پر عربی و فارسی بورڈ آف سٹڈیز کا ایک اجلاس ۱۰ مئی ۱۹۲۲ء بروز بدھ بوقت شام ساڑھے چھ بجے علامہ اِقبال کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔ دوسروں کے علاوہ قاضی صاحب نے بھی شرکت کی۔ اِسی طرح ۳۱ مئی ۱۹۲۲ء کو ساڑھے پانچ بجے شام سینٹ ہال لاہور میں اورنٹیل فیکلٹی کا اجلاس ڈاکٹر شیخ محمد اِقبال ایم اے 'پی ایچ ڈی 'بارایٹ لاء' ڈین اورنٹیل فیکلٹی کی زیر صدارت ہوا۔ شرکت کرنے والوں میں قاضی فضل حق بھی شامل تھے۔(۴۸) فیض احمد فیض (۱۹۱۱-۱۹۸۴ء) بیان کرتے ہیں:-

> "اِقبال تو ایک طریقے سے ہمارے چچا تھے۔ کیونکہ ہمارے ابا کی ان سے دوستی تھی ہمارے ابا اور وہ ساتھ ہی رہے اور ساتھ ہی اُنہوں نے بیرسٹری کی اور ساتھ ہی آئے تھے۔۔۔ جب ہم نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ہمارے ابا ہمیں اُنہی کے پاس لے گئے سفارشی خط کیلئے۔ قاضی فضل حق ہوا کرتے تھے فارسی کے پروفیسر' اُنکے نام علامہ سے خط لیا تھا اور اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قاضی فضل حق نے خط لے لیا۔ ہم نے کہا جی خط پڑھ کر واپس کر دیجئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم خط اپنے پاس رکھ لیں گے لیکن قاضی فضل حق نے خط ہمارے حوالے نہیں کیا۔ اپنے پاس رکھ لیا"(۴۹)

پروفیسر قاضی فضل حق کی گورنمنٹ کالج میں تعیناتی کے بعد اُنہیں پنجاب یونیورسٹی کا فیلو منتخب کر لیا گیا۔ وہ ایم اے فارسی کے طلباء کو لیکچرز دیا کرتے تھے۔ علامہ اِقبال بھی اِن

دِنوں اِس یونیورسٹی کے فیلو تھے۔ یوں طلباء کی تدریس کیلئے دونوں ایک ہی جگہ اکٹھے ہوتے اور ملاقاتوں کا موقع ملتا۔ بہت سی گروپ فوٹوز میں قاضی صاحب اور اِقبال اکٹھے نظر آتے ہیں (۵۰)

خطباتِ مدارس۔ لاہور میں

۲۹-۱۹۲۸ء میں علامہ نے مدراس میں جو خطبات دیے تھے' اُنکی افادیت کے پیش نظر سر عبدالقادر' محمد دین تاثیر اور غلام رسول مہر کے کہنے پر علامہ نے اِسلامیہ کالج کے ہال میں یہ خطبے دوبارہ ارشاد فرمانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اِن مجالس میں باقاعدگی سے شامل ہونے والوں میں قاضی صاحب بھی شامل تھے۔ (۵۱)

استقبال

۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو علامہ فرنٹیر میل کے ذریعے تیسری گول میز کانفرنس سے دو بجے واپس لاہور پہنچے' پلیٹ فارم پر اُن کا اِستقبال کرنے والوں میں اُن کے دیرینہ رفیق کار اور دوست قاضی فضل حق بھی موجود تھے (۵۲)

ادارہ معارفِ اِسلامیہ

۱۹ تا ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ء کو لاہور میں اِنڈین اورنٹیل کانفرنس کا پانچواں اجلاس ہوا قاضی صاحب کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ایک نمایاں رکن ہونے کے علاوہ کانفرنس کی اِستقبالیہ کمیٹی' مشاعرہ سب کمیٹی اور نمائش سب کمیٹی کے بھی اہم رکن تھے۔ کانفرنس کا عربی اور فارسی سے متعلقہ اجلاس لا کالج میں علامہ اِقبال کی زیر صدارت ہوا۔ اُس اجلاس میں قاضی صاحب نے ایک مقالہ "آدینہ بیگ 'گورنر آف لاہور" پڑھا۔

اِسی کانفرنس میں متاثر ہو کر علامہ نے یہ تجویز پیش کی کہ اِسی طرز پر ایک ادارہ قائم کیا جائے جس کا مقصد خاص طور پر علوم اِسلامیہ کی تحقیق و ترویج ہو۔ چنانچہ اِقبال کی تحریک اور راہنمائی میں لاہور کے علم دوست مسلمان اکابرین کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اِس کمیٹی کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ مجوزہ ادارے کا نام "ادارہ معارفِ اِسلامیہ" ہوگا اور اِس کا اجلاس ہر دوسرے سال ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں ہوا کرے گا۔

چنانچہ "ادارہ معارف اِسلامیہ" کا پہلا اجلاس ۱۵' ۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور میں ہوا۔ قاضی صاحب نے دیگر ساتھیوں کیساتھ مل کر ادارہ کے پہلے اجلاس کے اِنعقاد کیلئے انتھک محنت کی۔ وہ اِستقبالیہ کمیٹی کے رکن تھے۔ دیگر ارکان میں شیخ عبدالقادر' علامہ عبداللہ یوسف علی' حافظ محمود شیرانی' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین (صدر) اور علامہ محمد اِقبال بھی شامل

تھے۔ اس اجلاس میں قاضی صاحب مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی مقالہ پیش نہ کر سکے۔ اُس اجلاس کی ایک یادگار تصویر اِقبال میوزیم (جاوید منزل) میں محفوظ ہے جس میں قاضی صاحب تیسری صف میں اِنتہائی دائیں جانب کھڑے ہیں (۵۳)

اِقبال بنام قاضی صاحب

اِقبال اور قاضی صاحب دونوں پنجاب یونیورسٹی کے فیلو، ممتحن اور بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر تھے۔ بی اے اور ایم اے فارسی کے امتحانی پرچوں کو مرتب کرنے اور جانچنے میں اکثر علامہ اور قاضی صاحب شریک کار ہوتے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۲۴ء کو اِقبال نے قاضی صاحب کے نام اِسی سلسلے میں درج ذیل خط لکھا (۵۴)

Dr. Sir Mohd Iqbal
M.A. Ph.D, L.L.D
Barrister-at-Law
Lahore dated: 21 st July 1924

Dear Qazi Sahib

I am sending you script of paper VI (MA Persian) If You agree with me please sign all the papers and send them directly to the University (Under) regi stered and insured cover please also transcribe a copy for the ---- to the rules made and enforced this year.

Yours Sincerely,
Mohammad Iqbal
Lahore

سید حبیب جلالپوری

پاک و ہند کی سیاست اور صحافت کا ایک معتبر نام ' سید حبیب شاہ ' جلالپور جٹاں کے سادھو محلہ میں سید سعد اللہ شاہ کے گھر ۵ ستمبر ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق علاقہ مظفر آباد (کشمیر) سے تھا۔ اور بخاری سادات میں سے تھے۔ سید حبیب کا بچپن بنوں' ملتان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں گزرا۔ پرائمری اور مڈل کے امتحانات اعزاز کیساتھ سکاچ مشن سکول جلالپور جٹاں سے پاس کیے۔ اُس عمر میں سید حبیب کو مذہبی مباحث اور پہلوانی کا شوق تھا۔ ۱۹۰۹ء میں مشن سکول وزیر آباد سے اِنٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ مالی پریشانیوں کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور جموں کے مشن سکول میں مدرس ہوگئے۔ پھر ۱۹۱۱ء میں محکمہ مردم شماری میں چیکنگ اِنسپکٹر مقرر ہوئے اور سری نگر چلے گئے۔ جلد ہی گجرات آگئے۔ اِنہی دِنوں آریہ سماج گجرات کے سالانہ جلسے میں کانشی رام وکیل سیالکوٹ سے الہامی کتاب پر بحث کی جس سے آپ کو بہت شہرت ملی۔

۱۹۱۳ء میں لاہور تشریف لے گئے اور پہلے ایک میڈیکل سٹور پر کلرک ہوئے ' علم و اَدب کا شوق تھا مختلف اخبارات و رسائل میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور کشمیری میگزین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے۔ جنوری ۱۹۱۴ء میں "پھول" اور "تہذیب نسواں" میں بطور معاون مدیر کام شروع کیا۔ اِسی سال فوج میں بھرتی ہوگئے مگر انگریزوں کے نامناسب سلوک کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۱۴ء میں مستعفی ہوگئے۔ سنگاپور سے واپسی پر جیل میں بند کردیے گئے اور یہیں سے انگریز کے خلاف نفرت نے جنم لیا جو تمام عمراِن کے قول و فعل میں نمایاں رہی۔

پنجاب آکر آپ "کشمیری میگزین" ' "رسالت" اور "حریت" میں کام کرتے رہے۔ "صداقت" میں بھی کچھ وقت گزارہ۔ آپنے اخبار 'رہبر' اور ' نقاش ' جاری کیے اور کچھ عرصہ "ترمذی" کے مدیر بھی رہے۔ پھر جلد ہی تحریک خلافت شروع ہوگئی چنانچہ آپ نے لاہور اپنا روزنامہ "سیاست" جاری کیا۔ اپنی حریت پسندی اور عوامی انداز کی بدولت سیاست اور سید حبیب کو بہت پذیرائی ملی۔

۱۹۲۰ء میں علامہ اِقبال کی صدارت میں قائم کی جانے والی خلافت کمیٹی ' انگریز حاکم کے خوف سے اَپنے قیام سے اگلے ہی روز توڑدی گئی۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اِس کی اَز سرِنو تشکیل کی اور سید حبیب کو اِس کی صدارت سونپی گئی۔ اِس کمیٹی کی دوبارہ تشکیل انگریز کے منہ پر طمانچہ تھا' اُدھر سید حبیب کا اخبار ' سیاست ' انگریز کے خلاف زہر اگل رہا

تھا۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۲۰ء کو سید حبیب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۷ اگست ۱۹۲۱ء کو مقدمے کا فیصلہ ہوا اور شاہ صاحب کو تین سال قید با مشقت سنائی گئی۔ اور دیگر راہنماؤں (سید عطاء اللہ بخاری، مہرو سالک وغیرہ) کیساتھ میانوالی جیل میں بند کر دیئے گئے۔ بعد میں دھرم سالہ جیل میں بھی رہے۔

سید حبیب مسلم لیگ کے مخلص کارکن تھے۔ کل ہند مسلم کانفرنس ہو یا خطبہ الہ آباد کی تائید و حمایت، انجمن حمایت اِسلام ہو یا گول میز کانفرنس، تحریک مسجد شہید گنج ہو یا تحریک ختم نبوت، کشمیر کی تحریک ہو یا دُنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کی عزت و ناموس کا مسئلہ ہو، سید حبیب ہمیشہ پیش پیش رہے۔ تحریک مسجد شہید گنج میں اُنہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ قید و نظر بند بھی رہے۔ اُنکے اخبار کی ضمانت بھی ضبط کر لی گئی۔ "مجلسِ اتحادِ ملت" کے مرکزی جنرل سیکرٹری رہے۔

سید حبیب نڈر اور بے باک صحافی تھے۔ جس بات پہ ڈٹ جاتے کسی طور نہ ٹلتے تھے۔ گورنر پنجاب ہربرٹ ایمرسن، سرڈگلس ینگ چیف جسٹس پنجاب، سکندر حیات خان (۱۸۹۲۔ ۱۹۴۲ء) کسی کو معاف نہ کیا۔ ایک مقدمے میں معافی نامے پر دستخط کرنے یا گیارہ ہزار روپے کی خطیر رقم بطور جرمانہ جمع کرانے کی صورت میں رہائی مل سکتی تھی۔ سید حبیب نے معافی نامے پر دستخط نہ کیے اور جلالپور جٹاں میں اپنا آبائی گھر بیچ کر جرمانہ ادا کر دیا۔ عبدالمجید سالک اپنی کتاب "یارانِ کہن" میں رقمطراز ہیں۔

> "سید حبیب نہایت محنتی، جفاکش، باہمت دوستوں کے مخلص دوست اور دشمنوں کے سخت دشمن واقع ہوئے تھے۔ مشکلات و مصائب سے ہرگز پریشان نہ ہوتے تھے۔ بڑے سے بڑے افسر اور بڑے سے بڑے لیڈر سے ٹکرا جانے میں تامل نہ کرتے تھے۔ لوگوں کی سفارشیں کرنا، محتاجوں کی امداد کا جتن کرنا، غریب مسلمان نوجوانوں کو ملازمتیں دِلوانا اور بعض مظلوموں کیلئے افسروں سے لڑنا جھگڑنا سید حبیب کا عام شعار تھا۔"

روزنامہ "سیاست" ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۷ء تک باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ سکندر حیات کی حکومت کے خلاف لکھنے کی پاداش میں جرمانہ ہوا جو ادا نہ ہو سکا اور اخبار بند ہو گیا۔ شورش کاشمیری (۱۹۱۷۔ ۱۹۷۵ء) "نورتن" میں لکھتے ہیں۔

> "۱۹۳۲ء تک لاہور میں مسلمانوں کے تین اخبار تھے۔ زمیندار، انقلاب اور سیاست پہلے اور بعد میں کچھ اور اخبار بھی دیکھے لیکن نام انہی تین کا نوک زبان رہا"۔

قیامِ پاکستان کے بعد سید حبیب نے ۱۹۴۹ء میں "غازی" جاری کیا مگر حکومت سے ٹکر لی اور یہ بھی بند ہو گیا۔ سید حبیب ایک بے باک مقرر اور ادیب بھی تھے۔ خوبصورت ذوق شعر کے بھی مالک تھے۔ اُنہوں نے متعدد کتب تصنیف و ترجمہ کیں جن میں تحریک قادیان، بھگوت گیتا کا منظوم اُردو ترجمہ، آدی گرنتھ کا منظوم اُردو ترجمہ، گلِ اِنصاف، انمول رتن، سفر نامہ افغانستان اور سفرنامہ چترال شامل ہیں:۔

سید حبیب اولاد سے محروم رہے۔ آخری عمر نہایت کسمپرسی میں گزری۔ ۲۳ فروری ۱۹۵۲ء کو یہ حق گو واصل بحق ہوا اور میانی صاحب میں آسودہ خاک ہوا (۵۵)

اِقبال اور سید حبیب

حضرت علامہ اور سید حبیب کے باہمی تعلقات قریبی نوعیت کے تھے۔ سید صاحب علامہ کے عقید تمند بھی تھے اور دوست بھی۔ وہ عظمت اِقبال کے معترف بھی تھے اور مبلغ بھی۔ علامہ بھی، سید صاحب کے اخلاص اور حق گوئی کے قائل تھے اور اُنکی سیاسی و صحافتی خدمات کے معترف تھے۔

باہمی صلاح مشورہ:

سید حبیب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ علامہ اہم قومی و ملی امور میں اُن سے مشورہ کیا کرتے تھے کیونکہ وہ سید حبیب کو "اپنی قوم سے سچی ہمدردی رکھنے والا" سمجھتے تھے۔ ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو علامہ نے مولانا غلام مرشد (۱۸۹۵۔۱۹۷۹ء) وغیرہ کے نام ایک خط ارسال کیا:۔

بخدمت مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفرعلی خاں، سید حبیب، مولوی نورالحق، سید عبدالقادر اور مولانا مہر صاحبان

جناب مکرم

السلام علیکم: ایک نہایت ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے۔ آج آٹھ بجے شام غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھے ممنون فرمایئے۔ مشورہ طلب امر نہایت ضروری ہے۔ امید ہے آپ تکلیف معاف فرمائیں گے۔

مخلص محمد اِقبال۔ بیرسٹر لاہور

مولانا غلام رسول مہر کے بیان کے مطابق 'ضروری امر' مسلمانوں کے فقہی مسائل کے متعلق مشورہ کرنا تھا۔ (۵۶)

۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس کے موقع پر جب علامہ نے دیکھا کہ مسلمان مندوبین، ہندوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال رہے ہیں تو اُنہوں نے مدیران "انقلاب" مہر و سالک، مدیر

"سیاست" سید حبیب اور مدیر "مسلم آؤٹ لک" مجید ملک کو بلا کر تبادلہ خیال کیا اور اِنہی حضرات کے مشورہ اور تحریک پر روزنامہ "اِنقلاب" نے اپنی ۲۰ نومبر ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں ایک زبردست اداریہ لکھا کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کیلئے موجودہ حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ وہ اَپنے مخصوص مسائل پر غور کرنے کیلئے ایک کانفرنس منعقد کریں۔

چنانچہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء کو علامہ اِقبال نے لاہور کے مسلم اکابرین کا ایک اجلاس برکت علی اِسلامیہ ھال میں بلایا۔ اِس اجلاس میں علامہ کی صدارت میں مجوزہ کانفرنس کے اِنعقاد پر غور ہوا۔ اِس اجلاس میں بھی سید حبیب شریک ہوئے۔ دیگر اصحاب میں مہر و سالک ٗ مجید ملک ٗ خان سعادت علی خان ٗ میاں فیروز الدین ٗ سردار حبیب اللہ خان ٗ سید مراتب علی وغیرہ شامل تھے۔ ۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کو علامہ کے گھر پر اِسی کانفرنس کی مجلس اِستقبالیہ کا اجلاس ہوا جس میں سید حبیب اور مجید ملک دونوں حضرات کو سیکرٹری کے عہدے کیلئے منتخب کیا گیا۔ (۵۷)

خطبہ الہ آباد

اِسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے علامہ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں اپنا تاریخ ساز خطبہ ارشاد فرمایا۔ اِس موقع پر جو اصحاب خصوصی طور پر علامہ کے ساتھ گئے تھے اِن میں سید حبیب بھی شامل تھے۔ (۵۸)

بعد ازاں سید حبیب نے اَپنے مقبول اخبار "سیاست" کے ذریعے علامہ کے موقف کی بھرپور تائید کی۔ اِس پر اداریے لکھے ٗ اِس کی تشریح کی ٗ اِس کی حمایت میں اٹھنے والی آوازوں کو خصوصی اہمیت دی اور اِس کے خلاف پروپیگنڈہ کا منہ توڑ جواب دیا۔ (۵۹)

کشمیر کمیٹی

ہند کے مسلمانوں کی فلاح کی کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں سید حبیب سرگرم نہ ہوں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی حالت زار پر غور و خوض کیلئے جولائی ۱۹۳۱ء میں شملہ میں نواب ذوالفقار علی رہائش گاہ پر ایک اجلاس بلایا گیا اور یہ طے پایا کہ "آل اِنڈیا کشمیر کمیٹی" کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ اِس اجلاس میں علامہ اِقبال اور سید حبیب دونوں نے شرکت کی۔ (۶۰)

کل ہند مسلم کانفرنس

کل ہند مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ۷ اگست ۱۹۳۲ء کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جلد از جلد فرقہ وارانہ فیصلہ کا اُعلان کرے۔ اِس

اجلاس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے یہ طے پایا کہ:

"حکومت اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کو تسلیم نہ کرے تو پھر مجلسِ عاملہ ایک مکمل قومی پروگرام بنانے کیلئے حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیتی ہے۔

۱۔ سر محمد اِقبال (صدر) ۲۔ مولانا مظہرالدین ۳۔ مولانا حسرت موہانی ۴۔ سید حبیب صاحب ۵۔ مولانا غلام رسول مہر ۶۔ حسن ریاض ۷۔ ذاکر علی

اِس کمیٹی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اِس پروگرام کو جلد از جلد مجلس عاملہ کے سامنے پیش کرے۔" (۶۱)

صلح

سید حبیب اور مولانا ظفر علی خاں کے درمیان اکثر و بیشتر معاملات پر اختلاف رہتا تھا اگرچہ مولانا ظفر علی خاں اِس کا زیادہ نوٹس نہیں لیتے تھے لیکن سید صاحب اختلاف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جب علی برادران کی پنجابی ٹولی سے ٹھن گئی تو سید حبیب نے علی برادران کا ساتھ دیا اور اُنکی ہمنوائی میں لکھنے لگے۔ زمیندار نے ایک ہفت روزہ رسالہ "ٹوڈی" نکالا جس کا مقصد ' سیاست" کے حملوں کا جواب دینا تھا۔ ٹوڈی کے جواب میں سید حبیب نے "آکاباکا" نکالا اور کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر خرافات کا یہ پشتارہ لپیٹنے کیلئے علامہ اِقبال آگے بڑھے اور دونوں فریقین میں صلح کروا دی اور یوں یہ جنگ بند ہوگئی۔ (۶۲)

اِقبال کی حمایت

سید حبیب کی یہ خصلت تھی کہ اگر اختلاف کیا تو بھرپور اور کھلم کھلا' مدمقابل چاہے گورنر پنجاب ہی کیوں نہ ہو اور اگر حمایت کی تو وہ بھی دِل و جان سے۔ علامہ اِقبال نے جب ۱۹۲۶ء میں اِنتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو سید صاحب نے اَپنے اخبار کے ذریعے اُن کے اِس فیصلے کی بہت تعریف کی اور اُنکی تائید و حمایت میں سرگرم رہے۔ پھرجب میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے علامہ کے حق میں اپنی دستبرداری کا اعلان کیا تو سید صاحب نے اِس فیصلے کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ علامہ کی اِنتخابی مہم میں "سیاست" نے اُن کی حمایت میں کردار ادا کیا۔

سیاست

سید حبیب نے بہت فعال زِندگی بسر کی۔ صحافت میں 'سیاست' میں اور سماجی حلقوں میں

اُن کی رائے اور تجاویز کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ "بے باک اور بے لاگ" ہوتی تھیں۔ مسلم لیگ' اَنجمنِ حمایتِ اِسلام' تحریکِ خلافت' تحریک مسجد شہید گنج' تحریکِ ختمِ نبوت' تحریکِ کشمیر ہر پلیٹ فارم پر اُنہوں نے جو حق سمجھا' وہی کہا' وہی لکھا اور اِسی کا ساتھ دیا۔
علامہ کے دور میں "سیاست" ایک مقبول اخبار تھا اور اِس کی خبروں اور آراء کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ایک دفعہ سائمن کمیٹی کے انتخاب کے سلسلے میں سیاست میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اِقبال کمیٹی کے اِنتخاب کے روز کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ چونکہ خبر غلط تھی' تردید شائع کر دی گئی اور علامہ سے معذرت طلب کی گئی۔ لیکن اِقبال نے احتیاطاً روزنامہ "اِنقلاب" کے مدیر کو ۸ جولائی ۱۹۲۸ء کو لکھا۔

"نواب احمد یار خان صاحب نے ۲۶ جون کے اخبار "سیاست" کی ایک کٹنگ پرسوں کی ڈاک میں مجھے ارسال فرمائی ہے۔ صاحب مدیر سیاست تعریضاً لکھتے ہیں کہ میں سائمن کمیٹی کے اِنتخاب کے روز کونسل کے اجلاس سے غیر حاضر تھا ۔ افسوس کہ سید صاحب کو واقعات کی اطلاع غلط ملی یا اِن کو غلط اطلاع عمداً دی گئی۔ نواب احمد یار خان صاحب نے مجھے بذریعہ تار اطلاع دی کہ اُنہوں نے تردید کر دی ہے۔ چونکہ اخبار "سیاست" میں تردید میری نظر سے نہیں گزری ۔ یہ چند سطور آپنے اخبار میں درج فرما کر مجھے ممنون فرمائیں ۔ "
(۶۳)

اَنجمنِ حمایتِ اِسلام

اَنجمن حمایت اِسلام کے اجلاس بھی سید حبیب اور اِقبال کی ملاقات کے مواقع کرتے۔ ۲۳ جون ۱۹۲۹ء کو اَنجمن کی جنرل کونسل کا اجلاس خان بہادر شیخ امیر علی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں نظام حیدر آباد دکن کی لاہور آمد کے موقع پر اُنکے خیر مقدم سے متعلق لائحۂ عمل مرتب کیا گیا۔ چونکہ نظام علامہ کی دعوت پر تشریف لا رہے تھے چنانچہ وہ سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ اِس سلسلے میں اُنہوں نے کچھ تجاویز پیش کیں جن پر غور و خوض اور بحث و تنقید کرنے والوں میں سید حبیب بھی شامل تھے۔ (۶۴)
اِسی طرح ۳۰ اگست ۱۹۳۴ء کو اَنجمن کی جنرل کونسل کا ایک اجلاس اِقبال کی صدارت منعقد ہوا۔ آنریری سیکرٹری فنانس نے ۳۵۔۱۹۳۴ء کے آمد و خرچ کا بجٹ پیش کیا جس پر سید حبیب نے کہا"

"صاحبِ صدر کی ذاتِ گرامی سے ہمیں پوری توقع ہے کہ اگر صاحبِ صدر'

اَنجمن کی مالی مشکلات کی طرف توجہ فرمائیں تو بہت حد تک آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اِس لیے میری تجویز ہے کہ ہم صاحب صدر کی خدمت میں باآدب گزارش کریں کہ وہ اِس طرف خاص توجہ مبذول فرمائیں اور ہم کو بھی اُن کا ہر حال و معاملہ میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔"

شیخ عظیم اللہ صاحب نے تائید کی۔ صاحب صدر نے ارشاد فرمایا

"یہ ہمارا قومی اور مذہبی فرض ہے کہ ہم سب متحدہ ہو کر اَنجمن کی مالی حالت کے اضافہ کرنے میں کوشش کریں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر آپ سب صاحبان میرے ساتھ اِس معاملہ میں تعاون کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا فرمائے گا"(۶۵)

اِستقبال

سید حبیب کے چھوٹے بھائی سید عنایت شاہ بھی علامہ کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ نادر شاہ کا لاہور ریلوے سٹیشن پر اِستقبال کرنے والوں میں علامہ اِقبال، سید حبیب ور سید عنایت شاہ شامل تھے۔

میلاد شریف

۳۰۔۱۹۲۹ء میں حضرت علامہ نے سجادہ نشین حضرات، علمائے کرام، مشاہیر قوم اور سیاسی اکابرین کے ساتھ مل کر میلاد شریف کو منانے کیلئے اخبارات میں ایک اپیل شائع کی۔ اِس اپیل پر دستخط کرنیوالوں اور علامہ کا بھرپور ساتھ دینے والوں میں سید حبیب بھی شامل تھے۔(۶۶)

شفاء الملک کے اعزاز میں چائے

۲۷ جنوری ۱۹۳۴ء کو لاہور میں حکیم فقیر محمد چشتی (۱۸۷۰۔۱۹۴۷ء) کو حکومت کی جانب سے "شفاء الملک" کا خطاب ملنے پر اُن کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی گئی۔ اِس تقریب میں علامہ محمد اِقبال اور سید حبیب دونوں موجود تھے۔(۶۷)

اَنجمن اُردو پنجاب

اَنجمن اُردو پنجاب کا قیام ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو میاں بشیر احمد (۱۸۹۳۔۱۹۷۱ء) کی کوٹھی المنظر" (۲۳ لارنس روڈ لاہور) میں عمل میں لایا گیا۔ اِس کے قیام کا مقصد پنجاب میں اُردو کی ترویج و ترقی اور اُردو ہندی تنازعہ میں اُردو کا دفاع تھا۔ اِس اَنجمن کے تیسرے اجلاس میں جو ۳ مئی ۱۹۳۶ء کو "المنظر" میں سہ پہر ساڑھے پانچ بجے منعقد ہوا۔ اَنجمن کے

عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ سر اقبال، سر اکبر حیدری، سر تیج بہادر سپرو، سر راس مسعود اور سر عبدالقادر سرپرست بنائے گئے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صدر مقرر ہوئے۔ نائب صدور میں مولانا ظفر علی خاں، خواجہ دل محمد، پروفیسر ایم ڈی تاثیر اور ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر کے علاوہ سید حبیب بھی شامل تھے۔ (۶۸)

حوالہ جات و حواشی:

(۱) شاہ صاحب کے حالات، جانباز مرزا کی کتاب "حیات امیر شریعت" سے اخذ کیے گئے ہیں۔
(۲) ہفت روزہ "چٹان" لاہور۔ سالنامہ ۱۹۶۲ء ص ۱۷
(۳) اقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قرشی بحوالہ ماہنامہ، لاہور سالنامہ ۱۹۶۲ء
(۴) ذکر اقبال از عبدالمجید سالک ص ۱۰۶ اور دیگر کتب مثلاً "خدوخال اقبال" از امین زبیری
(۵) اس نظم "اسیری" کو امیر شریعت سے منسوب کرنے والوں میں سب سے قدیم حوالہ خان کابلی کی کتاب "سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری" لاہور ۱۹۴۰ء کا ہے۔ اس کو نذیر مجیدی نے اپنی کتاب "شاہ جی" لاہور ۱۹۶۵ء ص ۳۹۶ پر درج کیا ہے اور پھر قاضی افضل حق قرشی نے "اقبال کے ممدوح علماء" کے ص ۱۴۱ پر یہی حوالہ دہرایا ہے۔
(۶) مکتوب سید ذوالکفل بخاری، ملتان بنام راقم مورخہ ۴ اگست ۱۹۹۴ء
(۷) بانگ دراء حصہ سوم نظم نمبر ۲۶
(۸) گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۴۱، ۴۰
(۹) ملفوظات اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص ۷۸
(۱۰) اقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قرشی، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۳۷
(۱۱) اقبال اور پنجاب کونسل از محمد حنیف شاہد۔ مکتبہ زریں، رستم پارک لاہور، ۱۹۷۷ء
(۱۲) زندہ رود جلد ۳۔ از ڈاکٹر جاوید اقبال ص ۵۷۹، ۵۸۰
(۱۳) مجلہ مہک، "بیاد مجلس اقبال"، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ۷۵-۱۹۷۴ء ص ۱۹۰
(۱۴) بحوالہ مکتوب سید ذوالکفل بخاری، ملتان بنام راقم مورخہ ۴ اگست ۱۹۹۴ء
(۱۵) ایضاً
(۱۶) ایضاً
(۱۷) ہمارے دور کے چند علماء حق از سید امین گیلانی، مکتبہ احباب شیخوپورہ۔ ۱۹۹۳ء
(۱۸) مولانا روحی کے حالات کیلئے درج ذیل ذرائع سے مدد لی گئی ہے
(الف) ہفت روزہ "استقلال" لاہور بابت ۱۵ فروری ۱۹۸۳ء ص ۱۹، ۲۰
(ب) ہفت روزہ "استقلال" لاہور بابت ۲۲ فروری ۱۹۸۳ء ص ۳۱

(ج) رجال اِقبال مرتبہ عبدالرؤف عروج ،نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۷ء ص ۲۵۴'

(د) ماہنامہ ضیائے حرم ' لاہور۔ اپریل ۱۹۷۵ء ص ۷۶

(ر) مجلّہ کریسنٹ (صد سالہ نمبر) اِسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور صفحات ۱۰۹ تا ۱۳۳ مضمون مولانا اصغر علی روحی آز ڈاکٹر محمد ذوالفقار علی رانا۔ اِس مضمون میں مولانا روحی کی تاریخ پیدائش ۱۶ جنوری ۱۸۷۳ء لکھی ہے جو غلط ہے۔

(۱۹) محمد دین کلیم اَپنے مضمون " علامہ اِقبال کے معززین لاہور سے تعلقات " (مطبوعہ ماہنامہ "ضیائے حرم" لاہور اپریل ۱۹۷۵ء) میں لکھتے ہیں کہ علامہ اِقبال' روحی صاحب کو دیکھ کر کہتے تھے کہ اِس شخص میں علم کا دریا بند ہے۔ کوزے میں دریا بند ہونا محاورۃً سنا تھا۔ اِس شخص کو دیکھ کر یقین آگیا۔ تاہم یہی بات اِقبال کی زبان سے مولوی عبداللہ ٹونکی کے بارے میں بھی منسوب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں حضرات علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے اور دونوں جسمانی قد وقامت کے اعتبار سے مختصر تھے۔ چنانچہ ممکن ہے اِقبال نے دونوں حضرات کیلئے یہ الفاظ اِستعمال کیے ہوں۔

(۲۰) اِقبال اور اَنجمن حمایت اِسلام ص ۳۰

(۲۱) " اِقبال کی صحبت میں " آز عبد اللہ چغتائی ۔ مجلس ترقی اَدب لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۴' ۳۰۲' ۴۹۵

(۲۲) اِقبالنامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۹۷

(۲۳) اسرار و رموز: حصہ رموز بیخودی: حکایات شیر و شہنشاہ عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ

(۲۴) اِقبال اور اَنجمن حمایت اِسلام ص ۱۸۰

(۲۵) مشاہیر علماء ص ۲۰ تا ۲۳

(۲۶) ڈاکٹر ناموس کے حالات کیلئے درج ذیل ذرائع سے اِستفادہ کیا گیا ہے

(الف) سہ ماہی "اِقبال" بزم اِقبال لاہور بابت اکتوبر ۹۲ء تا جنوری ۹۳ء

(ب) گلگت اور شنا زبان ۔ آز ڈاکٹر شجاع ناموس ۔ کتاب کے آغاز میں مصنف کا تعارف

(ج) اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۳۷۷

(د) ماہنامہ "قومی صحت " لاہور۔ قرشی نمبر دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۲

(ہ) آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان آز ڈاکٹر شجاع ناموس ' یونائیٹڈ پبلشرز لاہور ۱۹۴۶ء

(۲۷) اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۳۷۷ تا ۳۸۱

(۲۸) سہ ماہی "اِقبال" بابت اکتوبر ۹۲' جنوری ۹۳ء

(۲۹) اِقبالنامہ حصہ دوم ص ۳۷۳

(۳۰) ایضاً ص ۳۷۵

(۳۱) ایضاً ص ۳۷۶

(۳۲) ایضاً ص ۳۸۱

(۳۳) کرنل خواجہ عبدالرشید نے اپنی کتاب "تذکرہ شعرای پنجاب" میں ص ۳۵۱ پر اُن کا تذکرہ " محمد

آکبر منیر گجراتی" کے نام سے ہی ہے۔

(۳۴) پروفیسر آکبر منیر نے آپنے یہ حالات زِندگی' ڈاکٹر احمد حسین قریشی کی فرمائش پر ۷ جنوری ۱۹۶۷ء کو لکھ کر اُنہیں دیئے۔ راقم کو یہ حالات قریشی صاحب نے فوٹو کاپی کی شکل میں فراہم کیے۔

(۳۵) "شمس العلماء مولوی سید میر حسن" آز ڈاکٹر سلطان محمود حسین۔ اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء ص ۲۱۵

(۳۶) پروفیسر آکبر منیر کے اِن سب تذکروں میں جو راقم کی نظر سے گزرے ہیں' یہ سنگین غلطی ہے کہ آکبر منیر نے فارسی میں ایم اے کیا۔ مثلاً

☆ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین اپنی کتاب "شمس العلماء سید میر حسن" کے صفحہ ۲۱۵ پر ڈاکٹر سید سبطین رضوی (فارسی گویان پاکستان) کے حوالے سے لکھتے ہیں آکبر منیر نے ۱۹۱۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے فارسی کی ڈگری لی"

☆ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اپنی کتاب "اِقبال کی صحبت میں" کے صفحہ ۴۸۳ پر لکھتے ہیں۔ "جب سیاسی دباؤ کے تحت پنجاب یونیورسٹی نے ایم اے فارسی کا امتحان لینا شروع کیا تو آکبر منیر نے نمایاں کامیابی کیساتھ امتحان پاس کیا۔"

چغتائی صاحب نے اِسی مفروضہ کی بنیاد پر آکبر منیر کے فارسی کے اساتذہ بھی گنوا دیے ہیں یعنی سراج الدین پال' قاضی فضل حق' مولانا محمد شفیع اور علامہ اِقبال۔ پھر اُن اساتذہ میں اورنٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج دونوں کے اساتذہ جمع کر دیے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن میں سے کوئی منشی فاضل میں آکبر منیر کا اُستاد رہا ہو لیکن ایم اے فارسی نہ آکبر منیر نے کیا نہ یہ اساتذہ ہوئے۔ پھر آکبر منیر نے ایم اے ۱۹۱۶ء میں نہیں بلکہ ۱۹۱۹ء میں کیا

(۳۷) دیکھیئے "صوفی" منڈی بہاؤ الدین گجرات۔ بابت اپریل ۱۹۱۵ء

(۳۸) آکبر منیر کے حالات کیلئے ان کے خود نوشت حالات کے علاوہ اُن کی مطبوعہ کتب اور "شاہین" (زمیندار کالج) کے گولڈن جوبلی نمبر سے بھی کچھ مدد ملی)

(۳۹) اِقبالنامہ جلد دوم ص ۲۵۶ مکتوب بنام مولوی احمد علی شاہ محررہ اگست ۱۹۲۶

(۴۰) اِقبالنامہ جلد دوم ص ۱۵۴' ۱۵۵

(۴۱) مسلمانے نمی بینم:؟

آکبر منیر نے قیام بغداد کے دوران دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک نظم لکھی جس کا عنوان تھا "چہ شد آخر کہ یک مرغ سلیمانے نمی بینم"۔ اِس کے کل نو شعر تھے۔ یہ غزل نما نظم "ماہ نو" (مجموعہ کلام آکبر منیر) کے صفحہ ۱۰۵' ۱۰۶ پر موجود ہے۔ اسکا مطلع ہے

جہانِ من پُر آز سامان و سامانے نمی بینم
چہ درمانہا زبہر درد و درمانے نمی بینم

مذکورہ شعر' جسے اِقبال نے بہت پسند کیا' درج ذیل تھا

ہنوز آز نعرۂ تکبیر اندام زمیں لرزد

ولیکن درہمہ عالم مسلمانے نمی بینم

(۴۲) 'ماہ نو' ص ۶۵
(۴۳) اکبر منیر کے خود نوشت حالات
(۴۴) پانچویں خط پر تاریخ درج نہیں مندرجات سے صابر کلوروی صاحب نے ۸ مئی ۱۹۲۲ء کی تاریخ مقرر کی ہے۔
(۴۵) 'راوی' گورنمنٹ کالج لاہور' بابت ۱۹۸۵ء گوشہ قاضی فضل حق
(۴۶) قاضی صاحب کے حالات کیلئے راوی کے مذکورہ بالا شمارے میں ' قاضی صاحب کے صاحبزادے رجل حق کے لکھے ہوئے قاضی صاحب کے حالات زِندگی پر انحصار کیا گیا ہے۔
(۴۷) ' نقوش' اِقبال نمبر ۱ ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۴۶۲
(۴۸) مفکر پاکستان از محمد حنیف شاہد۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۲ء ص ۱۸۳
(۴۹) ' راوی' ۱۹۸۵ء گوشہ قاضی فضل حق ' بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور جمعہ میگزین ۱۷ دسمبر ۱۹۸۲ء۔
(۵۰) ایضاً
(۵۱) اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین لاہور ۱۹۷۹ء ص ۱۹۲
(۵۲) ' اِقبال ریویو۔ ' اِقبال اکادمی پاکستان لاہور ' بابت جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر ۱) ص ۱۱۹ مقالہ " تیسری گول میز کانفرنس " اور اِقبال از رحیم بخش شاہین
(۵۳) راوی ۱۹۸۵ء ص ۱۱، ۱۲
(۵۴) سہ ماہی " اِقبالیات": اِقبال اکادمی لاہور۔ بابت جنوری مارچ ۱۹۹۶ء صفحہ ۳۵
(۵۵) سید حبیب کے حالات کیلئے مندرجہ ذیل ذرائع سے اِستفادہ کیا گیا ہے
(الف) "سید حبیب شاہ" غیر مطبوعہ مضمون از چودھری شاہد حمید وڑائچ گجرات
(ب) حیات امیر شریعت از جانباز مرزا
(ج) 'نورتن' از شورش کاشمیری ' چٹان مطبوعات لاہور ۱۹۶۷ء
(د) یاران کہن' از عبدالمجید سالک۔ چٹان مطبوعات لاہور ۱۹۶۷ء
(ر) ' مہک' (گوجرانوالہ نمبر) مجلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ص ۳۹-۷
(س) اِقبال کا سیاسی کارنامہ از محمد احمد خان۔ اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۹۰
(ص) وفیات مشاہیر پاکستان از پروفیسر محمد اسلم: مقتدرہ قومی زبان اِسلام آباد صفحہ ۱۲
(۵۶) اِقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قرشی لاہور' ۱۹۷۷ء ص ۱۴۳
(۵۷) سرگزشت اِقبال از عبدالسلام خورشید۔ اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۹۸ تا ۳۰۲
(۵۸) زندہ رود جلد سوم ص ۳۹۱
(۵۹) سرگزشت اِقبال ص ۳۳۰
(۶۰) اِقبال اور کشمیر از سلیم خان گمی۔ یونیورسل بکس لاہور ۱۹۸۵ء ص ۴۲

(۶۱) اِقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۳۵۵
(۶۲) نورتن از شورش کاشمیری
(۶۳) خطوط اِقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی۔ مکتبہ خیابان آدب لاہور۔ ۱۹۷۶ء ص ۱۸۹، ۱۹۰
(۶۴) اِقبال اور انجمن حمایت اِسلام ص ۱۱۷
(۶۵) ایضاً ص ۱۳۹
(۶۶) میلاد شریف اور علامہ اِقبال از سید نور محمد قادری: مرکزی مکتبہ رضا: ۱۹۷۸ء ص ۱۲ تا ۱۴
(۶۷) علامہ اِقبال اور مولانا ظفر علی خان از جعفر بلوچ۔ اِقبال اکادمی لاہور، ۱۹۹۵ء صفحہ ۶۸
(۶۸) ایضاً صفحہ ۶۹، ۷۰

حصہ سوم: "جن سے رسم و راہ تھی"

- ⇦ شیخ عطاء اللہ وکیل
- ⇦ پروفیسر شیخ عطاء اللہ
- ⇦ خانصاحب ملک کرم الدین
- ⇦ خان بہادر شیخ عبدالعزیز
- ⇦ ملک اللہ دتہ
- ⇦ سید سجاد حیدر بخاری
- ⇦ شیخ عنایت اللہ
- ⇦ ملک محمد الدین
- ⇦ نجف علی عاصی
- ⇦ حافظ محمد حسن چیمہ
- ⇦ حافظ محمد عالم
- ⇦ پیر تاج الدین و رفیع پیر
- ⇦ نذیر احمد بھٹی

ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
(اقبال)

شیخ عطاء اللہ وکیل

گجرات کی ایک ممتاز علمی شخصیت شیخ عطاء اللہ اِقبال کے احباب اور مکتوب الیہم میں سے تھے۔

وہ ۱۸۵۷ء کے قریب گجرات کی قانونگو فیملی میں پیدا ہوئے۔ گجرات اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ چیف کورٹ پنجاب اور چیف کورٹ کشمیر میں درجہ اول کے پلیڈر رہتے۔ ریاست پونچھ و کشمیر میں جج اور گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔

اِس دُنیاوی جاہ و حشم کے ساتھ ساتھ عنفوان شباب ہی سے دینی علوم اور صالح اعمال کی طرف راغب تھے اکابر علماء سے صحبتیں رہیں۔ نوجوانی میں مولانا عبد اللہ غزنوی ثم امرتسری کے ہاتھ پر شرک سے مجتنب رہنے کی بیعت کی۔ احمد اللہ امرتسری سے حدیث پڑھی۔ مولانا غلام علی اور حکیم نور الدین قادیانی سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کے بھی قریب رہے۔ آخر میں خواجہ احمد الدین کی تحقیق سے بھی متاثر ہوئے۔

شیخ صاحب قرآن کی محبت میں غرق تھے اور گجرات میں "اہل قرآن گروہ" کے سرخیل تھے۔ بات بات میں آیات قرآن سے اِستفادہ کرتے تھے اور تفکر میں غرق رہتے تھے۔ سرسید احمد خان سے جوانی سے ہی مراسم تھے۔ طالبعلمی کے زمانے سے سرسید کی تعلیمات سے متاثر تھے اور ایک دفعہ والد سے ناراض ہوئے تو سیدھے علی گڑھ پہنچے اور وہاں سرسید کے زیر شفقت رہے۔ گجرات میں سرسید کے ساتھیوں میں شیخ غلام حیدر، شیخ غلام محمد، مفتی محمد دین وکیل، سید عمر شاہ اور پیر قمر الدین وغیرہ شامل تھے۔ شیخ عطا اللہ اِس جماعت کے روحِ رواں تھے۔ ان لوگوں نے گجرات میں ایک انجمن تعلیم القرآن بنا رکھی تھی جو وقتاً فوقتاً قرآن فہمی کیلئے رسائل شائع کرتی جن میں سے اکثر شیخ صاحب کی کدو کاوش کا نتیجہ ہوتے لیکن بغیر ان کے نام کے شائع ہوتے۔ شیخ عطاء اللہ نے یوں تو کئی کتب تصنیف کیں لیکن ان کا اصل کارنامہ وہ لغت قرآنی تھا جس کے متعلق ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا۔

"اِس قسم کا لغت تیرہ سو سال میں نہیں لکھا گیا، اِسے ضرور شائع ہونا چاہیے۔"

اِس لغت کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر لفظ قرآنی کے معانی و مفہوم خود قرآن میں سے تلاش کر کے لکھے گئے تھے۔ یہ لغت شیخ صاحب کی عمر بھر کی عرق ریزی کا نتیجہ تھا۔ دُنیاوی امور سے فراغت کے بعد جب شیخ صاحب کو مختلف امراض نے آگھیرا تو اُنہوں نے لغت مذکور کا مسودہ علامہ محمد حسین عرشی امرتسری (۱۸۹۳۔۱۹۸۵ء) کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اِس کی

اشاعت کا بندوبست کریں۔ مگر دیر ہوتی چلی گئی تا آنکہ شیخ صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے اور لغت کا مسودہ تقسیم ہند کے ہنگاموں میں ضائع ہوگیا۔ علامہ عرشی "شہادت الفرقان علی جمع القرآن" طبع دوم کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"امتِ مسلمہ امرتسر کے کتب خانے میں سب سے زیادہ نادر کتاب زیرِ تذکرہ لغت تھا۔ میرا جو کچھ علمی و مادی سرمایہ تھا سب ختم ہوگیا۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ دکھ اِس لغت کے اتلاف کا ہوا۔ یہ ایک ایسا زخم ہے جو کسی طرح مندمل نہیں ہو پاتا۔ یاد کرتا ہوں اور آہیں بھرتا ہوں۔

۱۹۲۰ء کے قریب شیخ صاحب دُنیاوی مصروفیات چھوڑ کر گوشہ نشین ہوگئے اور قرآنی تحقیق میں منہمک ہوگئے آخر عمر میں اُنہیں ذیابیطس اور دیگر کئی امراض نے آدبوچا اور وہ مسلسل چھ سات سال تک اِن امراض میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۹۳۹ء / ۱۳۵۹ھ میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ گجرات شہر کے قبرستان تریہنگ میں دفن کئے گئے۔ اِن کی وفات پر علامہ عرشی امرتسری نے رسالہ "ابلاغ" امرتسر دسمبر ۱۹۳۹ء میں اُنہیں شاندار خراجِ تحسین پیش کیا۔ (۱)

اِقبال اور شیخ عطاء اللہ

اِقبال ' اور شیخ عطاء اللہ کے درمیان عقیدت اور احترام کا رشتہ تھا۔ شیخ عطاء اللہ قرآن فہمی سے ' مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کا کام کر رہے تھے اور قرآنی تعلیمات کی ترویج اِن کی زِندگی کا مشن تھا۔ اِقبال انکے اِس جذبے سے بہت متاثر تھے اور انکی اِس دینی و قومی خدمت کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

اِقبال اور شیخ صاحب کی پہلی ملاقات اِقبال کے خسر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے توسط سے ہوئی جو شیخ عطاء اللہ کے قرابت دار بھی تھے اور دوست بھی۔ اور انکی قرآن فہمی اور علم دوستی کے مداح و معترف بھی۔ شادی کے بعد اِقبال جب گجرات آتے تو شیخ عطاء اللہ سے ملاقات ہوتی۔ "اَنجمن تعلیم القرآن" بھی ان دِنوں سرگرم عمل تھی۔ ۱۹۰۷ء میں شیخ صاحب کی کتاب "شہادت الفرقان علی جمع القرآن" شائع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد اُنہوں نے اِس کتاب کا ایک نسخہ علامہ کی خدمت میں اَپنے بیٹے شیخ عتیق اللہ کے ذریعے ارسال کیا۔ علامہ نے اِس کتاب کے متعلق لکھا۔

"یہ چھوٹا رسالہ نہایت لاجواب ہے۔ اور میں اِس کے طرزِ استدلال کو نہایت پسند کرتا ہوں۔ آپ کی محنت واقعی داد کے قابل ہے"۔

(مکتوب بنام شیخ عطاء اللہ محررہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء)
شیخ عطاء اللہ جب لاہور چیف کورٹس میں اپنے پیشہ وارانہ امور کے سلسلے میں جاتے تو اِقبال سے بھی ملاقات کرتے۔ دونوں کے درمیان خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔
اِقبال نے اپنے دونوں خطوط میں شیخ صاحب کو جس لقب سے مخاطب کیا ہے وہ لقب اُنہوں نے اپنے والد' سید غلام میراں شاہ' شبلی نعمانی' سید سلیمان ندوی' اکبرالہ آبادی' سلیمان پھلواروی اور حبیب الرحمٰن شیروانی کے سوا کسی اور کیلئے کبھی اِستعمال نہیں کیا۔
"مخدوم و مکرم جناب قبلہ" کے لقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِقبال ان کی کس قدر عزت کرتے تھے۔ شیخ صاحب کے نزدیک بھی اِقبال کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ خود بھی علامہ سے ملنے جاتے اور اُنہوں نے اپنے بیٹے شیخ عتیق اللہ کو جو لاہور میں بسلسلہ کاروبار سکونت پذیر تھے' خصوصی طور پر ہدایت کی ہوئی تھی کہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔

خطوط اِقبال بنام شیخ عطاء اللہ

اِقبال اور شیخ عطاء اللہ کے درمیان خط وکتابت میں سے صرف دو خطوط محفوظ رہ سکے جو بشیر احمد ڈار نے "انوار اِقبال" (اِقبال اکادمی پاکستان لاہور۔ ۱۹۷۷ء) ص ۸-۱۸۷ پر درج کیے ہیں جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱)

از لاہور
۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ شیخ صاحب اَلسلام علیکم!
آپ کی تصنیف "شہادت الفرقان علی جمع القرآن" کئی روز ہوئے مجھے شیخ عتیق اللہ صاحب سے ملی تھی۔ میں عرصہ سے آپ کی تحریر کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا عدیم الفرصت رہا' معاف کیجئے گا۔
یہ چھوٹا رسالہ نہایت لاجواب ہے اور میں اِس کے طرز اِستدلال کو نہایت پسند کرتا ہوں۔ آپ کی محنت واقعی داد کے قابل ہے۔ اور آپ اِس بات کیلئے تحسین کے مستحق ہیں کہ قانونی مشاغل میں دینی خدمت کا موقع بھی نکال لیتے ہیں خدا آپ کو جزائے خیر دے۔
یورپ میں اِس مضموں پر تحقیق ہوئی اور ہو رہی ہے خصوصاً علمائے جرمنی کے درمیان ایک شخص موسوم بہ فان کریمر نے جرمن زبان میں ایک مبسوط

کتاب "تاریخ القرآن" لکھی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کبھی فرصت ملے تو اِس کے بعض حصص کا ترجمہ اُردو میں کر ڈالوں ۔ کتاب کا انداز عالمانہ اور منصفانہ ہے اگرچہ مجموعی لحاظ سے اِس کا مقصد ہماری آراء اور عقائد کے خلاف ہے ۔ میرا مقصد ترجمے سے صرف یہ ہے کہ ہمارے علماء کو یورپ والوں کا طرزِ اِستدلال و تحقیق معلوم ہو ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد اِقبال

(۲)

لاہور

۶ جنوری ۲۲ء

مخدوم و مکرم قبلہ شیخ صاحب اَلسلام علیکم

والا نامہ ملا۔ جس کیلئے سراپا سپاس ہوں۔

اگرچہ نمائشی چیزوں سے دِل گریز کرتا ہے اور میرے قلب کی کیفیت یہ ہے کہ

دلم بہ ہیچ تسلی نمی شود حاذق
بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

بوجہ تعلقات دیرینہ آپ کے خط نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ جس کیلئے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ حضرت قبلہ گاہی کی خدمت میں آپ کی مبارک باد پہونچادوں گا۔ عزیز عتیق اللہ قریباً ہر روز ملتا ہے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا اور زاویہ نشینی کی وجہ سے قرآن کریم پر غور و خوض کرنے کا بہتر موقع آپ کو ملتا ہوگا

مخلص

محمد اِقبال

پروفیسر شیخ عطاء اللہ

"اِقبال نامہ" کے مرتب شیخ عطاء اللہ اِقبالیات میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

شیخ عطاء اللہ ۱۸۹۶ء میں جلالپور جٹاں میں پیدا ہوئے۔ شیخ صاحب کے پڑدادا' یمرش (کشمیر) سے ہجرت کر کے جلالپور جٹاں میں آ آباد ہوئے تھے۔ شیخ عطاء اللہ کے والد شیخ امیر بخش ہائیکورٹ کے پٹیشن رائٹر تھے۔

شیخ عطاء اللہ نے ابتدائی تعلیم مشن سکول جلالپور جٹاں سے حاصل کی۔ میٹرک مشن سکول گجرات سے پاس کیا۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ اِسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے اقتصادیات کی ڈگری لی۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ ھائی سکول بدوکی (سیالکوٹ) میں اُستاد رہے ۱۹۲۵ء سے دسمبر ۱۹۲۹ء تک مرے کالج سیالکوٹ سے وابستہ رہے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء سے جون ۱۹۴۸ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اِس کے بعد ہیلی کالج کے وائس پرنسپل رہے۔ اِسلامیہ کالج چنیوٹ کے بانی پرنسپل تھے۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی جو اُردو میں اِس موضوع پر اولین کتب میں سے ہے۔ شیخ صاحب نے ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو انتقال فرمایا اور غازی علم دین شہید کے مزار کے قریب قبرستان میانی صاحب (لاہور) میں دفن ہوئے۔ (۲)

اِقبال اور شیخ عطاء اللہ

اِقبال اور پروفیسر عطاء اللہ کے درمیان گہرے ذاتی مراسم تو نہ تھے کیونکہ عمر کے فرق اور فاصلہ کی وجہ سے ایسا ممکن نہ تھا۔ لیکن دونوں میں مضبوط قلبی تعلق موجود تھا جس کی بقول مختار مسعود صاحب (۳)

"تین مضبوط بنیادیں تھیں۔ اِسلام' عشق رسول اور عالم اِسلام کی نشاۃ ثانیہ"

"والدِ مرحوم دسمبر ۱۹۲۹ء سے جون ۱۹۴۸ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ والد مرحوم جب کبھی چھٹیوں میں علی گڑھ سے پنجاب آتے تو وقت نکال کر لاہور جاتے اور علامہ کے یہاں حاضری دیتے۔ ایک بار مجھے اور میرے بڑے بھائی کو ہمراہ لے گئے۔ ہم دونوں بہت چھوٹے تھے۔ میں غالباً چھ سات سال کا تھا ہم دونوں بھائی جاوید منزل کے باہر تانگہ میں بیٹھے رہے۔ اِس روز ہم نے زِندگی میں پہلی بار چڑیا گھر دیکھا تھا۔ وہ دِن مدتوں اِسی حوالہ سے یاد رہا۔ اب اس روز کا اور زِندگی کا اہم واقعہ ایک ایسے سایۂ دیوار میں

ستانا ہے جو اقبال کی دیوار تھی۔" مختار مسعود صاحب مزید رقمطراز ہیں۔(۴)

"ایک بار علامہ نے والد مرحوم سے فرمایا کہ جو کام آپ کر رہے ہیں۔ اس کیلئے لاہور زیادہ موزوں ہے۔ آپ یہاں آجائیے۔ والد مرحوم نے جب مدتوں کے بعد مجھ سے اِس ملاقات اور فرمائش یا ہدایت کا ذکر کیا تو مسکراتے ہوئے جو کچھ کہا وہ اِس مصرع میں سما جاتا ہے۔

یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

مختار مسعود صاحب نے اِسی سلسلہ میں مزید لکھا۔

"حکیم نسیم راحت سوہدروی نے جو علی گڑھ طبیہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ طلباء کے ہمراہ علامہ سے ملنے آئے۔ علامہ نے تین چار اساتذہ کا نام لیا کہ وہ علی گڑھ میں بڑا اچھا کام (خدمت اِسلام مراد ہے) کر رہے ہیں سرفہرست پروفیسر ظفر الحسن (۱۸۷۹-۱۹۴۹ء) صدر شعبہ فلسفہ کا نام ہے۔ اِس فہرست میں والد مرحوم (شیخ عطاء اللہ) کا نام بھی شامل ہے"

علی گڑھ کے اِساتذہ میں سے جن حضرات کو اقبال سے گہری عقیدت تھی اور اُنہوں نے فکر اِقبال کے عرفان کو عام کرنے اور اِسے علی گڑھ کے قافلے میں لٹانے کیلئے تحریری اور عملی کوششیں کیں ان میں بھی شیخ عطا اللہ بہت نمایاں تھے۔ اور جواب میں اِقبال بھی اِن کی دِل سے قدر کرتے تھے(۵) شیخ عطاء اللہ نے "پنجاب میں تحریک امداد باہمی" نامی کتاب(۶) لکھی تو اِقبال نے علی گڑھ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کو خط لکھ کر سفارش کی کہ شیخ عطاء اللہ کو اِس کتاب کی اشاعت کیلئے یونیورسٹی فنڈ سے ایک سو پاؤنڈ قرض عنایت کریں تاکہ وہ ناشر کو ادا کر کے کتاب شائع کروا سکیں (۷) اصل خط انگریزی میں ہے جس کا عکس صفحہ ۴۸۲ پر موجود ہے ذیل میں اس کا ماہنامہ شاعر بمبئی اقبال نمبر ۱۹۸۸ء صفحہ ۴۶۳ پر شائع ہونے والا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

جاوید منزل

میو روڈ۔ لاہور

مائی ڈیئر ڈاکٹر ضیاء الدین

میں آپ کو یہ خط ایک ایسے مسئلے پر لکھ رہا ہوں جو ملک و ملت دونوں کیلئے نہایت اہم ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کے جناب عطاء اللہ نے "پنجاب میں تحریک امداد باہمی" پر ایک کتاب مکمل کی ہے۔ جس کو لندن کا مشہور ناشر GEORGE ALLEN ماہرین کی رپورٹ کے بعد شائع کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ آل انڈیا کو آپریٹیو انسٹی ٹیوٹ

ایسو سی ایشن نے بھی اس کتاب کو آل انڈیا کو آپریٹیو سیریز کے تحت جاری کرنا قبول کر لیا ہے۔

کتاب کی سائنسی نوعیت کے پیش نظر ناشر جیسا کہ اس کاروبار کا دستور ہے ہر ممکن مالی نقصان سے بچنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے مصنف سے بطور عطیہ ۱۰۰ پونڈ کتاب کی اشاعت کے لیے طلب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رقم مصنف کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

میں عطاء اللہ صاحب کی اس تصنیف کی اہمیت اور اس کے مسلمانان پنجاب کی معاشی زندگی سے تعلق پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہوں۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ ہماری ملت میں معاشیات کے ماہرین کی حد درجہ کمی ہے اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ ان میں سے اگر کوئی بھی نمایاں کام کرے تو اس کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی ضرورت ہے خصوصاً جب کہ اس کا تعلق علی گڑھ سے ہو[1] اور اس کے کام کو خراج تحسین مل چکا ہو۔ پنجاب کے مسلمان اس موضوع میں حد درجہ دلچسپی رکھتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت مصنف کے لیے اور آپ کی یونیورسٹی کے لیے عزت کا باعث ہوگی۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ عطاء اللہ صاحب کو اپنا ذاتی اثر استعمال کرتے ہوئے یونیورسٹی فنڈ میں سے ۱۰۰ پونڈ دلا دیں۔ تاکہ وہ اپنی کتاب کی اشاعت بغیر کسی تاخیر کے کرا سکیں۔ عطاء اللہ صاحب اس بات کا ذمہ لیتے ہیں کہ وہ اپنی رائلٹی کی تمام رقم جو ان کو ملے گی اس وقت تک یونیورسٹی کو دیتے رہیں گے جب تک یہ رقم ادا نہ ہو جائے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ روپیہ یونیورسٹی اور ملت کے حق میں خرچ ہوگا۔

کیا میں امید رکھوں کہ آپ میری اس درخواست و تجویز پر فوراً سنجیدگی سے غور فرمائیں گے؟ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ اس معاملہ میں اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ کریں۔

لاہور۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۶ء مخلص۔ محمد اقبال

اِس تعلق کے علاوہ "مرتب خطوط اِقبال" کی حیثیت سے بھی شیخ عطاء اللہ کا نام بہت معتبر ہے۔ اِس کی تفصیل "محققین اِقبال" کے باب میں آئیگی۔

خان صاحب ملک کرم الدین

گجرات اور لاہور میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینے والے ملک کرم الدین بھی اِقبال کے احباب میں سے تھے۔

ملک کرم الدین ۱۹ مارچ ۱۸۸۴ء کو ملک عمر بخش کے گھر تحصیل کھاریاں کے گاؤں بھگوال میں پیدا ہوئے۔ مشن سکول گجرات سے انٹرنس کرنے کے بعد ۱۹۰۵ء میں محکمہ ٹیلی گراف میں ملازم ہوئے۔ اور ایران بلوچستان کی سرحد پر ' پنجاب اور صوبہ سرحد کے مختلف مقامات پر تعینات رہے۔ جنگ عظیم اول میں مستعدی سے کام کیا۔ ۱۹۱۷ء میں سری نگر میں تبدیل ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں فیلڈ سروس کے سلسلہ میں مشہد (ایران) بھیجے گئے۔ جہاں اُنہوں نے کمال مہارت اور جانبازی سے خدمات سرانجام دیں۔ کمانڈر انچیف اور وزیر جنگ مسٹر چرچل کے توسط سے ملک معظم نے خوشنودی مزاج کی سند عطا کی اور ۱۹۲۱ء میں "خان صاحب" کا خطاب ملا اور جوبلی میڈل سے بھی نوازا گیا۔

۱۹۲۸ء میں ملک صاحب ٹیلی گراف ماسٹر اور ۱۹۳۷ء میں سپرنٹنڈنٹ ٹیلی گراف کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں ایک شاندار سروس ریکارڈ کیساتھ ریٹائر ہوئے۔

اِس کے بعد ملک صاحب نے اپنی زِندگی سماجی خدمت کیلئے وقف کر دی۔ اُنہوں نے دیوان چمن لال اور خلیفہ شجاع الدین (م۔۱۹۵۵) کی قیادت میں آل انڈیا پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف یونین کی بنیاد رکھی۔ دوران ملازمت بھی محکمہ ٹیلیگراف کی کواپریٹو کریڈٹ سوسائٹی کے سیکرٹری رہے۔ بعد ازاں اُنہوں نے مسلم کواپریٹو سوسائٹی کی بنیادی رکھی جس نے مسلمان ملازمین کی اقتصادی حالت بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ملک صاحب اَنجمن حمایت اِسلام لاہور کی جنرل کونسل کے بارسوخ رکن اور اِس کی فنانس کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔ اَنجمن کی تالیف و طبع کمیٹی کے سیکرٹری بھی رہے۔ بعد ازاں وہ اَنجمن کے سیکرٹری بھی رہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ملک صاحب گجرات آ گئے۔ جہاں انکے والد ۱۹۲۱ء سے رہائش پذیر تھے۔ گجرات میں محلہ مسلم آباد میں کچہری روڈ پر "ملک منزل" ان کا مسکن تھا۔ گجرات میں اُنہوں نے "اَنجمنِ تحفظِ مفادِ عامہ" کی بنیاد رکھی اور "اَنجمنِ خدام الاسلام گجرات" کے سیکرٹری رہے۔ ملک صاحب گجرات ہی میں ۱۳ اگست ۱۹۵۹ء کو جمعرات کے روز فوت ہوئے اور قبرستان بھٹیاں میں دفن کیے گئے (۸)

اِقبال اور ملک کرم الدین

اقبال اور ملک کرم کے درمیان ملاقاتوں اور روابط کا سب سے بڑا ذریعہ انجمن حمایتِ اسلام لاہور تھی۔ علاوہ ازیں امتِ مسلمہ کی فلاح و بہبود کی مشترک کوششیں اور مشترک حلقۂ احباب بھی قربت کا باعث تھا

خانصاحب ملک کرم الدین کے پوتے ضیاء الدین ملک ایڈووکیٹ لاہور لکھتے ہیں (۹)

"میرے دادا خانصاحب ملک کرم الدین مرحوم کا علامہ اِقبال کیساتھ بہت قریبی رابطہ تھا۔ خصوصاً انجمنِ حمایتِ اِسلام لاہور دیگر فلاحی تنظیموں کے حوالے سے ' جن کی قیادت خلیفہ شجاع الدین اور میرے دادا کرتے تھے ' یہ تعلق عرصہ دراز تک قائم رہا۔"

" ملک صاحب اِقبال کی اَدبی محفلوں اور خصوصی طور میں میو روڈ والی کوٹھی پر حاضری دیتے تھے اِقبال اور ملک کرم الدین دونوں کو کشمیر جنت نظیر سے والہانہ محبت تھی"۔

"مجھے ۱۳ اگست ۱۹۵۹ء کا دِن ابھی تک یاد ہے جبکہ "ملک منزل" کچہری روڈ گجرات کے مکان میں بوقت وفات خانصاحب ملک کرم الدین نے اِقبال کا یہ شعر تحریر کیا اور چند لمحے بعد انکی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

نہ جہاں میں کہیں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں "

خان بہادر شیخ عبدالعزیز

خان بہادر شیخ عبدالعزیز سی آئی ای ' او بی ای ' ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کا آبائی وطن گجرات تھا۔

۲۴ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو محلہ چاہ بھنڈر میں عبداللہ خاں قریشی شیخ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گجرات میں حاصل کی۔ پھر لاہور سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ محکمہ پولیس میں بھرتی ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ڈی آئی جی کے عہدے تک پہنچے اور ۱۹۳۰ء کے قریب ریٹائر ہوئے۔

شیخ صاحب' شیخ عبدالقادر کے قریبی دوست تھے۔ اور ان کے بعد " آبزرور" کے اعزازی مدیر بھی رہے۔ یہ ۱۹۰۷ء کا زمانہ تھا۔ شیخ عبدالعزیز پریس برانچ کے انچارج بھی رہے۔ جنگ عظیم اول کے دوران وہ پبلسٹی کمیٹی کے جائینٹ سیکرٹری تھے اور سرکاری اخبار " حق " بھی شائع کرتے تھے۔ ۳ جون ۱۹۱۸ء کو اُنہیں شاندار پیشہ ورانہ خدمات کے اعتراف میں "خانصاحب" کا خطاب دیا گیا۔ تب وہ ڈی ایس پی تھے۔ بعد میں اُنہیں "خان بہادر" کا خطاب بھی ملا۔

شیخ صاحب نے ۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کو وفات پائی اور رحمان شہید روڈ (گجرات) کے کنارے جامع مسجد غوثیہ نظیریہ سے متصل جانب مشرق اپنے آبائی قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ (۱۰)

اِقبال اور شیخ عبدالعزیز

علامہ اِقبال اور شیخ عبدالعزیز میں راہ و رسم اور میل ملاقات کا سب سے بڑا حوالہ انجمنِ حمایتِ اِسلام لاہور تھی۔ شیخ صاحب تمام عمر انجمن سے وابستہ رہے۔ اِسی پلیٹ فارم سے اِقبال سے روابط ہوئے جو قدرتی نشیب و فراز کیساتھ آخر دم تک قائم رہے۔ شیخ صاحب ۱۹۰۵ء سے انجمن کے رکن چلے آرہے تھے اور انجمن کیساتھ ان کا نہایت گہرا تعلق تھا۔ جب وہ گجرات سے لاہور منتقل ہوئے تو اپنا آبائی مکان جو چاہ بھنڈر محلہ میں تھا انجمن کے نام وقف کر دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں شیخ صاحب انجمن کے آنریری سیکرٹری اور سی آئی ڈی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اکتوبر نومبر ۱۹۱۹ء میں انجمن کی جنرل کونسل کے کچھ ارکان نے شیخ صاحب کی جگہ اِقبال کو انجمن کا سیکرٹری بنانے کی تحریک چلائی (۱۱)

اِقبال' خان نیاز الدین خان کو ایک جوابی خط میں لکھتے ہیں:۔

"سیکرٹری شپ انجمنِ حمایتِ اسلام کیلئے کوئی کوشش نہیں کر رہا۔ مسلمان پبلک میرے سپرد یہ کام کرنا چاہتی ہے۔ اور میں نے بعض معززین سے وعدہ کیا ہے کہ اگر عبدالعزیز صاحب مستعفی ہو جائیں تو میں یہ کام اپنے ذمے لے لونگا۔ اِس سے زیادہ میری اور کوشش نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ مقصود جاہ طلبی اور نام نمود نہیں۔ اگر عبدالعزیز صاحب نے یہ کام چھوڑ دیا تو میں جہاں تک میرے بس میں ہوگا' کام کروں گا" (۱۲)

۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو جنرل کونسل کا اجلاس ہوا اور طے پایا کہ شیخ عبدالعزیز کی جگہ ڈاکٹر محمد اقبال کو سیکرٹری انجمن مقرر کیا جائے۔ اقبال نے اِس درخواست کو قبول کیا۔ اِس کے بعد ذوالفقار علی خاں' مولوی رحیم بخش اور مبارز خاں ٹوانہ' شیخ عبدالعزیز کے مکان پر گئے اور اُنہیں تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اِستعفیٰ دے دیا اور ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو علامہ اقبال بلامقابلہ انجمن کے آنریری سیکرٹری منتخب ہو گئے (۱۳)

علامہ کے ایک خط بنام مولانا مہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۴ء میں شیخ صاحب' دوبارہ انجمن کے سیکرٹری منتخب ہو چکے تھے۔ اقبال لکھتے ہیں۔ (۱۴)

"میں نے پرسوں ایک خط "زمیندار" میں اشاعت کی غرض سے لکھا تھا۔ اِس میں سیکرٹری انجمن حمایت اِسلام لاہور کا نام لکھنا بھول گیا۔ اُس میں "شیخ عبدالعزیز صاحب" کے الفاظ بڑھا دیجئے۔"

۲۳ جون ۲۹ء کو انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس میں نظام حیدر آباد دکن کی لاہور آمد کے موقع پر مسلمانان پنجاب کی طرف سے خیرمقدم کے متعلق لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ نظام اقبال کی دعوت پر آ رہے تھے چنانچہ اُنہوں نے کچھ تجاویز پیش کیں جن پر بحث وگفتگو ہوئی جس میں حصہ لینے والوں میں شیخ عبدالعزیز بھی شامل تھے۔ (۱۵) اسی طرح ۶ ستمبر ۱۹۳۶ء کو انجمن نے زنانہ حمیدیہ یونیورسٹی کیلئے ایک سپیشل کونسل کے قیام کا فیصلہ کیا۔ یکم نومبر کو ووٹوں کے ذریعے ارکان کا انتخاب ہوا۔ منتخب ہونے والوں میں اقبال اور شیخ عبدالعزیز دونوں شامل تھے۔ (۱۶) یکم جولائی ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے اپنی طویل علالت کیوجہ سے انجمن کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اِس موقع پر گیارہ اصحاب پر مشتمل ایک وفد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اِستعفیٰ پر دوبارہ غور کرنے کی درخواست کی۔ اِس وفد میں شیخ عبدالعزیز بھی شامل تھے (۱۷)

ملک اللہ دتہ

ملک اللہ دتہ، جاوید منزل کے قریب واقع "خیابان ہوٹل" کے مالک تھے اور علامہ کا ہمسایہ ہونے کی وجہ سے احباب میں شامل تھے۔

ملک اللہ دتہ ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ حاجیوالہ (ضلع گجرات) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ملک احمد دین تھا۔ ملک اللہ دتہ صرف ابتدائی تعلیم حاصل کر سکے۔ سلسلہ معاش میں لاہور آئے۔ چھوٹے سے کاروبار سے ابتداء کی اور اپنی خوش بختی کی وجہ سے بہت ترقی کی "خیابان ہوٹل" کے علاوہ "ملک تھیٹر" اور انجینئرنگ ملز کے بھی مالک تھے۔ ملک صاحب نے ۱۹۷۸ء میں وفات پائی (۱۸)

اقبال اور ملک اللہ دتہ

علامہ اقبال کی رہائش گاہ "جاوید منزل" (جواب "علامہ اقبال میوزیم" ہے) اور خیابان ہوٹل، میو روڈ پر سو قدم کے فاصلے پر واقع ہیں۔ اِسی ہمسائیگی اور ملک اللہ دتہ کے دل میں موجود اقبال کے احترام کے سبب دونوں میں مراسم تھے۔ ملک صاحب خود زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کے دوستوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نامور لوگ شامل تھے۔ ملک صاحب کے بھانجے جناب شیخ سعید (ریلوے روڈ گجرات) بیان کرتے ہیں۔

"ملک صاحب عمر میں اقبال سے چھوٹے تھے اور زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے اس لئے اقبال سے انکے مراسم کو ہم دوستانہ تو نہیں کہہ سکتے تاہم نیازمندی کا رشتہ ضرور موجود تھا۔ علامہ کے گھر سے قریب ہونے، علامہ کے دوستوں کا دوست ہونے اور انکے عظیم قومی کردار کی وجہ سے وہ اقبال کی بہت عزت کرتے تھے۔ ملک صاحب، "جاوید منزل" حاضری دیتے اور اقبال بھی کبھی خیابان ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے رک جاتے۔

ڈورس احمد، جو علامہ کے بچوں، جاوید اقبال اور منیرہ کی گورنس تھیں اور ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک جاوید منزل میں رہیں، لکھتی ہیں۔ (۲۰)

"ڈاکٹر صاحب کا ایک دانت انھیں کافی عرصے سے تکلیف دے رہا بعد میں بانو کے دانت میں بھی تکلیف شروع ہو گئی۔ چنانچہ ہم سب مال روڈ پر ڈاکٹر عطاء اللہ کے کلینک پر گئے۔ ہوٹل خیابان جو ابھی جاوید منزل کے سامنے واقع ہے کے (مالک) ملک اللہ دتہ ہمیں اپنی گاڑی پر وہاں لے گئے"

سید سجاد حیدر بخاری

سید سجاد حیدر بخاری علامہ کے ہم زلف' مداح اور نوجوان دوست تھے۔ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شہزادہ بیگم ان کی زوجہ محترمہ تھیں۔

سید سجاد حیدر دسمبر ۱۹۰۲ء میں گجرات شہر کے محلہ کالری دروازہ میں پیدا ہوئے۔ سید سجاد حیدر کے والد سید نور اللہ شاہ سول جج تھے اور خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کے بہت قریبی مخلص دوست تھے۔ سید سجاد حیدر نے ابتدائی تعلیم گجرات شہر کے مشن سکول میں حاصل کی۔ میٹرک کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے ' ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

گجرات میں پریکٹس شروع کی۔ مگر تھوڑے ہی عرصے بعد لاہور چلے گئے اور ہائیکورٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت بہت کامیاب ہوئے اور Document Expert کے طور پر نام کمایا

سید سجاد حیدر نے ۱۹۷۵ء میں لاہور میں وفات پائی اور قبرستان مومن پورہ میں دفن کئے گئے (۲۱)

اقبال اور سید سجاد حیدر

سید سجاد حیدر لاہور میں جس مکان میں رہتے تھے وہ علامہ کے گھر کے بالکل ساتھ تھا یوں قربت اور رشتہ داری دونوں میں مراسم کا باعث بنی۔ سید سجاد حیدر کی چھوٹی ہمشیرہ بلقیس عابد علی لکھتی ہیں۔

"علامہ مرحوم جب میکلوڈ روڈ ایشرداس بلڈنگ کے سامنے ایک کوٹھی میں مقیم تھے انکے ساتھ ہی یعنی یہ دیوار بیچ میرے بھائی کی اقامت تھی..... وہ عرصہ تک علامہ مرحوم کے ساتھ کے مکان میں (دیوار بہ دیوار) رہا کئے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کیے" (۲۲)

سید پرویز سجاد بخاری' اپنے والد اور اقبال کے تعلق کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"عمر کے کافی فرق کی وجہ سے دونوں کے تعلق کو ہم بے تکلفانہ نہیں کہہ سکتے مگر رشتے کی نوعیت (ہم زلف) اور ہمسائیگی کی وجہ سے کسی حد تک دوستانہ تعلقات ضرور تھے۔ پھر والد مرحوم علامہ کی شاعرانہ عظمت سے بھی آگاہ تھے اور عقیدت رکھتے تھے"

شیخ عنایت اللہ

برصغیر کے مشہور اشاعتی ادارے تاج کمپنی لمیٹڈ (جواب دیوالیہ ہو چکی ہے) کے مینجنگ ڈائریکٹر شیخ عنایت اللہ ۲ نومبر ۱۹۰۲ء کو گجرات شہر میں حکیم غلام رسول کے گھر پیدا ہوئے جو گجرات شہر کے محلہ خواجگان میں رہتے تھے اور مسلم بازار میں "ڈائمنڈ ہال" کے نام سے حکمت کی دکان چلاتے تھے۔ شیخ عنایت اللہ نے ابتدائی تعلیم گجرات کے مشن سکول سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم لاہور میں پائی۔

۱۹۲۹ء میں شیخ صاحب نے برانڈرتھ روڈ (لاہور) پر تاج کمپنی کا آغاز کیا۔ پھر یہ ادارہ ریلوے روڈ پر منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں کراچی میں اِس کی برانچ کھولی گئی جس کے پریس کا افتتاح وزیر اعظم لیاقت علی خان (۱۸۹۵۔۱۹۵۱ء) نے کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ میں بھی برانچ کھولی گئی۔ رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں اِس کا جال پھیل گیا اور قرآن پاک کی اشاعت کیلئے اِس کمپنی نے دُنیا بھر میں نام کمایا۔ اِس فرم کو مختلف اِسلامی ممالک کے سربراہ دیکھنے کیلئے تشریف لاتے رہے۔

شروع میں یہ کمپنی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دوائیاں بھی تیار کرتی تھی۔ اِس کے کئی نسخے بہت مشہور ہوئے۔ شیخ عنایت اللہ نے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۲ء کو کراچی میں وفات پائی۔

تاج کمپنی نے قرآن پاک کے علاوہ جو کتب شائع کیں ان میں اِقبال کی تصانیف بھی شامل ہیں۔ "بالِ جبریل" کو پہلی دفعہ جنوری ۱۹۳۵ء میں تاج کمپنی نے ہی شائع کیا تھا اور بعد میں بھی کئی ایڈیشنز شائع کیے۔ (۲۳)

اِقبال ۲۸ اگست ۱۹۳۴ء کو سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"کتابوں کے متعلق بھی جلد لکھئے یعنی بالِ جبریل 'مسافر اور آپ کا اُردو ترجمہ... مقدم الذکر کے متعلق بھی جلد فیصلہ ہونا چاہیے کیونکہ بعض یہاں کے لوگ بھی مثلاً تاج کمپنی اِستفسار کر رہی ہے۔ (۲۴)

۱۹۳۸ء میں "حیاتِ اقبال" نامی کتاب بھی تاج کمپنی نے شائع کی جو اس موضوع پر اولین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ (۲۵)

۶ مارچ ۱۹۳۶ء کو اِقبال ایک خط میں جناب محمد جمیل کو لکھتے ہیں۔

"بالِ جبریل 'گزشتہ سال شائع ہوئی تھی اور ضربِ کلیم امید ہے آئندہ اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اِن دونوں کتابوں کیلئے تاج کمپنی لاہور کو لکھئے۔ (۲۶)

مکتوب اقبال بنام شیخ عنایت اللہ

شیخ عنایت اللہ ۱۹۳۶ء میں یورپ کے دورے سے واپس آئے تو علامہ سے ملاقات کے خواہاں ہوئے اور ملاقات کیلئے وقت مانگا۔ اقبال نے درج ذیل جواب لکھا۔ (۲۷)

جناب شیخ صاحب

السلام علیکم

یورپ سے مع الخیر واپس آنے کی مبارک!

میں تمام دن گھر میں ہوتا ہوں آپ جس وقت چاہیں تشریف لائیں۔ صبح کا وقت آٹھ بجے یا نو بجے بہتر ہوگا۔ اگر یہ وقت آپ کیلئے موزوں نہ ہو تو شام چھ سات بجے۔

ضرب کلیم کی طباعت غالباً اس ماہ کے آخر تک ختم ہو جائے گی۔ افسوس ہے کہ اس میں غیر معمولی تعویق ہو گئی۔ اس میں میرا قصور نہیں' پریس کا قصور ہے۔

والسلام

محمد اقبال۔ ۲۴ جون ۳۶ء

لاہور' میو روڈ

ملک محمد الدین

ملک محمد الدین ماہنامہ "صوفی" پنڈی بہاؤ الدین گجرات کے مدیر و مالک تھے اور اِقبال کے احباب میں سے تھے۔

ملک صاحب کا اصلی وطن گاؤں "مہوٹہ کلاں" تھا جو دریائے چناب کے مشرقی کنارے واقع تھا مگر گجرات کے ضلع میں شامل تھا۔ ایک دفعہ بے چراغ ہونے کے بعد اب دوبارہ کسی حد تک آباد ہو چکا ہے۔ (۲۸)

اِن کے والد علاقہ کے نامور طبیب تھے۔ مگر ملک محمد الدین کی پیدائش سے قبل وہ وفات پا گئے تھے۔ کچھ زمین تھی وہ دریا بہا کر لے گیا اور مکان بھی دریا برد ہو گیا۔ ملک صاحب مشکلات میں گھر گئے۔ جلالپور جٹاں میں عارضی سکونت اختیار کی۔ ایک سرکاری نوکری ملی مگر جلد ہی چھوڑ دی اور ۱۹۰۶ء میں سراسیمہ اور بے خانماں پھرتے پھراتے آپ والد کے مرشد خانہ 'سیال شریف پہنچے اور صاجزادہ محمد الدین کے پاس پہنچے' اُنہوں نے ملک صاحب کو جلالپور شریف (جہلم) بھیجا۔ چنانچہ پیر سید حیدر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنی دردناک کہانی سنائی۔ طلب امداد کیلئے سلسلہ چشتیہ نظم کر کے لے گئے تھے' درد انگیز لہجے میں پڑھا۔ پیر صاحب بہت متاثر ہوئے' تین بار سنا اور تین بار دعا فرمائی اور ملک صاحب کو بیعت کر لیا۔ (۲۹) اِس کے بعد ملک صاحب کی کایا پلٹ گئی اور مقدر مہربان ہو گیا۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ "صوفی" کا اجراء کیا اور ساتھ ہی "صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاؤ الدین گجرات" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس نے بے شمار علمی و اَدبی و دینی کتب شائع کیں۔ وہ نہایت محنتی اور ذہین شخص تھے۔ جلد ہی صوفی کا شمار ہندوستان کے معیاری اور کثیرالاشاعت رسالوں میں ہونے لگا۔

ملک صاحب نے متعدد دینی نوعیت کی کتب تالیف کیں جن "ذکر حبیب" "خاتون جنت" "سیرت صدیقہ" اور "سیرت الزہرہ" وغیرہ شامل ہیں وہ پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ملک صاحب ۱۷ دسمبر ۱۹۶۴ء کو فوت ہوئے اور منڈی بہاؤ الدین کے محلّہ "طارق آباد" میں مدفون ہوئے۔ (۳۰)

اِقبال اور ملک محمد الدین

اقبال سے ملک محمد الدین کا تعارف منشی محمد الدین فوق کے ذریعے ہوا جو ملک صاحب اور اِقبال دونوں کے قریبی دوست تھے۔ پھر میل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اِقبال نے آپنے ایک خط میں ملک صاحب کی معاملہ فہمی اور کاروانی کا اعتراف کیا ہے(۳۱)
ملک محمد الدین نے ۱۹۲۳ء میں آپنے مرشد سید حیدر شاہ کی مفصل سوانح عمری ترتیب دی۔ اِس موقع پر اُنہوں نے ملک کے نامور شعراء سے پیر حیدر شاہ کے متعلق قطعات لکھوائے۔ اور چیدہ چیدہ "ذِکر حبیب" میں شامل کیے۔ علامہ نے بھی ملک صاحب کی درخواست پر ایک قطعہ تاریخ رحلت لکھا' علامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعہ کا عکس کتاب میں شائع کیا گیا(۳۲)۔
"ذِکرِ حبیب" کے دیباچہ میں ملک صاحب لکھتے ہیں

> "میں ملک کے نامور شعراء کا بھی رہین منت ہوں جنہوں نے آپنے کلام بلاغت نظام سے مجھ کو ممتاز فرمایا۔ ڈاکٹر سر محمد اِقبال ایم اے پی ایچ ڈی اور خان بہادر سید اَکبر حسین الہ آبادی سے لیکر عام نغز گویان تک کے نتائج افکار کتاب کے اوراق میں درج ہیں" (۳۳)

اِقبال کا مدیر "صوفی" کو نوٹس

والدہ اِقبال نے ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ کچھ عرصہ بعد علامہ نے ایک نظم لکھی' "والدہ مرحومہ کی یاد میں" یہ نظم ان کی معرکتہ الآراء نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ علامہ نے خوش نویس سے لکھوا کر یہ نظم آپنے والد صاحب کی خدمت میں ارسال کی۔ ۱۹۱۵ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ سیالکوٹ آئے تو اُنہیں "صوفی" کا ایک پرچہ ملا جس میں یہ نظم شائع کی گئی تھی۔ اِقبال نے ابھی تک یہ نظم کسی رسالے کو اشاعت کیلئے نہیں دی تھی چنانچہ وہ بہت خفا ہوئے کہ "صوفی" والوں نے یہ نظم بلا اجازت کیوں چھاپ دی ہے۔ اور اِسی وقت "صوفی" والوں کے نام ایک نوٹس تحریر کیا۔ علامہ کا خیال تھا کہ نظم' ان کے بھتیجے اعجاز احمد نے سیالکوٹ سے صوفی والوں کو بھیجی ہے لیکن دونوں نظموں میں اشعار کی کمی و بیشی نے ثابت کر دیا کہ نظم لاہور سے علامہ کے گھر سے اڑائی گئی ہے۔" (۳۴) ڈاکٹر مظفر حسن ملک کا خیال ہے کہ یہ نظم محمد الدین فوق کے ذریعے صوفی تک پہنچی (۳۵)
علامہ اپنی تحریروں کی اشاعت میں احتیاط کرتے تھے چاہے وہ شاعری ہو یا سیاسی بیان۔ اِسی اصول کی زد میں ان کے دوست عبدالمجید سالک اور امتیاز علی تاج بھی آ گئے تھے لیکن معاملہ ہمیشہ دوستوں کے درمیان ہی رفع دفع ہو جاتا تھا (۳۶) چنانچہ "صوفی" والوں نے بھی معذرت کر کے علامہ کو درگزر کرنے پر آمادہ کر لیا (۳۷)

نجف علی عاصی

مولوی نجف علی عاصی ایک ماہر تعلیم، شاعر اور مترجم تھے اور علامہ اقبال کے مداحوں اور ملنے والوں میں سے تھے۔

عاصی ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انکے والد کا نام عبدالصمد تھا اور وہ مشن سکول جلالپور جٹاں کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ عاصی نے ابتدائی تعلیم جلالپور جٹاں مشن سکول سے حاصل کی۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ایم اے غنی ۱۸۹۰ء سے امیرِ کابل حبیب اللہ کی دعوت پر کابل چلے گئے تھے اور امیر عبدالرحمٰن (۱۸۴۴۔۱۹۰۱ء) کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اُنہوں نے چھوٹے بھائی عاصی کو بھی کابل بلا لیا، جہاں وہ دارالترجمہ کے انچارج مقرر ہوئے کچھ عرصہ بعد دونوں بھائیوں کو افغانستان میں عمومی تعلیم کی ترویج و ترقی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اُنہوں نے آپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد چراغ اور کئی دیگر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ہندوستان سے بلالیا اور اِن بھائیوں نے افغانستان کو جدید تعلیم کی روشنی سے منور کرنے کیلئے انتھک کوششیں کیں۔ عاصی کی حیثیت نگرانِ اعلیٰ مدارس کی تھی جبکہ ڈاکٹر ایم، اے غنی وزیرِ تعلیم کا درجہ رکھتے تھے۔

تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ یہ دونوں بھائی دیگر انتظامی امور میں بھی امیر کے معاون تھے۔ وہ دونوں "مجلس قانون" اور "مجلس شرفاء" کے اہم رکن تھے اور امیر اُنکی رائے کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ عاصی سات برس تک شہزادہ امان اللہ کے اتالیق بھی رہے۔ دیگر درباریوں کو ان کی عزت اور مقام ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، چنانچہ ایک سازش کے ذریعے اِن لوگوں کو بغاوت کے الزام میں قید کر دیا گیا۔ قید کے چند ماہ بعد عاصی نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کیلئے ایک پرسوز قصیدہ لکھا مگر بے سود! سالہا سال زندانِ ارک میں گزر گئے۔ اِن تین بھائیوں کے خاندان پر بھی نہایت اذیت ناک دور تھا۔ جہاں اور سب کچھ لٹا وہاں عاصی کا ایک ضخیم فارسی دیوان بھی ضائع ہوگیا۔ آخر ۲۰ فروری ۱۹۱۹ء کو امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد شہزادہ امان اللہ تخت نشین ہوا تو مارچ ۱۹۱۹ء میں عاصی اور انکے بھائیوں کو رہائی نصیب ہوئی۔ شہزادے نے دوبارہ انکی عزت بحال کر دی۔ عاصی نے نادر شاہ (م۔۱۹۳۳) کے دور میں بھی بلند مقام حاصل کیا اور "الفاروق"، "سیرت النبی" اور "سیرت عائشہ" کا فارسی ترجمہ کیا۔ ۱۹۳۸ء میں عاصی وطن واپس آگئے اور یہاں بھی تصنیف و ترجمہ کا کام جاری رکھا۔ آخر ۳ رمضان ۱۳۶۹ھ کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (۳۸)
۱۹ جون ۱۹۵۰ء

اِقبال اور نجف علی عاصی

مولوی نجف علی عاصی جلالپوری ' اِقبال سے دِلی لگاوٗ رکھتے تھے اور ان سے میل ملاقات بھی تھی (۳۹) مولانا فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی کتب شعر میں "تحفہ امانیہ" ' "موحد نادرہ" ' "ھدیہ تبریک عید قربان" وغیرہ شامل ہیں۔ اِن کی شاعری میں سوز اور مقصدیت نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ اِقبال کے اشعار تابدار کو "لولوی لالہ" کے نام سے موسوم کرکے ایک شعر میں یوں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں (۴۰)

نیستم اِقبال تا بیرون کشم از بحر طبع
لولوی لالہ بحسب شان شاہ ذی وقار

مولانا عاصی کا پہلا فارسی مجموعہ کلام "تحفہ امانیہ" کے نام سے ۱۹۲۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ عام سائز کے ۴۷ صفحات میں ۸۱۱ اشعار ہیں۔ مختلف عنوانات کے تحت اَپنے بیٹے کو دین و دُنیا کی کامیابی کیلئے نصیحتیں کی ہیں جو آج بھی کسی نوجوان مسلم کیلئے زِندگی کا لائحہ عمل بننے کے قابل ہیں۔ کتاب کے آخر میں دو تقریظیں ہیں۔ ایک مولانا اصغر علی روحی کی اور دوسری اِقبال کی۔ ص ۴۷ پر اِقبال کی مختصر تقریظ یوں ہے۔

"تقریظ از ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اِقبال ملک الشعراء مشرق"

"میں نے یہ نظمیں سرسری نظر سے دیکھی ہیں۔ مصنف کا جوش عقیدت قابل داد ہے۔"

"تحفہ امانیہ" میں کئی مقامات پر عاصی اور اِقبال کے خیالات میں ہم آہنگی نظر آتی ہے مثلاً ص ۴۳ پر "تدبیر و توکل" کے عنوان سے مولانا عاصی کہتے ہیں۔

گرہ ہر مشکل کہ پیش آید ترا کن بہ نوکِ ناخنِ تدبیر وا
با توکل باخدا تدبیر کن سعی کن پس تکیہ بر تقدیر کن

عاصی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد چراغ نے اقبال کی مرتب کردہ ایک نصابی کتاب "آئینۂ عجم" کی شرح لکھی جبکہ عاصی کے پوتے عبدالجلیل نجفی نے موجودہ دور میں ایک اور نصابی کتاب مبنی بر کلام اقبال کی شرح "تفہیمِ افکارِ اقبال" کے نام سے لکھی ہے۔

حافظ محمد حسن چیمہ

چودھری محمد حسن چیمہ گجرات کے نامور وکیل' دانشور اور جماعت احمدیہ (لاہوری گروپ) کے امیر تھے۔ علامہ سے رسم و راہ تھی۔

محمد حسن ۱۸۹۶ء کو کلاچور متصل جلالپور جٹاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پیر نیک عالم تھا جو پنجابی کے نامور شاعر تھے۔ ان کا آبائی گاؤں "موہلہ" متصل کٹھالہ تھا جہاں سے پیر نیک عالم ہجرت کر کے کلاچور آ گئے تھے۔

حافظ صاحب کی ابتدائی تعلیم جلالپور جٹاں میں ہوئی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ دوران تعلیم احمدیوں کی لاہوری جماعت سے متاثر ہو کر اس میں داخل ہو گئے اور نہایت سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ گجرات کچہری میں پریکٹس شروع کی اور جلد ہی اپنی خداداد صلاحیتوں اور متاثر کن شخصیت کی وجہ سے ان کا شمار نامور وکلاء میں ہونے لگا۔

حافظ صاحب بہت ذہین' حاضر جواب' بذلہ سنج اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ یادداشت بلا کی تھی۔ آیات قرآنی اور احادیث کا حوالہ فوراً دیتے۔ طبیعت باغ و بہار قسم کی تھی جہاں بیٹھتے محفل زعفرانِ زار بن جاتی۔ اردو' پنجابی اور فارسی پر عبور تھا۔ عربی بھی جانتے تھے۔ طویل عرصہ تک "نوائے وقت" میں "خیالاتِ پریشاں" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

لاہوری جماعت کے نہایت سرگرم رکن اور مبلغ تھے۔ تبلیغی دوروں پر بیرون ملک بھی جاتے رہے۔ ان کی بیگم زینب حسن ("عین جی") سماجی خدمت میں پیش پیش رہتی تھیں۔ گجرات میں خواتین کی فلاح و بہبود کیلئے انہوں نے بہت کام کیا۔

چیمہ صاحب نے ۱۹۷۱ء کے قریب وفات پائی اور قبرستان بھٹیاں (گجرات) میں دفن ہوئے (۴۱)

اقبال اور حافظ حسن محمد چیمہ

مارچ ۱۹۳۲ء میں حافظ محمد حسن کے چھوٹے بھائی محمد احسن نے علامہ کو ایک خط لکھا۔ جواب میں علامہ نے لکھا۔

"میں آپ کے بھائی صاحب سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ نہایت نیک نفس آدمی ہیں"۔ (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۳۰)

حافظ محمد حسن کی علامہ سے پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء کے آس پاس اُس وقت ہوئی جب وہ لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ اِس کے بعد جب حافظ صاحب نے گجرات میں پریکٹس شروع کی تو جلد ہی اِن کا شمار نامور وکلاء میں ہونے لگا۔ ۲۹۔۱۹۲۸ء کے لگ بھگ راجہ حسن اختر(۱۹۰۱۔ ۱۹۶۴ء) جو علامہ کے قریبی احباب میں سے تھے بطور مجسٹریٹ گجرات تعینات ہوئے۔ جلد ہی راجہ صاحب اور حافظ صاحب میں دوستانہ مراسم استوار ہو گئے۔ اور انہی کی وساطت سے حافظ صاحب کی علامہ سے دوسری اور باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ اِس کے بعد بھی کبھی کبھار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے اِستعفیٰ دینے کے بعد مئی ۱۹۳۵ء میں علامہ نے "Quadianis and Orthodox Muslims" کے عنوان سے ایک مفصل بیان دیا جو تمام اخبارات نے شائع کیا۔ قادیانیت سے متعلق ان کا یہ بیان بہت اہم تھا۔ چند روز بعد اُنھوں نے ایک اور بیان کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ پھر جنوری ۱۹۳۶ء میں "اِسلام اور احمدیت" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا (۴۲)۔ اِسی طرح علامہ کے دوستوں نے بھی قادیانیت کے خلاف بھرپور مضامین رقم کیے۔ انہی حملوں کے جواب میں حافظ محمد حسن چیمہ نے قادیانیت کے حق میں چند مضامین لکھ کر ہفت روزہ "لائٹ" میں چھپوائے۔ علامہ کی خدمت میں بھی یہ مضامین ارسال کیے گئے۔ چنانچہ علامہ نے راجہ حسن اختر کی معرفت حافظ محمد حسن کو بلایا اور انہیں بتایا کہ ان (علامہ) کے نقطہ نظر کا اطلاق کاملاً لاہوری گروپ پر نہیں ہوتا (جس سے حافظ صاحب تعلق رکھتے تھے) بلکہ دوسرے گروپ پر ہوتا ہے۔ اِس کے بعد کوئی ملاقات ہوئی یا نہیں، کچھ کہنا مشکل ہے (۴۳)

حافظ محمد عالم

حافظ محمد عالم ماہنامہ "عالمگیر" لاہور کے مدیر و مالک تھے وہ علامہ کے ملاقاتیوں میں شامل تھے اور ان کے زبردست مداح تھے۔

حافظ صاحب کا آبائی گاؤں "میانہ بھرگڑاں" ضلع گجرات تھا۔ حافظ صاحب نے ۱۹۲۱ء میں لاہور، سید مٹھا بازار سے "عالمگیر" جاری کیا۔ جلد ہی اِس کا شمار اعلیٰ درجے کے علمی و اَدبی رسائل میں ہونے لگا۔ کبھی کبھی اِقبال کا کلام بھی عالمگیر کے صفحات کی زینت بنتا تھا۔ عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں (۴۴)

"جنگ عظیم (اول) کے بعد "نیرنگ خیال" اور "عالمگیر" کا ایک عرصہ تک غلغلہ رہا۔ اِن دونوں رسائل میں ملک کے مشہور ادیب اپنی نگارشات بھیجتے تھے ان دونوں کے سالنامے اور عید نمبر اور دوسرے خاص نمبر بہت شاندار ہوتے تھے اور ان میں ملک بھر کے ادیبوں کی تازہ تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان میں تصاویر بھی ہوتی تھیں ۔ عام طور پر اُستاد اللہ بخش اور عبدالرحمن چغتائی کے شاہکار انہی رسالوں میں آتے تھے۔"

دسمبر ۱۹۲۷ء میں ماہنامہ "عالمگیر" کا خاص نمبر شائع ہوا جو بہت مقبول ہوا اِس خاص نمبر کے بارے میں علامہ اِقبال نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا جو جنوری ۱۹۲۸ء کے ماہنامہ "عالمگیر" کے صفحہ ۶ پر شائع ہوئی۔ (۴۵)

"رسالہ عالمگیر" کا خاص نمبر میں نے دیکھا ہے۔ بہت دِلچسپ ہے۔ تصاویر اور مضامین فراہم کرنے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ پنجاب کے اُردو رسالے اِس وقت بہت ترقی کر رہے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد!"

محمد اِقبال

حافظ محمد عالم نے ایک ہفت روزہ "خیام" بھی جاری کیا تھا جسے کچھ عرصہ انکے دوست شبلی بی کام (م۔۱۹۸۱) مرتب کرتے رہے۔ یہ بھی اَپنے دور کا نمایاں ہفت روزہ تھا۔ حافظ صاحب نے "عالمگیر سٹیم پریس" کے نام سے ایک پریس اور "عالمگیر بکڈپو" کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا تھا جس نے بہت سی مفید کتب شائع کی تھیں۔

حافظ صاحب نے ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء کو انتقال کیا۔ (۴۶)

پیر تاج الدین و رفیع پیر

گجرات سے تعلق رکھنے والے نامور بیرسٹر پیر تاج الدین بھی علامہ اِقبال کے احباب میں شامل تھے۔ وہ پیر قمرالدین کے صاحبزادے تھے۔ پیر قمرالدین (جنکے نام گجرات شہر میں "کوچہ پیر قمرالدین موجود ہے) گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے طالب علم اور ٹینس کے مشہور کھلاڑی تھے۔ انگریزی عہد میں مقتدر عہدوں پر فائز رہے۔ نہایت متقی اور خدا ترس انسان تھے۔ ان کے بزرگ اندیجان (روس) کے حاکم رہے تھے۔ ان کے جد امجد داؤد بلخی نے ہجرت کرکے زونی مڑھ (کشمیر) کو مسکن بنایا۔ دِن رات یادِ خدا میں مصروف رہتے۔ خواجہ کا خطاب پایا۔ اِس خاندان کے کچھ لوگ بعد میں گجرات میں آکر آباد ہوگئے (۴۷) پیر قمر الدین کے دو صاحبزادے تھے۔ پیر غیاث الدین اور پیر تاج الدین۔ پیر غیاث الدین اعلیٰ تعلیم کے بعد سول سروس میں بلند عہدوں پر فائز رہے۔ پیر تاج الدین ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے (۴۸) گورنمنٹ کالج سے گریجوایشن کے بعد لندن سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۱۱ء میں لاہور میں پریکٹس شروع کی (۴۹) جلد ہی ان کا شمار اچھے وکلا میں ہونے لگا۔ آپ پنجاب مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے پروگریسو گروپ کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں نئے گروپ کے نائب صدر چنے گئے اور بعد ازاں بھی مختلف عہدوں پر فائز رہ کر سیاست میں سرگرم رہے۔ پروگریسو گروپ کے دیگر ارکان میں علامہ اِقبال، میاں فضل حسین، ملک برکت علی (۱۸۸۵ء۔۱۹۴۶ء)، غلام بھیک نیرنگ اور خلیفہ شجاع الدین شامل تھے۔ ۱۹۲۳ء کے کمیونل مسئلے پر بھی پیر تاج الدین نے مسلم لیگ کی طرف سے فعال کردار ادا کیا۔ سیاسی صورت حال پر اخبارات میں بھی اظہارِ خیال کرتے تھے (۵۰) آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ایک "سینٹرل پارلیمنٹری بورڈ" اور صوبوں میں "پراونشل بورڈ" تشکیل دیے۔ پنجاب پارلیمنٹری بورڈ علامہ اقبال کی صدارت میں قائم کیا گیا اس میں بھی پیر تاج الدین شامل تھے (۵۱)۔ یوں پیر صاحب علامہ اِقبال کے ساتھی اور تحریکِ آزادی کے سرگرم رکن تھے۔ ۶ دسمبر ۱۹۵۴ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے (۵۲)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں۔

"پیر تاج الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ نہایت بے باک طبیعت پائی تھی۔ جو جی میں آتا تھا کہہ ڈالتے تھے۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ منہ پھٹ تھے اور اصحابِ اقتدار کو تو کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ سنا ہے حضرت علامہ

اِقبال کا احترام تو بہت کرتے تھے ان کے نیاز مند بھی تھے لیکن ان کی موجودگی میں بھی اپنی بے باک طبیعت پر قابو نہ پا سکتے تھے۔"(۵۳)

مرزا جلال الدین اور اقبال ایک مقدمے میں وکیل کی حیثیت سے نواب ذوالفقار علی خان کی دعوت پر پٹیالہ گئے۔ واپسی پر امرتسر ٹھہرتے ہوئے لاہور پہنچے۔ پیر تاج الدین اس زمانے میں امرتسر میں محکمہ بندوبست میں نائب تحصیلدار تھے۔ مرزا صاحب اور اقبال ان سے بھی ملے (۵۴)۔

خواجہ عبدالوحید علامہ اقبال سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے ۴ جولائی ۱۹۳۵ء کی ملاقات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"کل رات علامہ اقبال کے ہاں گیا تو وہاں پیر تاج الدین صاحب مع اپنے دو ساتھیوں کے بیٹھے تھے"(۵۵)

پیر تاج الدین کے صاحبزادے رفیع پیر بھی اِقبال کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ رفیع پیر ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجوایشن کی۔ جرمنی میں ایک عرصہ گزارا۔ ہندوستان میں ڈرامے کی دُنیا میں چند بلند ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۱۱ اپریل ۱۹۸۱ء کو لاہور میں وفات پائی (۵۶) آپنے والد کے ہمراہ اِقبال کے حضور حاضر ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ جب وہ سکول کے طالب علم تھے تو اِقبال سے پوچھنے لگے۔

"علامہ صاحب! شاعر اور پیغمبر میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

علامہ ان کے والد سے کہنے لگے "تاج الدین تمہارا بیٹا عجیب سوال کرتا ہے۔ کہتا ہے شاعری بھی تو اللہ کی طرف سے ایک وجدانی نعمت ہے پھر شاعر اور پیغمبر میں کیا فرق ہوا"(۵۷)

نذیر احمد بھٹی

نذیر احمد بھٹی، علامہ اقبال کے ہم زلف تھے۔ وہ خان بہادر ڈاکٹر شیخ عطا محمد کی سب سے چھوٹی صاحبزادی شہزادہ بیگم کے پہلے خاوند تھے۔ان کے والد کا نام حافظ فضل احمد (۱۸۷۰ء۔۱۹۴۰ء) تھا جو آرمی میں سپلائی آفیسر تھے۔ حافظ صاحب گجرات کے رئیسِ اعظم اور بہت بڑے زمیندار تھے۔ تحریک خلافت میں ضلع گجرات کے صدر رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے قریبی دوست اور علاقے کے نمایاں سیاستدان تھے۔ گجرات میں محلہ دارا بلوچاں میں رہائش تھی اور بھٹی کشمیری برادری سے تعلق تھا۔

نذیر احمد بھٹی ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد بسلسلہ ملازمت قیام پذیر تھے۔ میٹرک مشن سیالکوٹ سے کیا جہاں ان کے ننھیال تھے۔ ۱۹۱۸ء کے قریب اسلامیہ کالج لاہور سے گریجوایشن کی جس کے بعد ان کی شادی شہزادہ بیگم سے ہو گئی۔ اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء کے قریب وہ سکاٹ لینڈ سے سول انجینئرنگ میں اعلیٰ تعلیم کے بعد وطن لوٹے۔ سات سال کی دوری اور کچھ گریلو معاملات کی وجہ سے شہزادہ بیگم نے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کر لی۔ نذیر احمد پی ڈبلیو ڈی اور محکمہ زراعت میں ملازمت کے بعد ۱۹۵۵ء کے قریب ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد پشاور میونسپلٹی میں اگزیکٹو انجینئر اور پشاور یونیورسٹی کی تعمیر میں چیف انجینئر رہے۔ کچھ عرصہ گجرات میونسپلٹی کے بھی چیف انجینئر رہے۔ ۴ فروری ۱۹۸۳ء کو پشاور میں فوت ہوئے اور وہیں آخری آرام گاہ بنی۔

علامہ اقبال سے راہ و رسم اور خط و کتابت تھی۔ نذیر احمد جب تعلیم کے لئے بیرون ملک جا رہے تھے تو علامہ اقبال نے انہیں وہاں اپنے دو دوست پروفیسرز کے نام تعارفی خطوط لکھ کر دئے تھے۔ خود نذیر احمد کے نام بھی علامہ کے خطوط موجود ہیں۔ ان کے صاحبزادے جناب فیاض بھٹی نے راقم کو بتایا کے ایک دفعہ بہاولپور سے واپسی پر ہم دونوں باپ بیٹا علامہ صاحب کی میو روڈ والی کوٹھی پر حاضر ہوئے اس وقت علامہ صاحب شام کی نماز پڑھتے ہوئے زار و قطار رو رہے تھے۔ ہم نے وہ رات وہیں قیام کیا۔(۵۸)

حوالہ جات و حواشی

(۱) مندرجہ ذیل ذرائع سے استفادہ کیا گیا ہے۔
(الف) ماہنامہ "قانونگو" لاہور بابت دسمبر ۱۹۲۶ء
(ب) ماہنامہ 'ابلاغ' امرتسر۔ بابت دسمبر ۱۹۳۹ء
(ج) "جمع القرآن" شیخ عطاء اللہ وکیل۔ طلوع اسلام لاہور س ن دیباچہ از علامہ عرشی امرتسری
(۲) شیخ عطاء اللہ پروفیسر علی گڑھ کے حالات کے ذرائع درج ذیل ہیں۔
(الف) مکتوب مختار مسعود فرزند ارجمند شیخ عطاء اللہ بنام راقم محررہ ۲۰ جنوری ۹۵ء و ۳ فروری ۹۸ ع
(ب) شیخ عطاء اللہ کے چھوٹے بھائی شیخ محمد اقبال سے راقم کی ملاقات' جلالپور جٹاں ۲۳ دسمبر ۱۹۹۴ء
(ج) خفتگان خاک لاہور از پروفیسر محمد اسلم لاہور ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۰۶
(۳) مکتوب مختار مسعود صاحب بنام راقم محررہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء
(۴) ایضاً
(۵) اقبالیات کے تین سال (۱۹۸۷ء۔ ۱۹۸۹ء) ڈاکٹر رفیع الدین ھاشمی' لاہور ۹۳ء صفحہ ۴۳
(۶) یہ کتاب "The Cooperative Movement in the Punjab" ہے یہ ۱۹۳۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ تعارف کیمبرج کے پروفیسر سی آر فے نے لکھا۔
(۷) ماہنامہ "شاعر" بمبئی اقبال نمبر ۱۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۴۴۳
(۸) یہ حالات "تاریخ اقوام کشمیر" از منشی محمد الدین فوق صفحہ ۳۰۴ تا ۳۰۷ سے اخذ کیے گئے ہیں۔
(۹) مکتوبات ضیاء الدین ملک (پوتا ملک کرم الدین) بنام راقم محررہ ۱۵ '۲۲ جولائی ۱۹۹۴ء
(۱۰) خان بہادر شیخ عبدالعزیز کے یہ حالات درج ذیل ذرائع سے حاصل ہوئے
(الف) کتبہ قبر (جو ۱۹۹۴ء تک موجود تھا۔ اب ٹوٹ کر معدوم ہو چکا ہے)۔
(ب) اقبال اور انجمن حمایت اسلام' محمد حنیف شاہد لاہور ۱۹۷۷ء
(ج) روایات اقبال مرتبہ عبداللہ چغتائی لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۳۸
(د) گزیٹیر ضلع گجرات ۱۹۲۱ء
(۱۱) اقبال اور انجمن حمایت اسلام صفحہ ۵۴
(۱۲) مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان' بزم اقبال لاہور ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۴
(۱۳) اقبال اور انجمن حمایت اسلام صفحہ ۵۵
(۱۴) انوار اقبال صفحہ ۸۹
(۱۵) اقبال اور انجمن حمایت اسلام صفحہ ۱۱۷
(۱۶) ایضاً صفحہ ۱۸۲
(۱۷) ایضاً صفحہ ۱۴۲

(۱۸) ملک صاحب کے متعلق یہ چند باتیں حافظ نلور (حاجیوالہ)، ملک اسلم (حاجیوالہ)اور شیخ سعید صاحب (ریلوے روڈ گجرات) سے معلوم ہوئیں
(۱۹) شیخ سعید صاحب (ریلوے روڈ گجرات) سے راقم کی ملاقات
(۲۰) IQBAL - AS I KNEW HIM - Iqbal Academy LHR 1988 - Page 14
انگریزی عبارت کا ترجمہ از مولف کتاب ھذا
(۲۱) یہ حالات سید سجاد حیدر بخاری کے صاحبزادے جناب سید پرویز سجاد بخاری نے فراہم کیے
(۲۲) ہفت روزہ "صادق" - اقبال نمبر - ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۷
(۲۳) "کلیات اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴
(۲۴) مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی لاہور ص ۱۹۴
(۲۵) کلیات اقبال ص ۱۰۱
(۲۶) اقبالنامہ جلد ۲ ص ۹۹
(۲۷) خطوط اقبال - مرتبہ رفیع الدین ہاشمی - مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۷۶ ص ۹۵
(۲۸) ڈاکٹر مظفر حسن ملک نے اپنے مضمون "اقبال اور گجرات" میں ملک محمد الدین کا وطن "برنالہ" آزاد کشمیر لکھا ہے جو درست نہیں کیونکہ ملک محمد الدین نے خود اپنی کتاب "ذکر حبیب" کے ص ۳۰۴ پر "آپ بیتی" کے عنوان سے جو کچھ رقم کیا ہے اس میں اپنا وطن "سہوٹہ کلاں" لکھا ہے
(۲۹) "ذکر حبیب" از ملک محمد الدین - القمر یک کارپوریشن لاہور ۱۴۰۴ھ ص ۵۲
(۳۰) مکتوب خواجہ عبدالروف مہتہ بنام راقم محررہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۴ء
(۳۱) اقبال بنام منشی محمد الدین فوق مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء
(۳۲) ذکر حبیب ص ۱۰
(۳۳) مضمون "علامہ اقبال کی عقیدت صوفیائے عظام سے" از سید نور محمد قادری مطبوعہ "اقبال ریویو" (اقبال نمبر) - بابت جنوری ۱۹۸۴ء ص ۴۲، ۴۳
(۳۴) مظلوم اقبال از اعجاز احمد کراچی ۱۹۸۵ ص ۶۷
(۳۵) مضمون "اقبال اور گجرات" از ڈاکٹر مظفر حسن ملک اقبالیات جنوری مارچ ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۲۵
(۳۶) سرگزشت از عبدالمجید سالک - قومی کتب خانہ لاہور بار اول ۱۹۵۵ ص ۱۰۳
(۳۷) مظلوم اقبال ص ۶۷
(۳۸) "احوال و آثار مولوی نجف علی عاصی" مرتبہ عبدالجلیل نجفی لاہور ۱۹۸۷ء
(۳۹) "معاصرین اقبال کی نظر میں" مرتبہ عبداللہ قریشی - انجمن ترقی ادب' لاہور' ۱۹۷۷ء ص ۴۷۴
(۴۰) احوال و آثار مولوی نجف علی عاصی مرتبہ عبدالجلیل نجفی' لاہور ۱۹۸۷ء ص ۸۵
(۴۱) حافظ محمد حسن چیمہ کے حالات چوہدری فتح محمد عزیز صاحب سے ایک ملاقات میں معلوم ہوئے۔ عزیز صاحب' حافظ صاحب کے دوست' رفیق کار اور ہم مسلک ہیں۔

(۴۲) خطوطِ اِقبال۔ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۶۔۲۵۵
(۴۳) یہ معلومات چوہدری فتح محمد عزیز اور چوہدری سردار خان ایڈووکیٹ سے حاصل ہوئیں
(۴۴) "نقوش" لاہور نمبر ۲ فروری۔ ۱۹۶۲ء ص ۸۵۷
(۴۵) "اوراقِ گم گشتہ" مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۱۰۶
(۴۶) وفیاتِ مشاہیر پاکستان مرتبہ پروفیسر محمد اسلم صفحہ ۲۵۱
(۴۷) قبر جنہاں دی جیوے آز احمد سلیم: دوست پبلیکیشنز اِسلام آباد ۱۹۹۶ء صفحہ ۵۴
(۴۸) وفیاتِ مشاہیر پاکستان صفحہ ۴۹
(۴۹) قبر جنہاں دی جیوے صفحہ ۵۵
(۵۰) (الف) "ملک برکت علی" آز محمد رفیق افضل۔ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان' لاہور ۱۹۶۹ء صفحہ ۵
(ب) اے بک آف ریڈنگز آن ہسٹری آف پنجاب (انگریزی) آز اکرام علی ملک ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور' ۱۹۸۵ء' صفحہ ۳۰۴' ۵۲۵/۵۵
(۵۱) گفتار اقبال۔ مرتبہ محمد رفیق افضل صفحہ ۲۰۶
(۵۲) وفیات مشاہیر پاکستان صفحہ ۴۹
(۵۳) وے صورتیں الٰہی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ لاہور صفحہ ۱۴۱
(۵۴) روایات اقبال صفحہ ۱۱۵
(۵۵) اوراق گم گشتہ صفحہ ۳۰۴
(۵۶) وفیات مشاہیر پاکستان صفحہ ۸۷
(۵۷) قبر جنہاں دی جیوے صفحہ ۵۴
(۵۸) معلومات از فیاض بھٹی (ابن نذیر احمد بھٹی)

حصہ چہارم: اِقبال سے ملاقات کرنے والے

- میاں محمد بوٹا گجراتی
- اُستاد امام دین گجراتی
- فیروز الدین نگین گجراتی
- مولوی عبدالکریم قریشی
- سر فضل علی
- شیخ عتیق اللہ
- پیر نیک عالم
- جنرل محمد افضل فاروقی
- چوہدری سردار خاں
- ڈاکٹر شیخ محمد عالم
- ڈاکٹر ایم۔ اے غنی
- سید امداد حسین شاہ
- عاشق۔ خادم اِقبال
- دائم اقبال دائم
- سید نور اللہ شاہ
- سید امجد علی شاہ

میاں محمد بوٹا گجراتی

میاں محمد بوٹا پنجابی کے عظیم شاعروں میں سے ایک ہے اور آج بھی وہ اپنے شعروں کی بدولت زندہ ہے۔

میاں محمد بوٹا کے بزرگوں کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ۱۸۴۸ء کے قریب کٹڑہ شالبافاں (گجرات شہر) میں پیدا ہوئے۔ اسی محلہ میں اقبال کے خسر رہتے تھے میاں محمد بوٹا' اقبال کی شادی کے دور میں کمیٹی کے ممبر تھے۔ اقبال کے نکاح میں محمد بوٹا دلہن والوں کی طرف سے گواہ تھے۔ شادی کے بعد جب اقبال سسرال آتے تو محمد بوٹا سے ملاقات ہوتی تھی۔ اس دور میں محمد بوٹا کی شاعری بہت مقبول تھی۔

محمد بوٹا کا زمانہ پنجابی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ چنانچہ محمد بوٹا کی موزوں طبیعت نے بھی جوش مارا اور ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۸ء تک محمد بوٹا نے پنجابی زبان کو دو درجن سے زائد خوبصورت کتب عطا کیں۔ محمد بوٹا کی کتابوں میں "پنج گنج" (سی حرفیاں) اور "مرزا صاحباں" کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔

میاں محمد بوٹا شاعری میں ناموری کے علاوہ معتبر سماجی حیثیت کے بھی مالک تھے وہ ۲۷ سال تک بلامقابلہ گجرات میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے۔ (۱) محمد بوٹا نے ۱۶ ستمبر ۱۹۱۹ء کو وفات پائی۔ اور قبرستان بھٹیاں کے شمال مشرقی کونے میں آسودہ خاک ہوئے (۲)

استاد امام دین گجراتی

اقبال کی ہمسری کا دعوی کرنے والا استاد امام دین پاکستان کے عوامی حلقوں میں گجرات کا سب سے مشہور شخص ہے۔

ہزل گوئی کا بادشاہ' امام دین ۱۸۷۰ء کے قریب گجرات شہر میں میر حسن دین کے گھر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد استاد نے میونسپل کمیٹی میں ملازمت کرلی اور ۲۸ سال چونگی محرر رہا۔ استاد نے ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ پنجابی چو مصرے سے شاعری کی ابتداء کی۔ بعد میں دوستوں کے کہنے پر اردو شاعری شروع کی اور عوامی حلقوں میں بہت شہرت پائی۔ استاد کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ "بانگ دھل" ' "بانگ رحیل" اپنے مخصوص عروض پر "شاعری کا پرنسپل" بھی لکھی۔ استاد امام دین نے ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء میں وفات پائی (۳)۔ بانگ درا" کی شہرت دیکھ کر استاد نے ارادہ ظاہر کیا تھا (۴)

اگر مل گئی مجھ کو اُستاد فرحت
تو ہمسر نکالوں گا بانگ درا کا

"بانگِ دھل" پہلی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ۔ اُستاد اِسے "بانگِ درا" کے برابر (بلکہ دو ہاتھ آگے) کی کتاب سمجھتا تھا۔ اُستاد نے 'بانگ درا' کے مقابلہ میں اپنی کتاب کا نام 'بانگِ دھل' رکھا۔ (۵)

اِسی کتاب کے حوالے سے اُستاد خود کو اِقبال کا ہمسر گردانتا تھا۔ (۶)

اُستاد بھی غالب و اِقبال سے کمتر تو نہیں
اگر اُدھر "بانگِ درا" ہے تو اِدھر "بانگِ دھل" ہے

اور یہی بات منوانے کیلئے اُستاد امام دین' اِقبال کے پاس لاہور گئے تعارف کے بعد جب اُستاد نے "بانگِ دھل" پیش کی اور ساتھ اپنا دعویٰ دہرایا تو علامہ نے اُستاد کے دعوے کو تسلیم کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور ساتھ "دس روپے" بطور انعام عطا کیے۔ اِسی ملاقات کے متعلق اُستاد نے آپنے مخصوص "اُستادانہ" انداز میں لکھا (۷)۔

انہی سوجھتی کو میں نے زیارت کا شرف حاصل کیا تھا
بس دیکھنے میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ ہیں رستم و زال
کسی شخص نے امام اعظم اور کہ حنبل کا مسئلہ چھیڑا ہوا تھا
لیکن آپ جواب بھی دے رہے تھے اور حقہ پیتے تھے نال نال
جس طرح اُستاد غالب نے رنگ مجاز کو ختم کیا ہے
اِس طرح ختم کر دیا ہے قومی رنگ کو اِقبال

اُستاد نے ایک عمر لوگوں کو محظوظ کیا اور "عالمگیر شہرت" پائی مگر اس کے باوصف استاد کو یہ بھی اعتراف تھا کہ (۸)

اِن کے فیض سخن سے عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہوں
لیکن یہ ہم نے مانا کہ ہم حالی ' غالب و اِقبالات نہیں

اِقبال کی وفات پر اُستاد نے آپنے منفرد رنگ میں مرثیہ لکھا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد علامہ کے جنازہ میں شریک تھے اور اُنھوں نے ان کا آخری دیدار بھی کیا تھا (۹)

اُنی سو اٹھتی کو کیا دیکھتے ہیں — مرگِ اِقبال" موت و قضا دیکھتے ہیں
ہے افسوس جاتا ہے سوئے عدم کو — آج ملت کا ہم ناخدا دیکھتے ہیں
الیف اے بی اے ایم اے تھے ہمراہ جنازہ — بر دوش میت اٹھا دیکھتے ہیں

سوا لاکھ آدم ہجومِ خلق تھا سبھی پڑھتے صلی علی دیکھتے ہیں
فقط ایک ہستی جلیلُ القدر تھا جو دُنیا سے اب چل بسا دیکھتے ہیں
زیارت کیا جب لباسِ کفن میں تو زِندگی سے جلوہ سوا دیکھتے ہیں
آسمانِ آدب کا وہ درخشاں ستارہ جاتا بقا سے فنا دیکھتے ہیں
لاکھوں ملیں گے پر اِقبال جیسا ملے گا نہ ہم پیشوا دیکھتے ہیں
تھی رعب و جلالت تیرے ہم قدم سے اب تو بزمِ سخن بے مزا دیکھتے ہیں

اِقبال کی فکری تقلید بھی اُستاد نے اپنی ذہنی پرواز کے مطابق کی ہے۔ "جاوید کے نام" کی طرز پر اُستاد نے اَپنے بھتیجے "یادگار" کیلئے (کیونکہ اُن کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا) یہ نظم بعنوان "یادگار کے نام" لکھی تھی (۱۰)

اَپنے خیالات کی دُنیا میں بلندی کے جذبات پیدا کر
نئی روشنی کے زمانے میں نئے نئے نظریات پیدا کر

فیروزالدین نگین گجراتی

نامور پنجابی شاعر، سائیں نگین گجراتی علامہ کے سسرالی خاندان کے قریبی رشتہ دار تھے (علامہ کی بیوی کریم بی بی اور نگین کی والدہ خالہ زاد بہنیں تھیں) اور انکے ہمسائے میں رہتے تھے علامہ اور نگین تقریباً ہم عمر تھے۔ علامہ جب سسرال آتے تو نگین سے ملاقات ہوتی۔ (نگین صاحب ان ملاقاتوں کی یادیں اپنے دوستوں سے بیان کرتے رہے ہیں)

فیروز الدین ۱۸۷۹ء میں کٹڑہ شالبافاں میں نیربٹ کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ محمد بوٹا کی شاعری سے متاثر ہو کر فیروزالدین نے بھی شاعری شروع کر دی اور نگین تخلص اختیار کیا۔ کچھ عرصہ والد کے ساتھ کاروبار میں حصہ لیا اور حکام کے ساتھ بھی میل ملاپ رکھا۔ اُنہوں نے "دیہات سدھار تحریک" میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ ضلعی کرسی نشین تھے اور انگریز سرکار سے وظیفہ پاتے تھے۔

آخر دُنیا داری چھوڑ کر نگین نے خود کو درویشی کی "بکل" میں چھپا لیا اور سخن گوئی کے چراغ سے اَپنے من کے آنگن کو روشن کر لیا۔ سائیں فیروز کی "سوہنی" پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ انکے رسا ذہن اور مہارتِ فن کا ثبوت ہے۔
نگین نے ۲۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو انتقال کیا (۱۱)
سائیں فیروز کے دوست شریف کنجاہی بیان کرتے ہیں۔

"سائیں فیروز' اقبال کے سسرال والوں کے ہمسائے بھی تھے اور رشتہ دار بھی وہ دونوں فریقین کے اختلافات اور اعتراضات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ اقبال کی سسرال میں مصروفیات اور درون خانہ حالات پر بھی تبصرہ کیا کرتے تھے۔ وہ گھر کے بھیدی تھے اور ان سے کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا" (۱۲)

مولوی عبدالکریم قریشی

مولوی محمد عبدالکریم قریشی قلعدار (گجرات) کے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں قلعدار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد کے قائم کردہ "مدرسہ محمدیہ" سے حاصل کی' پھر مولانا سید احمد ناظم' سے شادیوال میں اور مولانا کلیم اللہ سے بھیانہ میں اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۷ء تک اورنٹیل کالج میں زیر تعلیم رہے اور منشی فاضل مولوی فاضل اور مولوی عالم کی سندات حاصل کیں۔ شعبۂ تعلیم میں زِندگی بسر کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم اور پنڈ دادن خان میں عربی مدرس کی حیثیت سے طویل عرصہ تک خدمات سرانجام دیں۔ عالمِ دین اور پنجابی کے شاعر تھے۔ کئی کتب و رسائل تصنیف کیے۔ ۱۹۵۷ء میں فوت ہوئے۔ (۱۳)

اِقبال جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے تو آپنے خالی پیریڈ میں اورنٹیل کالج کی مولوی فاضل کی کلاس میں مولوی محمد عبد اللہ ٹونکی سے حماسہ کا درس لیتے۔ اِس کلاس میں مولوی عبد الکریم اور پیر جماعت علی شاہ بھی انکے ساتھ ہوتے (جو اِس کلاس کے باقاعدہ طالبعلم تھے) اِس تھوڑی سی ہم درسی کے سبب کچھ مراسم پیدا ہوگئے۔ اِسی بناء پر ۱۹۱۳ء میں جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو قریشی صاحب نے یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا۔ (۱۴)

اے شیخِ زماں ' محمد اِقبال تو یاورت بہرحال
باشی بحفاظتِ خدا خداوند بااہل و عیال و جملہ اطفال

سر فضل علی

"سرسیدِ گجرات" سر فضل علی' بانی زمیندار کالج گجرات بھی اِقبال کے ملاقاتیوں میں شامل تھے۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو فوت ہوئے۔ (۱۵)

۱۹۲۶ء کی پنجاب اِسمبلی کے اراکین میں علامہ اِقبال اور چودھری فضل علی دونوں شامل تھے اور یہیں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ گو نظریاتی طور پر دونوں مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خان بہادر نواب فضل علی (وہ اِس وقت 'خان بہادر' کا خطاب رکھتے تھے۔ سر

کا خطاب ۱۹۴۲ء میں ملا) یونینسٹ تھے جبکہ اقبال مسلم لیگ کے ممبر تھے

شیخ عتیق اللہ

شیخ عتیق اللہ ' علامہ کے بزرگ دوست شیخ عطاء اللہ وکیل کے صاحبزادے تھے لاہور میں غالباً بسلسلہ کاروبار رہائش پذیر تھے جب علامہ سے ملاقاتوں اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع میسر آتے رہے۔ اقبال اپنے مکتوب بنام شیخ عطاء اللہ محررہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں: (۱۶)

"آپ کی تصنیف "شہادت الفرقان علیٰ جمع القرآن" کئی روز ہوتے مجھے شیخ عتیق اللہ صاحب سے ملی تھی"

۶ جنوری ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں: "(۱۷) "عزیز عتیق اللہ تقریباً ہر روز ملتا ہے"

پیر نیک عالم

پنجابی کے نامور شاعر پیر نیک عالم ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ گجرات کے گاؤں موہلہ میں فیض احمد چیمہ کے گھر پیدا ہوئے۔ زندگی سکول ٹیچر کے طور پر گزری پنجابی میں کئی شعری تصانیف تخلیق کیں جن میں سے "اصغر صغریٰ" ہیر وارث شاہ کے جواب میں لکھی۔ ۱۹۴۳ء میں فوت ہوئے اور کلاچور (گجرات) میں آخری آرام گاہ بنی۔ پیر نیک عالم بھی اقبال سے ملاقات کا شرف رکھتے تھے۔ اپنی کتاب "پوہ پھٹی" میں لکھتے ہیں۔ (۱۸)

ھاں - سر اقبال بلا کے تھے   پوہ پھٹی کل سنا کے تے
کہو' دس پر حلف اٹھا کے تے   ایہ شعر یا سحر سرائی اے

جنرل محمد افضل فاروقی

محمد افضل فاروقی ' فیروز الدین فاروقی کے ہاں گجرات میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے بعد آنکھ کے امراض میں مہارت حاصل کی اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ علامہ اقبال کے برادر نسبتی ڈاکٹر غلام محمد کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ انہی کی وساطت سے علامہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جنرل فاروقی علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کو فوت ہوئے اور گجرات میں دفن ہوئے (۱۹)

چودھری سردار خاں

گجرات کے مشہور سیاستدان ' وکیل اور تحریک پاکستان کے کارکن جناب حکیم سردار خان اَپنے زمانہ طالب علمی میں اِقبال سے دو دفعہ ملاقات کا شرف رکھتے ہیں۔

چودھری سردار ۱۹۱۲ء میں چکوڑی بھیلووال (گجرات) میں پیدا ہوئے ۱۹۳۰ء میں زمیندار سکول سے میٹرک کیا۔ رسول انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے مگر ہندو مسلم فساد کی وجہ سے ڈپلومہ حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۳۷ء میں طبیہ کالج دھلی سے سند پانے کے بعد گجرات میں طبابت شروع کی ۔ ۱۹۴۳ء میں جب گجرات میں چودھری فضل الٰہی کی صدارت میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو حکیم صاحب اِس کے پہلے جنرل سیکرٹری بنے۔ مسلم لیگ کو منظم کرنے اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں شاندار خدمات سرانجام دیں ۔ مسلم لیگ کا ترجمان اخبار "حقیقت" انہی کی ادارت میں ۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۶ء شائع ہوتا رہا۔

چودھری صاحب نے ۱۹۵۳ء میں ایل ایل بی کیا اور پہلے گجرات اور پھر لاہور میں پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں چودھری فضل الٰہی (۱۹۰۴ء - ۱۹۸۲ء) کے صدر بننے کے بعد ان کی نشست پر کامیاب ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں بھی ایم این اے کا الیکشن جیتا۔

۱۹۳۲ء میں جب چودھری سردار خان رسول انجینئرنگ کالج کے طالب علم تھے۔ اُنہوں نے کچھ اور لڑکوں سے مل کر پرنسپل کے مسلم مخالف رویے کے خلاف اِقبال کی حمایت حاصل کرنے اور طلباء کے مسائل کے حل کے سلسلے میں دو دفعہ علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی۔ علامہ نے متعلقہ وزیر سے کہ کر ان کے مسائل حل کروا دیے تھے (۲۰)

ڈاکٹر شیخ محمد عالم

گجرات کی فاروقی فیملی کے مشہور سیاستدان ' ڈاکٹر شیخ محمد عالم بیرسٹرایٹ لا' پی ایچ ڈی بھی اِقبال کے ملاقاتیوں میں شامل تھے۔ لیکن ان کی طبیعت اور نظریات کے باعث اِقبال سے ان کے تعلقات اِستوار نہ ہو سکے۔

۱۹۲۶ء میں اِقبال جس سیشن میں پنجاب اِسمبلی رکن بنے تھے ' ڈاکٹر عالم بھی اِس اِسمبلی کے رکن تھے۔ یہیں ملاقات ہوتی تھی لیکن دونوں نظریاتی طور پر ایک دوسرے کے مخالف گروپوں میں شامل تھے۔ جنوری ۳۸ء میں جب جواہر لعل نہرو نے اِقبال سے لاہور میں انکے گھر ملاقات کی تو وہ ڈاکٹر عالم کے ایک مقدمے میں بطور گواہ عدالت میں پیش ہونے کیلئے لاہور آتے تھے۔ (۲۱)

ڈاکٹر ایم اے غنی

ڈاکٹر ایم اے غنی نامور ماہر تعلیم اور فزیشن تھے۔ افغانستان کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ جس کی "پاداش" میں وہ برسہا برس زندان ارک میں اپنے بھائیوں نجف علی عاصی اور مولوی محمد چراغ کے ساتھ قید رہے۔ ڈاکٹر ایم اے غنی ماسٹر عبدالصمد کے ہاں ۱۸۶۴ء میں جلالپور جٹاں میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور لندن سے ایل آر سی پی اور ایم آر سی پی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۸۹۲ء میں امیر عبدالرحمٰن کے پرائیویٹ سکریٹری اور ذاتی معالج مقرر ہوئے۔ بھرپور رے افغانستان کو جدید تعلیم سے روشناس کرایا۔ ایک سازش کا شکار ہو کر مارچ ۱۹۱۹ء تک قید رہے۔ ۱۹۴۳ء میں ہندوستان میں فوت ہوئے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء سے ۱۰ ستمبر ۱۹۰۶ء تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ اس دوران وہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے اجلاسوں میں بھی فعال رہے۔ اور اسی دوران اقبال سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مثلاً ۲۶ فروری ۱۹۰۵ء کو انجمن کی جنرل کونسل کا اجلاس ڈاکٹر ایم اے غنی کی صدارت میں ہوا۔ اقبال نے بھی شرکت فرمائی۔ (۲۲)

سید امداد حسین شاہ

مولانا سید امداد حسین شاہ صاحب، سید فرزند علی شاہ کے گھر ۱۶ اگست ۱۹۱۳ء کو موضع سیدھڑی تحصیل گجرات میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد دینی تعلیم کی طرف آئے اور علم دین میں بلند مقام حاصل کیا۔

شاہ صاحب کو ۱۹۳۴ء میں علامہ اِقبال سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا (۲۳)

عاشق۔ خادم اِقبال

عاشق گجرات کا رہنے والا تھا چند روز علامہ کے ہاں ملازم رہا اسکے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ خواجہ فیروز الدین بیرسٹر، جو علامہ کے ہم زلف تھے، بیان کرتے ہیں۔ (۲۴)

"ڈاکٹر صاحب نے ایک ملازم گھر کے کام کاج کیلئے رکھا تھا اس کا نام عاشق تھا اور گجرات کا رہنے والا تھا۔ دو دن کام کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! میں یہاں نہیں رہنا چاہتا" پوچھا "بھائی کیا بات ہے؟" اُس نے کہا "یہاں کی ہر چیز نرالی ہے۔ دھوبی ہی کو لے لیجئے، آٹا کپڑا دو جب لے لیتا ہے دو پیسے دو جب لے لیتا ہے، کچھ نہ دو جب لے لیتا ہے"

ڈاکٹر صاحب یہ سن کر بہت ہنسے اور خصوصاً آخری فقرے کی بہت تعریف کی۔

دائم اقبال دائم

ماضی قریب میں گجرات نے جو پنجابی شعراء پیدا کیے' دائم اقبال دائم بلاشبہ ان میں سب سے معتبر نام ہے۔ دائم نے اپریل ۱۹۰۹ء میں واسو میں جنم لیا اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وفات پائی۔ دائم نے پنجابی نظم میں ایک سو کے قریب کتب تصنیف کیں۔ جن میں "شاہنامہ کربلا" جیسی مقبول عام کتاب بھی شامل ہے۔ دائم بھی اقبال کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ حاجی بشیر حسین طاہر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ (۲۵)

"دائم اقبال دائم کو علامہ اقبال" سے بہت عقیدت تھی۔ کئی دفعہ اقبال" سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک دفعہ دائم نے علامہ اقبال کو اپنی کتاب سوہنی مہینوال پیش کی جو انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ کچھ راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ جامی" رومی" اور تصوف زیر بحث آئے۔ دائم اقبال دائم نے اردو' فارسی اور پنجابی میں بہت سا کلام لکھا۔ ان کا انداز اقبال سے کتنا ملتا ہے صرف ایک رباعی دیکھیے۔ (۲۶)

یوں قدسیوں سے آج ہے جبریل ہمکلام
نقشِ جمیل خامۂ فکرِ لطیف ہے
بچ بچ کے رہنا شاعرِ فطرت نگار سے
خاکی بلا کا محرمِ رازِ لطیف ہے

سید نور اللہ شاہ

سید نور اللہ شاہ ابن سید اکبر علی شاہ. خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد کے قریبی دوست تھے۔ ۱۸۶۰ء کے قریب گجرات میں پیدا ہوئے مشن سکول گجرات سے میٹرک کے بعد علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی کیا۔ سیشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انبالہ اور سرگودھا میں تعینات رہے۔ ۱۹۱۹ء میں سرگودھا میں انفلوئنزا سے وفات پائی۔ آپ کے ایک کزن سید عظمت علی شاہ اور آپ کے صاحبزادے سید سجاد حیدر اقبال کے ہم زلف تھے۔ اسی قرابت داری کی بنا پر کبھی کبھار اقبال سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ (۲۷)

سید امجد علی شاہ

سید نور اللہ شاہ کے فرزند اور سید سجاد حیدر (اقبال کے ہم زلف) کے بھائی تھے۔ ۱۹۰۸ء میں گجرات میں پیدا ہوئے انٹر کالج گجرات اور لاہور میں تعلیم پائی۔ ریلوے میں ایس ڈی او تھے۔ جب سید سجاد حیدر لاہور میں میکلوڈ روڈ پر علامہ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے اور کریم بی بی (زوجہ اقبال) اپنی بہن شہزادہ بیگم کے گھر میں مقیم تھیں۔ تو سید امجد علی شاہ بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ وہ اقبال سے ملنے والوں میں شامل تھے۔ ایک دفعہ وہ کریم بی بی کے کہنے پر اقبال سے ملے کہ کریم بی بی کا خرچ بڑھایا جائے۔ (۲۸)

حوالہ جات و حواشی

(۱) ہفت روزہ ”تعمیر نو“ گجرات سالنامہ ۱۹۶۷ء

(۲) کتبہ قبر پر سن رحلت ۱۹۱۹ء (۲۹ ستمبر) درج ہے۔ یہ کتبہ پیر فضل گجراتی نے لگوایا تھا تذکرہ نگاروں نے سن رحلت ۱۹۳۰ء لکھا ہے۔ مزید تحقیق جاری ہے۔

(۳) خفتگانِ خاک گجرات صفحہ ۴۴

(۴) بانگ دہل۔ اُستاد امام الدین گجراتی۔ اُردو ہاؤس تاجران کتب گجرات۔ طبع سوم ۱۹۹۱ء صفحہ ۹۷

(۵) معلومات از بانگ دہل۔ پہلا اڈیشن

(۶) بانگ دہل۔ طبع سوم صفحہ ۳۱۸

(۷) ایضاً ص ۳۴۳

(۸) ایضاً ص ۱۸۷

(۹) ایضاً صفحہ ۱۳۱

(۱۰) ایضاً صفحہ ۱۹۵

(۱۱) درج ذیل سے مدد لی گئی ہے۔

(الف) افتخار بٹ بھتیجا سائیں فیروز الدین نگین۔ ملاقات ۱۷ نومبر ۱۹۹۱ء

(ب) ہفت روزہ ”تنظیم“ بھمبر گجرات مورخہ ۸ جنوری ۱۹۶۸ء

(ج) خفتگانِ خاک گجرات صفحہ ۱۸۲

(۱۲) شریف کنجاہی صاحب سے راقم کی ملاقات مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۹۱ء

(۱۳) خفتگانِ خاک گجرات صفحہ ۲۴

(۱۴) زبانی روایت ڈاکٹر احمد حسین قریشی

(۱۵) خفتگانِ خاک گجرات صفحہ ۱۷۹

(۱۶) انوار اِقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار: اِقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۸۷

(۱۷) ایضاً صفحہ ۱۸۸

(۱۸) پوپھٹی از پیر نیک عالم ایڈیشن ۲' س' ن' صفحہ ۵۱' ۵۲ - "رجوع بہ داستان" آخری حصہ

(۱۹) خفتگان خاک گجرات صفحہ ۱۹۸

(۲۰) چودھری صاحب سے راقم کی ملاقات مورخہ ۳ نومبر ۱۹۹۱ء

(۲۱) اقبال کے آخری دو سال از عاشق حسین بٹالوی" لاہور ۱۹۷۸ء صفحہ ۵۳۰

(۲۲) درج ذیل سے مدد لی گئی ہے۔

(الف) اسلامیہ کالج لاہور کی صد سالہ تاریخ از احمد سعید۔ لاہور ۱۹۹۲ء صفحہ ۵۵۔

(ب) احوال و آثار مولوی نجف علی عاصی۔ عبدالجلیل نجفی لاہور ۱۹۸۷ء

(ج) اقبال اور انجمن حمایت اسلام از محمد حنیف شاہد لاہور ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۸۴

(۲۳) گجرات کی بات مرتبہ اسحاق آشفتہ - گجرات ۱۹۹۱ء صفحہ ۴۹۴

(۲۴) روایات اقبال مرتبہ عبد اللہ چغتائی صفحہ ۹۵

(۲۵) ماہنامہ "لہراں" لاہور - اکتوبر ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۵

(۲۶) دیکھئے "اقبال کا مقلد - دائم اقبال دائم" از بہاؤ الحق عارف مطبوعہ لہراں مارچ ۱۹۷۹ء

(۲۷'۲۸)معلومات از سید حسن عسکری و سید فخر تراب (گجرات) ملاقات مورخہ ۷ اگست ۱۹۹۵ء

حصہ پنجم: اِقبال کے گجراتی مکتوب الیھم

- ماسٹر طالع محمد
- چودھری محمد احسن

"شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اِس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعراء کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔"

(اِقبال)

اِقبال نے زِندگی میں سینکڑوں افراد کو ہزاروں خطوط لکھے جو ان کے نظریات اور ذاتی زِندگی کے متعلق بہت اہم اور مستند دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ اِقبال کے مکتوب الیہم میں درج ذیل کا تعلق گجرات سے تھا۔

(۱) ڈاکٹر محمد شجاع ناموس
(۲) پروفیسر محمد اکبر منیر
(۳) شیخ عطاء اللہ وکیل
(۴) قاضی فضل حق
(۵) شیخ عنایت اللہ
(۶) مولا بخش واصف
(۷) محمد عبداللہ مومن
(۸) مولوی فضل کریم
(۹) نذیر احمد بھٹی
(۱۰) ماسٹر طالع محمد
(۱۱) چودھری محمد احسن

اِن حضرات میں سے پہلے پانچ حضرات کے نام خطوط کے پچھلے صفحات میں درج کر دیے گئے ہیں۔ نمبر ۶ سے ۹ تک کے نام خطوط دیکھے گئے ان کے حصول کی کوشش جاری ہے۔ متعلقہ لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی۔ اِس باب میں دو حضرات ماسٹر طالع محمد اور چودھری محمد احسن کے نام خطوط اور مکتوب الیہما کا تعارف پیش خدمت ہے۔

ماسٹر طالع محمد

ماسٹر طالع محمد، اِقبال کے ان مکتوب الیہم میں سے ہیں جن کے متعلق اِس سے قبل کچھ نہیں لکھا گیا (۱) ان کے نام علامہ کا ایک خط محفوظ ہے۔

ماسٹر طالع محمد ۱۰ ستمبر ۱۸۷۹ء میں جلالپور جٹاں میں میر کریم بخش کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے پڑدادا عظمت میر نے ناگام (کشمیر) سے ہجرت کر کے جلالپور جٹاں کو مسکن بنایا تھا۔ ماسٹر طالع محمد نے ابتدائی تعلیم جلالپور جٹاں میں حاصل کی۔ ۱۹۰۲ء میں سنٹر ٹریننگ کالج لاہور سے سینئر اینگلو ورنیکلر کے بعد ۲۰ جون ۱۹۰۳ء میں چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن سکول جلالپور جٹاں میں ملازمت اختیار کی۔ اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت جلد ہی ان کا شمار سکول

کے بہترین اساتذہ میں ہونے لگا اور ۱۹۱۰ء کے قریب اُنہیں مشن سکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ جہاں وہ ۱۹۲۳ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ مشن کی جانب سے ملنے والی تعریفی اسناد میں انکی پیشہ وارانہ خدمات کو بہت سراہا گیا ہے۔

ماسٹر طالع محمد نے ۱۹۲۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ۱۹۲۳ء میں بی اے پاس کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد اُنہیں اِسلامیہ ہائی سکول جلالپور جٹاں کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا' جہاں وہ ۱۹۴۰ء تک نہایت مستعدی سے تدریس کا مقدس کام کرتے رہے۔ وہ نہایت محنتی اُستاد تھے' تدریس کا فن جانتے تھے اور بڑے خلوص سے پڑھاتے تھے۔"

ماسٹر طالع محمد سماجی خدمت میں بھی بہت فعال تھے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اِس علاقے میں طاعون کی وبا زوروں پر تھی۔ ماسٹر صاحب نے حکومتی سرگرمیوں میں بہت ہاتھ بٹایا۔ وہ ۱۱-۱۹۱۰ء میں اعزازی پلیگ آفیسرز رہے۔ وہ ٹاؤن کمیٹی جلالپور جٹاں کے آنریری سیکرٹری' میونسپل کمشنر اور وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت میں بھی علاقے کی فلاح و بہبود کیلئے سرگرم رہے۔ مشن کی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ' جنگ عظیم اول' ریڈ کراس اور طاعون کے خاتمہ کیلئے اِن کی خدمات کا سرکاری سطح پر اعتراف کیا گیا۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے دربار میں کرسی نشین بھی تھے۔

ماسٹر طالع محمد' سرسید کے نظریات اور انکے مشن سے بہت متاثر تھے۔ اور عملی طور پر بھی اِس میں شامل تھے۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں دھلی میں منعقدہ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنیٹل ایجوکیشنل کانفرنس میں لوکل کمیٹی گجرات کی رپورٹ میں اِن کی مالی و اخلاقی امداد کا ذِکر موجود ہے۔ ماسٹر صاحب مشن سکول سے ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ کے سکول سیکشن میں پڑھانے کے خواہشمند تھے۔ اُنہوں نے شیخ عبدالقادر کو لکھا جن سے اُن کے مراسم تھے۔ اُنہوں نے یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۸ء-۱۹۴۷ء) کو لکھا اور انکا جواب موصول ہونے پر اِسی خط پر اپنی طرف سے نوٹ لکھ کر ماسٹر صاحب کو بھیج دیا۔ علی گڑھ میں سائنس مضامین کے اُستاد کی ضرورت تھی مگر ماسٹر طالع محمد سائنس نہیں جانتے تھے۔ یوں انکی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اِس خط کا عکس صفحہ ۳۸۳ پر دیا گیا ہے۔

ماسٹر طالع محمد ایک فعال اور خدمت سے عبارت زِندگی گزار کر ۲۱ ستمبر ۱۹۵۱ء کو فوت ہوئے اور جلالپور جٹاں میں دفن ہوئے (۲)

مکتوب اِقبال بنام ماسٹر طالع محمد:۔

ماسٹر طالع محمد ایک اُردو لغت ترتیب دے رہے تھے (۳) تو ان کے سامنے دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل ہونے والے الفاظ کے تلفظ کا مسئلہ پیدا ہوا۔اِس الجھن کے حل کیلئے اُنہوں نے علامہ کو خط لکھا۔ علامہ نے جواب لکھا۔ جب ۴۔۱۹۴۳ء میں پروفیسر شیخ عطاء اللہ (جو غالباً ماسٹر طالع محمد کے شاگرد تھے) نے علامہ کے خطوط جمع کرنے شروع کئے تو ماسٹر صاحب نے بھی اصل خط ان کے حوالے کر دیا۔ یہ خط اِقبالنامہ حصہ دوم صفحہ ۲۲۶ پر درج ہے جہاں سے تعارفی نوٹ کیساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"مکتوب الیہ نے جلالپور جٹاں ضلع گجرات' پنجاب' سے دریافت فرمایا" جب عربی الفاظ یا فارسی زبان سے اُردو میں منتقل ہوتے ہیں تو بعض اوقات اُردو میں آن کر تلفظ بدل جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں شَفقت ہے لیکن اُردو میں شفقت صحیح ہے۔ مگر بعض باریک بین اور نفاست پسند حضرات اصل زبان کے تلفظ کو اُردو میں خواہ مخواہ ٹھونسنے پر ادھار کھائے ہوئے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اصلی زبان کے تلفظ کو صحیح تصور کیا جائے یا وہ تلفظ صحیح ہے جو اہل زبان (دہلوی اور لکھنوی ادیب یا ان کا خواندہ طبقہ اِستعمال کرتا ہے۔"

"اس کے بعد ماسٹر صاحب موصوف نے الفاظ کی ایک فہرست دے کر ان کا درست تلفظ دریافت فرمایا۔ جواب حسب ذیل موصول ہوا۔"

مکرم بندہ: اَلسلام علیکم!

جس قسم کی تحقیق زبان آپ کو مطلوب ہے افسوس کہ میں اِس میں آپ کی کوئی امداد نہیں کر سکتا۔ غالباً لکھنؤ سے ایک آدھ رسالہ اِس قسم کا شائع ہوتا ہے مگر مجھے نام معلوم نہیں اِس سلسلے میں آپ مرزا یاس عظیم آبادی ایڈیٹر کار امروز لکھنؤ اور مرزا عزیز لکھنوی اشرف منزل لکھنؤ سے خط و کتابت کریں۔ وہ آپ کو بہتر مشورہ دے سکیں گے۔ میں آپ کی قدر و منزلت کرتا ہوں کہ اس زمانے میں اور ایسے مقام پر آپ کو صحیح اُردو کا ذوق ہے۔

محمد اِقبال لاہور

۱۸ جون ۲۱ء

چودھری محمد احسن

چودھری محمد احسن ' پنجابی زبان کے بلند پایہ شاعر' پیر نیک عالم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور گجرات کے نامور وکیل چودھری محمد حسن چیمہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

محمد احسن ۱۹۰۴ء کے قریب کلاچور (متصل جلالپور جٹاں) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جلالپور جٹاں میں حاصل کی۔ اِسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے کی ڈگری لی اور ملازمت اختیار کی۔ ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائیٹیز کے عہدے تک پہنچے۔ اَپنے بڑے بھائی (حافظ محمد حسن) سے پہلے ۱۹۶۷ء کے قریب فوت ہوئے (۴)

پس منظر

چودھری محمد احسن کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن لاہوری جماعت کے سرگرم رکن اور امیر گجرات تھے۔ اپنی جماعت میں اضافہ کیلئے تبلیغ میں بھی بہت مستعد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اَپنے چھوٹے بھائی کو بھی اِس جماعت میں شمولیت کی دعوت دی۔ اور جماعت کا لٹریچر بھی فراہم کیا۔ چنانچہ چودھری محمد احسن نے علامہ سے راہنمائی طلب کی اور خصوصیت سے یہ دریافت کیا کہ کیا مرزا غلام احمد مجدد کہلانے کے حقدار ہیں؟ (کیونکہ احمدیوں کی لاہور جماعت مرزا صاحب کو نبی کی بجائے مجدد مانتی ہے) اِس کے علاوہ جماعت کے متعلق علامہ کی مجموعی رائے بھی دریافت کی اور اِس میں شامل ہونے یا نہ ہونے کے متعلق بھی انکی ہدایت کیلئے درخواست گزار ہوئے۔ علامہ کے جواب کے بعد چودھری محمد احسن نے لاہوری جماعت میں داخل نہ ہونے کا فیصلہ کیا اور تمام عمر اَپنے سنی عقیدے پر قائم رہے۔

مکتوب اِقبال بنام چودھری محمد احسن

علامہ کا مکتوب بنام چودھری محمد احسن اِس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں علامہ مرحوم کا ظہور مہدی' مجددیت اور احمدیت کے متعلق (اس دور ۱۹۳۲ء میں) عقیدہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط سب سے پہلے اِقبالنامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ' لاہور ۵۱ء صفحہ ۲۳۰ تا ۲۳۲ پر شائع ہوا تھا تاہم اپنی اہمیت کے پیش نظر یہ خط جزواً یا کاملاً وقتاً فوقتاً مختلف کتب اور جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ اِس خط میں علامہ نے احمدیت کے متعلق جو نظریہ بیان کیا تھا' ۱۹۳۵ء کے بعد اِس میں واضح تبدیلی رونما ہو گئی تھی

۷ اپریل ۳۲ء

جناب من السلام علیکم

میں آپ کے بھائی صاحب سے بخوبی واقف ہوں وہ نہایت نیک نفس آدمی ہیں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کسی عالم سے یہ سوالات کرنے چاہیں جو آپ نے مجھ سے کیے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپکو اپنا عقیدہ بتا سکتا ہوں۔ اور بس۔ میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کا کوئی سروکار نہیں (۵) ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علماء یا دیگر قائدین امت کو مجدد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کو مورخین نے مہدی لکھا ہے۔ بعض علمائے امت کو امام اور مجدد کے الفاظ سے یاد کیا ہے اِس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کے مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصرو ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اِسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذِکر کرنا ہوگا۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہے زمانہ حال کے مسلمانون کی نشاۃ الثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اِس کا دعویٰ نہیں کیا تو اِس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا

باقی رہی تحریک احمدیت۔ سو میرے نزدیک لاہور کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو میں غیرت مند مسلمان جانتا ہوں۔ اور اِن کی اشاعت اِسلام کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں۔ کسی جماعت میں شریک ہونا یا نہ ہونا انسان کی ذاتی افتاد طبیعت پر بہت کچھ منحصر رکھتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ آپ کو خود کرنا چاہیئے۔

اِسلام کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے کے کئی طریق ہیں۔ جن طریقوں پر اِس وقت تک عمل ہوا ہے ان کے علاوہ اور طریق بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے عقیدہ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ زمانہ حال کی طبائع کیلئے موزوں نہیں ہے۔ ہاں اشاعت اِسلام کا جوش جو انکی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے قابل قدر ہے۔

والسلام

محمد اِقبال

حوالہ جات و حواشی

(۱) ماسٹر طالع محمد کے بارے میں راقم کا ایک مضمون سہ ماہی "صحیفہ" انجمن ترقی ادب لاہور کے شمارے بابت اکتوبر دسمبر ۹۰ء میں شائع ہوا۔ اِس مضمون میں اضافہ و ترمیم کے بعد اسے "نقوش" لاہور (سالنامہ ۱۹۹۲ء) شمارہ ۱۴۷ میں شائع کروایا تھا۔

(۲) ماسٹر صاحب کے حالات کے اسکے کاغذات و اسناد سے اخذ کئے گئے ہیں۔

(۳) یہ لغت مکمل نہ ہو سکی۔

(۴) چودھری محمد احسن کے حالات چودھری فتح محمد عزیز ایڈووکیٹ (گجرات) سے حاصل ہوئے۔

(۵) علامہ تمنا عمادی (۱۸۸۸ء - ۱۹۷۱ء) نے اِن تمام احادیث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جو ظہور مہدی سے متعلق ہیں۔ چار احادیث ترمذی کی، دس ابو داؤد کی اور سات ابن ماجہ کی ہیں اُنھوں نے اِن تمام احادیث کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بعد اُنہیں مجہول اور ضعیف ثابت کیا ہے (تفصیل کیلئے دیکھئے - ماہنامہ طلوعِ اِسلام لاہور مارچ، مئی ۱۹۵۴ء)

باب پنجم

اِقبال شناسی میں گجرات کا کردار

- حصہ اول: مترجمینِ اِقبال
- حصہ دوم: محققینِ اِقبال
- حصہ سوم: مقلدینِ اِقبال
- حصہ چہارم: رسائل و جرائد و بزمہائے اِقبال

حصہ اول: مترجمینِ اِقبال

- ڈاکٹر احمد حسین قریشی
- پروفیسر شریف کنجاہی
- ملک محمد اشرف
- پروفیسر سید اَکبر علی شاہ
- مفتی حمید اللہ
- کاظم علی گجراتی
- علی احمد گوندل
- اختر حسین شیخ
- ڈاکٹر آفتاب اصغر
- محمد رمضان تبسم قریشی
- چند اور مترجمین
- چودھری محمد احسن (علیگ)

تراجم کا اجمالی خاکہ

ترجمانِ حقیقت کے پیغام کو عام کرنے میں ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کے کلام و خطبات کے بہت سے تراجم شائع ہو چکے ہیں لیکن اس میدان میں اہلِ گجرات کی خدمات سب سے زیادہ اور سب سے وقیع ہیں۔ خصوصی طور پر پنجابی میں تراجم میں گجرات کے شعراء کو اولیت حاصل ہے۔ اہالیانِ گجرات کے کئے ہوئے تراجم کی فہرست کچھ یوں ہے۔

پنجابی تراجم

شکوہ 'جوابِ شکوہ کا منظوم ترجمہ	از ڈاکٹر احمد حسین قریشی
اسرارِ خودی کا منظوم ترجمہ	از ڈاکٹر احمد حسین قریشی
مثنوی مسافر کا منظوم ترجمہ	از ڈاکٹر احمد حسین قریشی
گلشنِ رازِ جدید و بندگی نامہ کا منظوم ترجمہ	از ڈاکٹر احمد حسین قریشی
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا منظوم ترجمہ	از ڈاکٹر احمد حسین قریشی
جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ	از پروفیسر شریف کنجاہی
خطباتِ اقبال کا ترجمہ	از پروفیسر شریف کنجاہی
علم الاقتصاد کا ترجمہ	از پروفیسر شریف کنجاہی
ارمغانِ حجاز کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ	از علی احمد گوندل
شکوہ 'جوابِ شکوہ کا منظوم ترجمہ	از کاظم علی گجراتی
منتخب نظموں اور غزلوں کا منظوم ترجمہ	از اختر حسین شیخ
لالۂ طور (پیامِ مشرق) کا منظوم ترجمہ	از کیپٹن تبسم قریشی

اردو تراجم

خطبہ الٰہ آباد کا اُردو ترجمہ	از حکیم آفتاب احمد قرشی
جاوید نامہ کا منظوم اُردو ترجمہ	از مفتی حمید اللہ مرحوم
خطباتِ اقبال کا آسان اُردو ترجمہ	از شریف کنجاہی
گلشنِ رازِ جدید کا منظوم اُردو ترجمہ	از شریف کنجاہی

فارسی تراجم

کشمیر پر کلامِ اقبال اُردو کا منظوم فارسی ترجمہ	از ڈاکٹر آفتاب اصغر

انگریزی تراجم

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا منظوم انگریزی ترجمہ — از ملک محمد اشرف
ضربِ کلیم کا منظوم انگریزی ترجمہ — از پروفیسر سید اکبر علی شاہ
بالِ جبریل (غزلیات) کا منظوم انگریزی ترجمہ — از پروفیسر سید اکبر علی شاہ

تصویری ترجمانی

عکاسیاتِ احسن' از کلام اِقبال — از چودھری محمد احسن علیگ'
اشعارِ اِقبال کی تصویری جھلکیاں — از چودھری محمد احسن علیگ

ڈاکٹر احمد حسین قریشی

ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری گجرات کے مشہور محقق ہیں۔ ان کی شہرت کے اور بھی کئی پہلو ہیں جن میں ان کا کتب خانہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اُردو' فارسی اور عربی میں ایم اے جبکہ اُردو اور عربی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ اب تک درجنوں مقالات اور کئی کتب لکھ چکے ہیں۔ تاہم بیشتر کام ابھی تشنۂ طباعت ہے۔ ان کی تاحال آخری علمی کاوش قرآن حکیم کا منظوم اُردو ترجمہ ہے۔ اُردو' پنجابی اور فارسی میں شاعری کرتے ہیں اور عربی میں بھی شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ اِن چاروں زبانوں پر مشتمل حمدیہ و نعتیہ دیوان چھپ چکا ہے۔

کلام اِقبال کے پنجابی تراجم میں بھی قریشی صاحب کا نام معتبر حیثیت کا حامل ہے اب تک درج ذیل پنجابی تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ شکوہ' جوابِ شکوہ	پنجابی اَدبی بورڈ لاہور۔ ۱۹۶۳ء	صفحات ۳۲
۲۔ اسرارِ خودی	میری لائبریری لاہور۔ ۱۹۷۶ء	صفحات ۵۲
۳۔ مسافر (مثنوی)	میری لائبریری لاہور۔ ۱۹۷۶ء	صفحات ۴۸
۴۔ گلشنِ رازِ جدید و بندگی نامہ	اِقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۴ء	صفحات ۶۳
۵۔ پس چہ بائید کرد اے اقوامِ شرق	اِقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۹۴ء	صفحات ۸۲

قریشی صاحب نے اِقبالیات پر کئی مقا بھی قلمبند کئے ہیں

شکوہ' جواب شکوہ کے ترجمہ میں سے شکوہ کے پہلے بند کا ترجمہ بلاحظہ ہو' اِقبال کہتے ہیں

کیوں زیاں کار بنوں' سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں ' محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز\ مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدھن ہے مجھ کو

ڈاکٹر احمد حسین یوں ترجمہ کرتے ہیں (۱)

کیوں گھاٹے وچ رہنے والا ہوواں ' نفع نہ پاواں
اگے دی کجھ کراں نہ چتا ' پچھے دے غم کھاواں
میں بلبل دے کتھوں توڑی رونے سندا جاواں
میں بے حس تے نہیں پھل وانگوں کیوں نہ لباں ہلاواں
گل کرن دی دیہن دلیری سخنوں ذوق گھنیرے
گلے الاہمے رب دے اتے بھس پوے منہ میرے

پروفیسر شریف کنجاہی

پروفیسر محمد شریف کنجاہی پنجابی زبان و ادب اور ترجمہ کی دنیا میں بہت معتبر نام ہے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے عمرِ عزیز درس و تدریس میں گزری۔ اب تک دو درجن سے زائد علمی و تحقیقی کتب و تراجم پیش کر کے اہلِ علم و فن سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ جن میں "جگراتے" "جھاتیاں" ' اور پنجابی ترجمۂ قرآن خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ دو اردو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

شریف کنجاہی اِقبالیات میں بھی بلند مقام کے مالک ہیں ؛ ان کے کئے ہوئے تراجم تقدم اور معیار ہر دو اعتبار سے قابلِ رشک ہیں۔ تفصیل یوں ہے

۱۔ "جاوید نامہ" کا منظوم پنجابی ترجمہ — مجلسِ ترقی آدب لاہور۔ ۱۹۷۷ء — صفحات ۲۱۶
۲۔ "علم الاقتصاد" کا پنجابی ترجمہ — بزمِ اقبال لاہور۔ ۱۹۷۸ء — صفحات ۲۹۱
۳۔ خطبات کا پنجابی ترجمہ — مجلسِ ترقی آدب لاہور۔ ۱۹۷۷ء — صفحات ۳۷۳

۴۔ خطبات کا آسان اُردو ترجمہ بزم اِقبال لاہور۔ ۱۹۹۲ء صفحات ۲۲۳
۵۔ گلشنِ رازِ جدید کا منظوم اُردو ترجمہ اِقبال اکادمی لاہور۔ ۱۹۹۲ء صفحات ۳۶

درج بالا تراجم میں فارسی کلامِ اِقبال سے منظوم پنجابی ترجمہ بھی شامل ہے اور علم الاقتصاد جیسی ٹیکنیکل کتاب کا پنجابی ترجمہ بھی۔ علاوہ ازیں اِقبال کے انگریزی خطبات کا پنجابی زبان میں ترجمہ بھی ایک کارنامہ ہے۔ شریف صاحب نے اِقبال کے حضور منظوم خراجِ عقیدت کے علاوہ ان کے کلام پر بلند مرتبہ مضامین و مقالات بھی رقم کئے ہیں۔ مثلاً

خفتگانِ خاک سے استفسار	سہ ماہی صحیفہ 'اِقبال نمبر'	جولائی ۱۹۷۷ء
اِقبال تے روٹی دا مسئلہ	"پندرہ روزہ و نگار"۔ ۱۹۷۷ء	شمارہ ۱۳' ۱۴'
بانگِ دراء کی ابتدائی نظمیں۔	سہ ماہی "فنون" لاہور	دسمبر ۱۹۷۷ء
اِقبال کی دعائیں۔	"صحیفہ اِقبال" مرتبہ یونس جاوید	۱۹۸۶ء
گلشنِ رازِ (قدیم و جدید) پر ایک نظر	فنون۔ لاہور	نومبر دسمبر
اِقبال کی مرثیہ نگاری	ماہ نو' لاہور'	اپریل ۱۹۹۰ء

'جاوید نامہ' کے پنجابی ترجمہ سے اقتباس

اِقبال۔ خطاب بہ جاوید (سخن بہ نژاد نو)

این سخن آراستن بے حاصل است — بر نیاید آنچہ در قعرِ دل است
گرچہ من صد نکتہ گفتم بی حجاب — نکتہ ئے دارم کہ ناید در کتاب
گر بگویم مے شود پیچیدہ تر — حرف و صوت اورا کند پوشیدہ تر
سوزِ او را از نگاہِ من بگیر — یا ز آہِ صبح گاہ من بگیر

شریف کنجاہی صاحب کا ترجمہ (۲)

گلاں توں کی حاصل ہووے' کی ہتھ پلے آوے
جو کجھ دل دے اندر ہے وے اوہ نہ دسیا جاوے
بھانویں لکھ ہٹا کے اوہلے بھیت ہزار وکھائے
پر اک نکتہ ہے اجیہا لکھنے وچ نہ آئے
مونہوں کڈھاں تے اوہ ہتھوں ہور اڑچدا جاوے
حرفاں تے آوازاں اس نوں برقعے ہور پوائے
پر سیک اس دا لے سکنا ایں میری توں نگاہوں
یا مڑ میری سرگی ویلے والی ٹھنڈی آہوں

ملک محمد اشرف خاں

ملک محمد اشرف خان نے اقبال کی ایک طویل نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا انگریزی زبان میں منظوم ترجمہ کیا اور کچھ ایسی عمدگی، دقتِ نظر اور محنت و محبت سے کیا کہ خود کو مترجمینِ کلامِ اقبال کی صفِ اول میں شامل کروالیا۔

ملک محمد اشرف ۳ اپریل ۱۹۱۵ء کو گجرات شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ملک برکت علی بسلسلہ ملازمت بھوپال میں رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ محمد اشرف کی ابتدائی تعلیم بھوپال میں ہوئی۔ وہاں کے ادبی ماحول سے ذوق پیدا ہوا اور وہ اردو زبان و ادب کے رموز سے آگاہ ہوئے۔ اگرچہ کالج کی تعلیم زیادہ عرصہ جاری نہ رکھ سکے تاہم اپنے والد سے ورثہ میں ملنے والے ذوقِ لطیف اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے اوئلِ عمری میں ہی اردو اور انگریزی پر عبور حاصل کرلیا اور بعد ازاں فارسی اور عربی بھی بقدرِ ضرورت سیکھ لی۔

تقسیمِ ہند کے بعد وہ گجرات آگئے اور بقیہ زندگی اسی شہر میں بسر کی۔ حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا اور نامساعد حالات کے باوجود اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لاکر بلند علمی مقام حاصل کیا۔ ان کی تحریریں ان کے جوشِ تاثر، فکرِ پختہ، متوازن قوتِ اظہار اور اسلام کے ساتھ گہری وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ملک محمد اشرف ایک نابغۂ روزگار تھا مگر حالت کی ستم ظریفیوں اور دنیا کی بے قدری نے اس گرانمایہ سکالر کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کردیا۔ اور یہ دانشور گم نامی اور کسمپرسی کی زندگی گزار کر ۹ جنوری ۱۹۸۱ء کو راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اور گجرات میں آخری آرام گاہ بنی (۳)

کلامِ اقبال کا ترجمہ

ملک اشرف نے "ارمغانِ حجاز" کے حصۂ اردو کی طویل نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کا منظوم کا انگریزی ترجمہ ۱۹۴۶ء میں جب وہ بھوپال میں قیام پذیر تھے، مکمل کیا۔ بھوپال میں ملک صاحب کے دوستوں میں ممنون حسن خان اور سامجددی جیسے اقبال شناس شامل تھے۔

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۵۱ء میں "The Devil's Conference" کے نام سے اردو ہاؤس بک سیلرز گجرات نے شائع کیا۔ اس میں ترجمہ کے ساتھ ساتھ تشریح بھی شامل تھی اور اس کی ضخامت ۱۶۰ صفحات تھی۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور تعارف سرشیخ عبدالقادر نے لکھا۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن "Thus Conferred Satan" کے عنوان سے بک ہاؤس لاہور نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ یہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن تھا اور اِس کی ضخامت ۳۵۰ صفحات تھی۔اِس ایڈیشن میں مترجم کا دیباچہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں یورپ کے بعض نامور مستشرقین کی آراء بھی شامل تھیں۔ جنہوں نے ملک صاحب کی کوشش کو بہت سراہا تھا۔ ان میں اطالوی پروفیسر الیگساندرو بوسانی (م۔مارچ ۱۹۸۷ء) اور فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسینون (۱۸۸۳ء ۔ ۱۹۶۲ء) شامل تھے۔ ان کے علاوہ شیخ موسیٰ جار اللہ، سید سلیمان ندوی، مولانا سید مودودی (۱۹۰۳ء ۔ ۱۹۷۹ء) وغیرہ کی آراء دونوں ایڈیشنوں کا حصہ ہیں۔اِقبال کے اصل اشعار اور ترجمہ ملاحظہ ہو۔(۴)

ابلیس (اپنے مشیروں سے)

جانتا ہوں، میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

The Arch Devil (to his councillors)

I do know this community is no longer the bearer of the Quran.

The same capitalism is the religion of the believer now.

And I know, too, that in the dark night of the East.

The sleeves of the Holyones of the Sanctuary, is bereft of the white, illuminating hand.

The demands of the present age, however, Spell the apprehension.

Lest Sariah of the Prophet should come to light oneday.

پروفیسر سید اَکبر علی شاہ

پروفیسر سید اَکبر علی شاہ نے اِقبال کی دو کتابوں "بالِ جبریل" اور ""ضربِ کلیم" کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

سید اَکبر علی ۶ جون ۱۹۱۱ء کو گجرات شہر میں سید چنن شاہ کے گھر پیدا ہوئے جو کچہری میں ملازم تھے اور اکبر علی کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اکبر علی نے عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ گجرات سے باہر گزارا۔ زمیندار سکول گجرات اور اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی اور فارسی کے مضامین میں ایم اے کی ڈگریاں ذاتی مطالعہ اور کوشش سے تقسیم ہند سے قبل جب کے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری قیام پاکستان کے بعد حاصل کی۔ پنجاب کے مختلف ہائی سکولوں مثلاً گورداسپور' بھلوال اور جہلم سے سلسلۂ تدریس شروع کیا اور پھر جھنگ اور شیخوپورہ کے گورنمنٹ کالجز میں انگریزی کے اُستاد رہے اور ۱۹۷۱ء کے لگ بھگ ریٹائر ہوئے۔ انتہائی شفیق 'مہربان اور محنتی استاد تھے۔ انگریزی ' اردو' فارسی اور عربی کے جید عالم تھے مگر اپنی درویشی اور گوشہ نشینی کی وجہ سے ابھی تک علمی حلقوں میں زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۷۷ء میں بالِ جبریل کا ترجمہ کیا اور وفات تک اپنی مصروفیات کو اِقبال کے مطالعہ تک محدود رکھا۔ ۱۹۸۳ء میں "ضربِ کلیم" کا ترجمہ مکمل کیا۔ ۱۴ مئی ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور گجرات شہر کے تریہنگ قبرستان میں دفن ہوئے (۵)

تراجمِ اِقبال

۱۔ بالِ جبریل کی غزلوں کا ترجمہ "Gabriel's Wing" کے نام سے ۱۹۷۹ء میں ماڈرن بکڈپو۔ اِسلام آباد نے طبع کیا اِس کی ضخامت ۱۶۲ صفحات ہے۔ اِس کا ترمیم و اضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں لاہور سے علمی کتاب خانہ نے شائع کیا۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات ہے۔

۲۔ ضربِ کلیم کا ترجمہ "The Rod of Moses" کے عنوان سے اِقبال اکادمی لاہور نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا اِس کی ضخامت ۲۰۰ صفحات ہے۔ اِن ۲۰۰ صفحات میں ۱۴ صفحات کا تعارف ہے جو مترجم نے فکرِ اقبال خصوصاً ضربِ کلیم سے متعارف کروانے کیلئے لکھا ہے۔ ۱۱۴ صفحات کا ترجمہ ہے اور ۵۶ صفحات پر تعلیقات و حواشی ہیں۔

سید اَکبر علی شاہ کے دونوں تراجم زبان و فن کے اعتبار سے نہایت بلند پایہ اور خوبصورت ہیں۔ ترجمہ آسان فہم ہونے کیساتھ ساتھ صوتی آہنگ کے اعتبار سے بھی بہت

دلکش ہے۔ ضربِ کلیم کے ترجمہ سے ایک مختصر نظم کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ اقبال کی نظم ہے۔

"پنجابی مسلمان"

مذہب میں بہت تازہ پسند اِس کی طبیعت
کرلے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیّاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

سید اکبر علی کا انگریزی ترجمہ:(۶)

PUNJABI MUSLIM

A newborn faith invokes his taste,

Adopts with zeal but leaves with haste,

In search for truth he takes no part,

If comments' snare some hunter set,

From nest on bough would drop in net.

مفتی حمیداللہ

مفتی حمیداللہ مرحوم نے "جاوید نامہ" کا اُردو ترجمہ کیا ہے

مفتی صاحب یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو گجرات کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ریلوے میں ٹکٹ اگزیمی نر بھرتی ہوئے اور طویل مدت ریلوے کے محکمہ میں بسر کی۔ ۱۹۵۰ء میں شاعری شروع کی۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ جس میں قدیم اور جدید دونوں آہنگ ملتے ہیں۔ اِقبال کی فکری روایت سے منسلک ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں منفی اقدار اور غیرانسانی رویوں پر بھرپور تنقید ملتی ہے۔ اور وہ ایک صحیح اِسلامی معاشرے کا خواب دیکھتے نظر آتے ہیں۔

مفتی حمیداللہ صاحب نے جاوید نامہ کا منظوم اُردو ترجمہ بہت عرصہ قبل مکمل کر لیا تھا۔ یہ انکی کئی برس کی محنت کا نچوڑ ہے مگر ابھی شائع نہیں ہو سکا۔ اِس ترجمہ کے کچھ حصے روزنامہ "نوائے وقت" میں بھی شائع ہوتے رہے اور چودھری محمد احسن علیگ نے اِسی ترجمہ کو اپنی کتاب "اشعار اِقبال کی تصویری جھلکیاں" میں بھی شامل کیا۔ مفتی صاحب نے اِقبال کی کچھ اور نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ مفتی صاحب ۱۳ اگست ۱۹۹۱ء کو فوت ہوئے اور گجرات میں آسودہ خاک ہیں۔(۷)

ترجمہ کا انداز یہ ہے۔

علامہ محمد اِقبال

بکشای لب کہ قند فراوانم آرزو ست
بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزو ست
یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار
رقصی چنیں میانہ میدانم آرزو ست

مفتی حمیداللہ (۸)

ہونٹوں کو کھول قندِ فراواں ہے آرزو
چہرہ دکھا کہ باغ و گلستاں ہے آرزو
جی چاہتا ہے رقص ہو میداں کے درمیاں
جام و شراب و گیسوئے جاناں ہے آرزو

کاظم علی گجراتی

کاظم علی نے "شکوہ' جواب شکوہ" کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے۔
کاظم علی یکم اپریل ۱۹۳۳ء کو موضع چھوکر کلاں ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ اپنے گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے بعد نارمل سکول گکھڑ سے تربیت حاصل کرکے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے فاضل فارسی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں تدریس کا پیشہ چھوڑ کر تصنیف و تالیف کی طرف آگئے اور مختلف جرائد میں قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ سکرپٹ ریڈنگ اور ایڈیٹنگ بھی کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۱ء تک امامیہ مشن لاہور' ۸۲ء سے ۱۹۸۸ء تک جامعہ تعلیمات اِسلامیہ کراچی اور اِسکے بعد مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور سے وابستہ ہیں۔
کاظم علی نے شکوہ' جواب شکوہ کا ترجمہ ۱۹۶۵ء میں کیا اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر(۱۹۰۰ء۔ ۱۹۷۴ء) کی تحریک پر جنوری ۱۹۶۸ء میں پنجابی بک ڈپو' چھوکر کلاں ضلع گجرات کی طرف سے شائع کیا۔ (۹) کاظم علی نے کلام اقبال کو نہایت سادہ بنا دیا ہے۔ انہوں نے اقبال کی چند اور نظموں کو بھی پنجابی میں ڈھالا مگر یہ طبع نہ ہو سکیں۔
شکوہ کے پہلے بند کا ترجمہ ملاحظہ ہو (۱۰)

وادھا چھڈ کے گھاٹیاں راہ جاواں
روآں پچھے نوں' آکا وسار کیویں
رونا بلبل دا کنیں سن کے میں
پھل نئیں ' ہوواں چپ یار کیویں
گل کرن دا ہے بلکار مینوں
جھیڑا نال اے رب غفار مینوں

چودھری علی احمد گوندل

چودھری علی احمد گوندل مرحوم نے "ارمغانِ حجاز" کے فارسی کلام کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے جس کا عنوان اُنھوں نے "دِل دی آواز" رکھا ہے۔

علی احمد ضلع گجرات کے قصبہ شادیوال میں چودھری محمد دین کے گھر اگست ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ پرائمری مشن سکول شادیوال اور مڈل مشن سکول گجرات سے پاس کرنے کے بعد مشن پرائمری سکول شادیوال میں مدرس ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد پٹواری بھرتی ہوئے اور سروس کا زیادہ تر حصہ سرگودھا میں گزارا۔ سروس کے آخری چند سال محکمہ نہر گجرات میں ورنیکلر ہیڈ کلرک بھی رہے اور یہیں سے ۱۱۵گست ۱۹۵۲ء کو ریٹائر ہوئے۔

ارمغانِ حجاز کے حصہ فارسی کا پنجابی ترجمہ اُنھوں نے ۱۹۵۵ء میں مکمل کیا اور ۲۳ سال بعد ضیاء شمس پریس بھلوال سے شائع ہوا۔ چودھری صاحب نے اپنے پنجابی کلام کو "دِل دا ساز" کے عنوان سے ترتیب دے رکھا تھا مگر اس کی اشاعت سے قبل ہی ۱۱۸گست ۱۹۸۶ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے (۱۱)

ان کے ترجمہ سے ایک بند ملاحظہ ہو (۱۲)

اقبال

دلِ ما بیدلاں بردند و رفتند
مثالِ شعلہ افسردند و رفتند
بیا یک لحظہ با عاماں در آمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

علی احمد

لے گئے دِل ساڈے نوں بیدل لُٹ کے ہوگئے راہی
شعلے وانگوں بجھے نے دم گھٹ کے ہو گئے راہی
آؤ عاماں دے وچ رل کے چا کوئی جھٹ کٹو
خاص تساڈے پی پیالے سٹ کے ہوگئے راہی

اختر حسین شیخ

"اِقبال دا لشکارہ" اور "سلکھنی اکھ" کے مترجم و مؤلف اختر حسین شیخ کا تعلق گجرات کے مردم خیز قصبے جلالپور جٹاں سے ہے۔ آج کل لاھور میں رھائش پذیر ہیں۔

اختر حسین شیخ ۲۷ نومبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ پرائمری' مڈل اور میٹرک بالترتیب ایم بی پرائمری سکول دائم گنج امرتسر' اِسلامیہ ہائی سکول گجرات اور اِسلامیہ ہائی سکول جلالپور جٹاں سے پاس کی۔ ایئرفورس میں ملازم ہوئے اور ایسوسی ایٹ انجینئر کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۶۰ء میں پی اے ایف کی طرف سے ہائی پاور ریڈار الیکٹرانس میں اعلیٰ تعلیم کیلئے امریکہ بھیجے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں قبل آز وقت ریٹائرمنٹ لے کر دوبئ ایئرفورس میں ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۸۰ء میں فرانس گائیڈڈ میزائل سسٹم میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

قیام فرانس کے دوران کلام اِقبال کا پنجابی ترجمہ شروع کیا اور ۱۹۸۴ء میں' جب وہ دبئ میں تھے۔ "اِقبال دا لشکارہ" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اسی سال دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ اِس کے علاوہ شاعری اور طنز و مزاح پر بھی ان کی کتب شائع ہو چکی ہیں (۱۳)

(۱) "اِقبال دا لشکارہ" میں اِقبال کی طویل نظموں (شکوہ' جواب شکوہ' فلسفہ غم' والدہ مرحومہ کی یاد میں اور طلوع اِسلام) اور پندرہ منتخب غزلوں کا منظوم پنجابی ترجمہ شامل ہے۔

(۲) "سلکھنی اکھ" دسمبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ ۱۳۸ صفحات کی اِس کتاب میں اِقبال کے مشہور موضوعات مشاہدہ' کائنات' بیداری ملت' تصوف' عشق اور خودی وغیرہ) پر پنجابی زبان میں مقالات لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب پر انہیں "صدارتی اقبال ایوارڈ" بھی مل چکا ہے (۱۴)۔ اِن کے علاوہ بھی اِقبالیات پر کام کر چکے ہیں جو تاحال غیر مطبوعہ ہے۔

اختر حسین شیخ نے طویل نظموں اور غزلوں کے پنجابی ترجمہ کیلئے "ہیر وارث شاہ" کی بحر اِستعمال کی ہے۔ شکوہ کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔ (۱۵)

گھاٹے کھان دا کراں پیار کاہنوں ۔۔۔ گل فیدے دی بھل کے رہ جاواں
فکر کل کلاں دی چھڈ دیواں ۔۔۔ گئے ویلے دے پچھے ای پے جاواں
بھرڑ بلبلاں دے سارے چیخ چہاڑے ۔۔۔ کن لا کے سنا تے سہ جاواں
یارو میں وی کوئی آن پھل بوٹا ۔۔۔ دھڑ وٹ نچلا ای بہہ جاواں
کم آیا جے کسب کمال میرے ۔۔۔ چج شعراں دے حوصلہ واہ دتا
گلہ رب دا کراں ہزار توبہ ۔۔۔ کدے نال میں ریڑکا پادتا

ڈاکٹر آفتاب اصغر

اورنٹیل کالج لاہور کے شعبہ فارسی کے اُستاد' شاعر' مترجم اور محقق 'ڈاکٹر آفتاب اصغر بھی "گجراتی" ہیں۔ اُنہوں نے "ارمغان کشمیر" کے نام سے اِقبال کے کشمیر سے متعلق اُردو کلام کو منظوم فارسی کا روپ دیا ہے اور ساتھ ہی تاریخ کشمیر اور اِقبال کے کشمیر سے تعلق پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۲ء میں خانہ فرہنگ ایران لاہور نے شائع کی ہے۔ ۲۴۰ صفحات کی اِس کتاب کا پیش لفظ ماہرِ اِقبالیات جناب منور مرزا نے انگریزی میں لکھا ہے۔ تقریباً ۸۰ صفحات کی تعلیقات بھی شامل ہیں۔

اِقبال کے دو اشعار کے ترجمہ کی ایک مثال مِلاحظہ ہو

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینہ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوز ناک
مرد حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر

ڈاکٹر آفتاب اصغر کا ترجمہ مِلاحظہ ہو (۱۶)

تاکنوں کشمیر مقہور است و مجبور و فقیر
آنکہ در اہلِ نظر بوداست ایران صغیر
سینۂ افلاک آھی می کشید بس سوز ناک
مردِ حق چوں می شود مرعوب سلطان و امیر

اِس خدمت کے علاوہ ڈاکٹر صاحب ایران و پاکستان میں اِقبالیات پر شائع ہونیوالے مضامین کا اُردو ترجمہ کرکے فارسی میں اِقبال شناسی میں ہونے والی پیش رفت سے بھی اُردو خواں طبقہ کو روشناس کرتے رہتے ہیں اور علمی و اَدبی حلقوں میں فارسی کے سکالر کے علاوہ اِقبالیات کے بھی سنجیدہ محقق مانے جاتے ہیں۔ چند ترجمہ شدہ مضامین یہ ہیں

۱۔ ایران میں اِقبال شناسی کا پس منظر اَز اُستاد محیط طباطبائی
(اُردو ترجمہ مطبوعہ مجلّہ ضیاء بار گورنمنٹ کالج سرگودھا ۱۹۷۳ء)

۲۔ چند باتیں عصرِ جدید کے مفکر اور فلسفی اِقبال کے بارے میں از ضیاء الدین سجادی
(اُردو ترجمہ مطبوعہ راوی گورنمنٹ کالج لاہور صد سالہ اِقبال نمبر ۱۹۷۴ء)

۳۔ اقبال و تصوف (ڈاکٹر سید عبداللہ) اردو ترجمہ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین شمارہ ۲۔۱۳۳

کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی

گجرات کے نامور شاعر اور صحافی جناب تبسم قریشی اِقبال کے عاشق تھے۔ اُنہوں نے اِقبال کے مجموعۂ کلام "پیامِ مشرق" کے ایک حصے "لالۂ طور" کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا تھا۔

محمد رمضان ۱۳ جنوری ۱۸۹۹ء کو مولوی عبدالکریم قریشی کے گھر پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر فوج میں کلرک کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت میں حصہ لیا اور تحریک عدم تعاون میں ملازمت ترک کر دی۔ بعد میں منشی فاضل کیا اور نارمل سکول لالہ موسیٰ سے ٹریننگ حاصل کر کے درس و تدریس کی طرف آ گئے۔ زیادہ عرصہ وزیر آباد اور زمیندار سکول گجرات میں رہے۔ تبسم قریشی سر فضل علی کے قریبی ساتھی تھی اور زمیندار سکول اور کالج کے قیام میں اُنہوں نے شب و روز محنت کی وہ زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کے شعبہ نشرواشاعت کے انچارج تھے۔

۱۹۴۳ء میں تبسم نے فوج میں کمیشن حاصل کیا اور بطور کیپٹن ریٹائر ہوئے۔ تبسم نے اِقبال"، "غازی" اور "محبِّ کسان" نامی پرچے جاری کیے۔ فن شعر گوئی میں وحید الدین سلیم پانی پتی (۱۸۶۷ء۔ ۱۹۲۸ء) کے تلمیذ تھے اور اُردو، فارسی اور پنجابی کی جملہ اصنافِ سخن پر دسترس رکھتے تھے۔ آخری عمر میں ہومیو پیتھی طریقہ علاج سے دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہے اور آخر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو اِس فانی دُنیا سے کوچ کر گئے (۱۷)

تبسم کو اِقبال سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اور ان کی پوری زندگی اِقبال کی محبت سے عبارت تھی، اُنہوں نے اِقبال کی زندگی میں سب سے پہلے ان کے نام نامی پر ایک مجلہ جاری کیا جس کا نام "اِقبال" رکھا۔ پہلا پرچہ جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا اِس رسالے کے سرپرست نواب احمد یار خان آف لڈن تھے۔ تبسم نے اَپنے محلہ کا نام بھی اِقبال کی مناسبت سے "اِقبال گنج" رکھا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۳۳ء کو تبسم نے سر فضل علی کے ایماء پر ہفت روزہ "محب کسان" جاری کیا۔ اِس میں بھی اِقبالیات کا نمایاں حصہ ہوتا تھا۔ محب کسان کے بعد تبسم نے ایک اور رسالہ "غازی" ۱۹۵۸ء میں جاری کیا۔ یہ بھی ہفت روزہ تھا اور گجرات کے مقبول عام رسائل میں شمار ہوتا تھا۔ غازی کے تقریباً ہر پرچے کے سرورق پر کلام اِقبال یا کلام اِقبال کا پنجابی ترجمہ اَز تبسم شائع ہوتا تھا۔ اِقبال کا کلام (رباعیات) "تبرکات اِقبال" کے نام سے اور ترجمہ "تعلیمات اِقبال" کے نام سے چھپتا تھا۔ اور ساتھ اِقبال کے کسی شعر پر تبسم کی لکھی ہوئی تضمین بھی ہوتی تھی۔ غازی میں ملک کے نامور اہل قلم کے اِقبال پر

لکھے ہوئے مضامین و مقالات شائع ہوتے تھے۔

تبسم کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر احمد حسین قریشی بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء میں جب پانی پت میں مولانا حالی کی برسی منائی جا رہی تھی۔ وہاں مولانا حالی پر نظم کہنے کا مقابلہ ہوا۔ اِس موقع پر تبسم نے بھی نظم کہی اور پہلا انعام حاصل کیا۔ اِس تقریب میں اِقبال بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے تبسم کی نظم کی داد دی اور یوں تبسم کی اَپنے محبوب شاعر سے ملاقات ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا۔

شعر میری طرح کہ نہیں سکتا
حقہ پینے کا نہیں جس کو شعور

تبسم قریشی، اِقبال اور ظفر علی خاں کی طرح حقے کے رسیا تھے۔ ان کا یادگار شعر ہے۔

ظفر علی خاں، تبسم و اِقبال
علی بخشا! تیار ہے حقہ؟

تبسم نے شاعرِ مشرق کے حضور اُردو، فارسی میں ھدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایسی نظموں کی تعداد دو درجن سے زائد ہوگی۔ اُنہوں نے اَپنے فارسی مجموعہ کلام "مخانۂ دل" کا ایک باب حکیم الامت کے حضور خراجِ عقیدت کیلئے مخصوص رکھا ہے

"لالۂ طور کا ترجمہ"

تبسم نے پیامِ مشرق کے حصۂ اول "لالۂ طور" کا منظوم پنجابی ترجمہ شروع کیا تھا۔ اِس کا بیشتر حصہ "غازی" کے صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ تاہم یہ مکمل نہ ہو سکا۔ اِقبال کی ایک رباعی ہے

دِلا نارائے پروانہ تا کَی
نگیری شیوۂ مردانہ تا کَی
یکی خود را بہ سوز خویشتن سوز
طوافِ آتشِ بیگانہ تا کَی

تبسم قریشی نے یوں اِسے پنجابی میں ڈھالا ہے (۱۹)

بھنبٹ بن کے لبھدا پھرنا ایں کیوں توں اگ پرائی
مرداں والے پھڑ کجھ چالے، چھڈ کے ایہ گدائی
اک واری تے اپنی اگ وچ سڑ کے ویکھ جواناں
ہوراں دی ایس اگ دوا سے لے کد تک پھیرے بھائی؟

چند اور مترجمین

درج بالا حضرات نے کلام اقبال کے تراجم کا کام بڑے پیانے پر سرانجام دیا ہے۔ اِن میں اکثر کا کام کتابی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ درج ذیل حضرات نے اقبال کی چیدہ چیدہ غزلوں، نظموں کا پنجابی ترجمہ کیا ہے۔

(ا) منشی عبداللطیف گجراتی

پنجابی کے بزرگ شاعر، "جھلیاں سدھراں" اور "پھٹ اکھراں دے" کے مصنف منشی لطیف گجراتی (وفات ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ء) نے اقبال کی کچھ غزلوں اور نظموں کا ترجمہ کیا ہے "ماں کا خواب" (نظم) اور "ستاروں سے آگے....." (غزل) اِن میں شامل ہیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

انداز یہ ہے

اقبال

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

منشی لطیف (۲۰)

منزل تاریاں تیک نئیں تیری پرے انہاں توں ہور جہان وی نیں
ایتھے حد مک گئی تیرے پیار دی نئیں اجے ہور تیرے امتحان وی نیں

(۲) پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی

زمیندار کالج گجرات کے ہر دلعزیز اُستاد، وزیراعظم اَدبی ایوارڈ یافتہ اُردو، پنجابی اور فارسی کے شاعر اور "اڑتے ہوئے لمحے"۔ "ریت کی سیڑھیاں" اور "کرنوں کی تلوار" کے خالق جناب سیف الرحمٰن سیفی نے بھی اقبال کی کچھ غزلوں اور نظموں کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے جو تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ وہ لفظ بہ لفظ ترجمے کے قائل نہیں اور مفہوم کو دوسری زبان کا لبادہ پہنانے کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل پیغام اقبال کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ "خدا کا پیغام فرشتوں کے نام" سے چند شعر (۲۱)

شاناں شوکتاں جھوٹھیاں کوڑیاں جے
سبھے محل اثاریاں ڈھا دیئو
جتھوں ٹوڑا کسان نوں نہ لبھے
اوس کھیت نوں تیلڑی لا دیئو
بادشاہی زمانے توں دفع ہوئی
بندے میر وزیر بنا دیئو

(۳) خموش چیچیانوی

پنجابی کے ابھرتے ہوئے شاعر جناب مظفر علی خموش چیچیانوی نے بھی اِقبال کی چند نظموں ' غزلوں اور اشعار کا پنجابی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ اُنہوں نے اِقبال کے مختلف اشعار کا پنجابی ترجمہ ایک مسلسل غزل کی صورت میں کیا ہے۔ "محبت مجھے اِن جوانوں سے ہے۔" الآخر۔ کا ترجمہ بلاحظہ ہو (۲۲)

میرے دل دے واسی اوہوا گھبرو چھیل چھبیلے نیں
زمیں تے جو رہ کے سٹن ڈوراں ول آسماناں دے

(۴) منصور احمد خالد

"پھلاں بھری چنگیر" کے مصنف اور اُردو پنجابی کے شاعر پروفیسر سید منصور احمد خالد نے بھی اِقبال کی کچھ غزلوں کے تراجم پنجابی نظم میں کئے ہیں۔ ایک غزل "اگر کج رو ہیں انجم ----" کا ترجمہ ماہنامہ "پنجابی زبان۔ لاہور" ' اِقبال نمبر بابت اپریل مئی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔

(۵) نظام الدین مخمور توکلی

شادیوال (گجرات) سے تعلق رکھنے والے پنجابی شاعر جناب نظام الدین مخمور توکلی بھی مترجمین اِقبال میں شامل ہیں۔ اقبال کی ایک نظم "کبر و ناز" کا توکلی صاحب نے پنجابی ترجمہ کیا جو ماہنامہ پنجابی زبان لاہور کے اِقبال نمبر ۱۹۷۴ء (مذکورہ بالا) میں شائع ہوا تھا۔

تصویری ترجمانی

چودھری محمد احسن علیگ

اِقبال کے کلام کو تصویری خاکوں اور کارٹونوں کے دِلکش اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کا اعزاز رکھنے والے چودھری محمد احسن علیگ خود کو اِقبال کا معنوی مرید کہتے تھے۔

چودھری محمد احسن منگووال غربی ضلع گجرات کے ایک معزز گھرانے میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ زمیندار سکول گجرات اور علی گڑھ سے بی اے ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی اور تحصیلدار مقرر ہوئے۔ تحریک پاکستان میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ خضر حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ جیل میں بھی رہے اور ملازمت سے بھی برطرف کیے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ملازمت پر بحال کیے گئے تاہم ۱۹۵۰ء میں اُنہوں نے خود ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔

۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۸ء تک ایم پی اے اور پارلیمانی سیکرٹری رہے۔ صدر ایوب کے خلاف محترمہ فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ عمر کے آخری ۲۵ سال چودھری صاحب نے اَپنے ذوق کی آبیاری کیلئے وقف رکھے اور ۱۹ اگست ۱۹۸۹ء کو وفات پائی

چودھری محمد احسن نے اِقبال کا عمیق مطالعہ کیا اور ان کی تعلیمات سے بھرپور اِستفادہ کیا اور اِقبال کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زِندگی بسر کی۔ اُنہیں کلام اِقبال سے عشق تھا۔ اُنہوں نے ۱۹۴۶ء سے اِقبال کے اشعار کو تصویری خاکوں (کارٹونز) کی صورت میں پیش کرنا شروع کیا۔ ان کی اِس کوشش کو پسند کیا گیا اور ان کے بنائے ہوئے کارٹونز کی وقتاً فوقتاً نمائش بھی ہوتی رہی اور یہ خاکے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک مختلف رسائل و جرائد کی زینت بھی بنتے رہے۔ ۱۹۷۰ء میں چودھری صاحب نے اُنہیں ترتیب دیا اور "عکاسیاتِ احسن اَز کلامِ اِقبال" کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیا۔ اِس کتاب کے ۱۶۲ صفحات کو ۱۰ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں شاعر، کشمیر، فرنگ، مرشدانِ خود بیں، تقدیرِ امم، محنت و سرمایہ وغیرہ شامل ہیں۔ خاکوں کی تعداد ۱۲۰ کے قریب ہے۔ ہر خاکے کے ساتھ تشریح و توضیح بھی دی گئی ہے اور جابجا مضامین کے ذریعے پس منظر سے بھی واقفیت دلائی گئی ہے اِس کتاب کا پیش لفظ جسٹس ایس اے رحمٰن نے لکھا اور تاثرات لکھنے والوں میں ڈاکٹر جاوید اِقبال، پروفیسر غلام سرور خان اور سردار محمد اِقبال مؤکل شامل ہیں۔

عکاسیاتِ احسن کی پذیرائی نے چودھری صاحب کو مزید کام کرنے کا شوق دلایا اور انہوں نے متفرق اشعار کی بجائے ایک کتاب "جاوید نامہ" کے اشعار کو منتخب کیا اور تصویری خاکے بنانے شروع کیے۔ کیوں کہ اقبال نے لکھا تھا۔

"میری رائے میں میری کتابوں میں سے صرف جاوید نامہ ایک ایسی کتاب ہے جس پر مصور طبع آزمائی کرے تو دُنیا میں نام پیدا کر سکتا ہے۔ مگر اس کیلئے پوری مہارتِ فن کے علاوہ الہامِ الٰہی اور صرفِ کثیر کی ضرورت ہے۔" (۲۳)

چنانچہ چودھری صاحب نے دوسری کتاب "اشعارِ اقبال کی تصویری جھلکیاں" اپنی وفات سے چند ماہ قبل شائع کی۔ اس خوبصورت کتاب میں جاوید نامہ کے منتخب اشعار پر چودھری صاحب کے ۳۳ دلکش خاکے ہیں۔ جن کے ساتھ تین زبانوں میں تراجم ہیں۔ اُردو ترجمہ مفتی حمید اللہ کا ہے۔ پنجابی ترجمہ شریف کنجاہی کا اور انگریزی ترجمہ کرنے والے صاحب کا نام صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ کتاب کی ضخامت ۷۲ صفحات ہے۔

اس منفرد انداز کے علاوہ چودھری صاحب نے اقبالیات پر بہت سے بلند پایہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ جو مختلف جرائد و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے مثلاً

روزگارِ فقیر مطبوعہ ہفت روزہ قندیل لاہور بابت ۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء

غالب اور اقبال مطبوعہ ہفت روزہ قندیل لاہور بابت ۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء

حضرتِ علامہ کا نظریۂ شعر و شاعری۔ مطبوعہ شاہین۔ زمیندار کالج گجرات دسمبر ۱۹۶۷ء

نوائے وقت میں چودھری صاحب کے کالم بھی ان کی سیاسی بالغ نظری اور جذبہ حب الوطنی کا ثبوت ہوا کرتے تھے۔

حوالہ جات و حواشی

(۱) شکوہ، جواب شکوہ منظوم پنجابی ترجمہ از احمد حسین قریشی۔ پنجابی ادبی بورڈ لاہور ۱۹۹۳ء صفحہ ۶
(۲) جاوید نامہ۔ منظوم پنجابی ترجمہ از شریف کنجاہی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۰۵
(۳) خفتگان خاک گجرات از ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ۔ سلیچ پبلیکیشنز۔ گجرات ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۹۶
(۴) دی ڈیولز کانفرنس (انگریزی) اُردو ہاؤس بک سیلرز گجرات ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۵۰
(۵) مکتوب پروفیسر انور حسین سید (فرزند پروفیسر سید اکبر علی شاہ) بنام راقم مورخہ ۶ جنوری ۱۹۹۸ء
(۶) دی راڈ آف موسس (انگریزی) اقبال اکادمی لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۶
(۷) خفتگان خاک گجرات صفحہ ۶۵
(۸) اشعار اقبال کی تصویری جھلکیاں۔ از چودھری محمد احسن لاہور ۱۹۸۹ء صفحہ ۴، ۵
(۹) کاظم علی صاحب نے اپنے حالات خود ایک ملاقات میں لکھوائے تھے
(۱۰) شکوہ۔ جواب شکوہ۔ منظوم پنجابی ترجمہ از ماسٹر کاظم علی۔ پنجابی بک ڈپو چھوکر کلاں گجرات: ۱۹۶۸ء صفحہ ۵
(۱۱) چودھری علی احمد کے حالات اِن کے صاحبزادے محمد اشرف سے ضیاء اللہ صاحب آف شادیوال کی معرفت حاصل ہوئے
(۱۲) "دل دی آواز"۔ از علی احمد گوندل: ضیاء شمس پریس بھلوال۔ ۱۹۷۸ء صفحہ ۷
(۱۳) شیخ صاحب نے اپنے حالات ایک ملاقات میں لکھوائے
(۱۴) یہ ایوارڈ انہیں ۹ نومبر ۱۹۹۷ء کو ملا۔
(۱۵) اقبال دا لشکارہ۔ از اختر حسین شیخ لاہور۔ ۱۹۸۴ء صفحہ ۱۷
(۱۶) ارمغان کشمیر از ڈاکٹر آفتاب اصغر لاہور ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۲۳
(۱۷) خفتگان خاک گجرات۔ صفحہ ۲۱۵
(۱۸) خفتگان خاک لاہور۔ از پروفیسر محمد اسلم۔ آف پاکستان ریسرچ سوسائٹی لاہور ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۳
(۱۹) یہ ترجمہ 'غازی' گجرات کے کسی شمارے سے نوٹ کیا۔ مکمل حوالہ محفوظ نہ رہ سکا
(۲۰) شاہین اقبال نمبر ۱۹۷۸ء مجلّہ زمیندار کالج گجرات صفحہ ۲۳
(۲۱) یہ ترجمہ سیفی صاحب نے خود فراہم کیا
(۲۲) یہ ترجمہ خموش صاحب نے خود فراہم کیا
(۲۳) مکتوب اقبال بنام ضرار احمد کاظمی محررہ ۲۵ جون ۱۹۳۵ء مشمولہ اقبال نامہ (حصہ اول) صفحہ ۳۰۴

حصہ دوم: محققین اقبال

- شیخ عطاء اللہ
- پروفیسر محمد فرمان
- پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
- سید نور محمد قادری
- ڈاکٹر مظفر حسن ملک
- ڈاکٹر سید اسعد گیلانی
- مولوی محمد چراغ
- حکیم آفتاب احمد قرشی
- صفدر میر
- مفتی اقتدار احمد نعیمی
- سید روح الامین
- پروفیسر احسان اکبر
- پروفیسر عزیز احمد چودھری
- ھاجرہ خاتون خان
- مضامین و مقالات لکھنے والے

تحقیق اِقبال کا اجمالی خاکہ

گجرات کے اہلِ قلم نے اِقبال کے افکار و نظریات پر جو کتب لکھی ہیں انکی فہرست درج ذیل ہے۔ یہ کتب (سوائے آخری) چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ کئی کتب منتظرِ اشاعت ہیں۔ صاحبِ کتاب محققین اور اہم مقالہ نگار حضرات کا مختصر تذکرہ دیا جارہا ہے۔

(۱)	اِقبالنامہ (حصہ اول)	پروفیسر شیخ عطاء اللہ
(۲)	اِقبالنامہ (حصہ دوم)	پروفیسر شیخ عطاء اللہ
(۳)	اِقبال اور شاہان اِسلام	پروفیسر شیخ عطاء اللہ
(۴)	اِقبال اور تصوف	محمد فرمان
(۵)	اِقبال اور منکرینِ حدیث	محمد فرمان
(۶)	اطرافِ اِقبال	پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
(۷)	دائرہ معارفِ اِقبال	پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
(۸)	اِقبال ایک تحقیقی مطالعہ	پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
(۹)	اِقبال اور نئی نسل	پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
(۱۰)	اِقبال اور مسلم مفکرین	پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر
(۱۱)	میلاد شریف اور علامہ اِقبال	سید نور محمد قادری
(۱۲)	اِقبال کا آخری معرکہ	سید نور محمد قادری
(۱۳)	علامہ اِقبال کے دینی و سیاسی افکار	سید نور محمد قادری
(۱۴)	اِقبال اور ثقافت	ڈاکٹر مظفر حسن ملک
(۱۵)	اِقبال، قائداعظم، مودودی اور تشکیل پاکستان	سید اسعد گیلانی
(۱۶)	اِقبال، دارالسلام اور مودودی	سید اسعد گیلانی
(۱۷)	تصوراتِ اِقبال	سید اسعد گیلانی
(۱۸)	تفہیم افکارِ اِقبال (نصابی کتاب کی شرح)	عبدالجلیل نجفی
(۱۹)	شرح آئینۂ عجم (نصابی کتاب کی شرح)	مولوی محمد چراغ جلالپوری
(۲۰)	اقبالز فلاسفی آف لائف (انگریزی)	ڈاکٹر ایم ایس ناموس
(۲۱)	اِقبال اور عالم اِسلام	حکیم آفتاب احمد قرشی
(۲۲)	نظریۂ پاکستان اور علامہ اِقبال	حکیم آفتاب احمد قرشی
(۲۳)	اقبال۔ دی پروگریسو (انگریزی)	صفدر میر
(۲۴)	تنقیداتِ اقتدار بر نظریاتِ اِقبال	مفتی اقتدار احمد نعیمی
(۲۵)	سلکھنی اکھ (پنجابی مقالات)	اختر حسین شیخ

(۲۶)	پانچ دریا (۵ اخباری کالم)	سید روح الامین
(۲۷)	اِقبالیات (حصہ اول - مقالات)	احسان اکبر
(۲۸)	اقبال - فکر و فلسفہ	احسان اکبر
(۲۹)	قولِ اقبال (اقبال کی تحریروں سے انتخاب)	پروفیسر عزیز احمد چودھری
(۳۰)	اردو شاعری پر اقبال کے اثرات	ھاجرہ خاتون خان

پروفیسر شیخ عطاء اللہ

پروفیسر شیخ عطاء اللہ، اقبال کے خطوط مرتب کرنے والے پہلے دو تین اصحاب میں سے ایک ہیں۔ اور ان کا مرتب کردہ "اقبال نامہ" (۲ جلدیں) اقبالیات کے بنیادی ماخذات سے ہے۔

(۱) "اقبال نامہ" حصہ اول: لاہور سے، ۱۹۴۵ء میں شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۵۰۶ ہے جس میں سے ۳۲ صفحات دیباچہ از مرتب، مقدمہ از حبیب الرحمٰن خان شیروانی انتساب بنام شمس العلماء مولانا سید میر حسن، اور عرض ناشر پر مشتمل ہیں۔ اس مجموعہ میں ۵۲ حضرات و خواتین کے نام ۲۶۵ خطوط شامل ہیں (۱) یہ مجموعہ "ادارہ اقبال" کے حوالے سے شائع ہوا جو ان افراد پر مشتمل تھا: سر شیخ عبدالقادر سرپرست، سید اکبر علی خان، صدر، ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ، نائب صدر اور شیخ عطاء اللہ ناظم"۔

(۲) "اقبالنامہ۔ مجموعہ مکاتیب اقبال" حصہ دوم: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۴۵۲ ہے جن میں سے ۸۳ صفحات پر مرتب کا لکھا ہوا دیباچہ پھیلا ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ۴۳ اشخاص کے نام ۱۸۸ خطوط دیئے گئے ہیں کچھ مکتوب الیھم کے نام رہ گئے ہیں کتابت اور ترتیب کی بھی کئی غلطیاں ہیں۔

(۳) "اقبال اور شاہان اسلام"۔ سلسلہ ادارہ علمیہ اسلامیہ کالج چنیوٹ: ۱۹۵۸ء صفحات ۵۵ یہ ایک مقالہ تھا جو ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو یوم اقبال پر گورنمنٹ کالج سرگودھا میں شیخ صاحب نے پڑھا۔ اس میں اورنگ زیب عالمگیر، ٹیپو سلطان، عبدالعزیز ابن سعود، نادر خان، بابر وغیرہ کے متعلق اقبال کے خیالات پر بحث تھی۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے "روایاتِ اقبال" مرتب کرنے میں عبداللہ چغتائی مرحوم کی بھرپور مدد کی تھی۔ اس سلسلے میں بزم اقبال کی طرف سے بنائی جانے والی کمیٹی میں بھی وہ شامل تھے شیخ صاحب کے مضامین و مقالات بھی مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے (۳)

۱۔ نسب و وطن کا اسلامی تخیل بزبانِ اقبال۔۔ علی گڑھ میگزین اقبال نمبر اپریل ۱۹۳۸ء

۲۔ اقبال اور عشقِ رسول ﷺ۔۔۔ علی گڑھ میگزین اقبال نمبر، اپریل ۱۹۳۸ء

پروفیسر محمد فرمان

پروفیسر محمد فرمان' اِقبال پر اپنی اہم کتاب "اِقبال اور تصوف" کی وجہ سے اِقبالیات میں پہچانے جاتے ہیں۔

وہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ضلع ہزارہ کے ایک قصبے "غازی" میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں اِسلامیہ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کیا۔ ۱۹۵۱ء میں زمیندار کالج گجرات میں اُردو کے لیکچرار مقرر ہوئے اور یہیں مستقلاً رہنے لگے۔ اِسی کالج میں ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے پرنسپل کے عہدے تک پہنچے۔ نومبر ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۸ء تک زمیندا کالج کے پرنسپل رہے پھر گورنمنٹ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ مگر جلد ہی ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو رحلت فرما گئے اور آپنے آبائی قصبے "غازی" میں دفن ہوئے۔ (۴)

(۱) فرمان صاحب کو زمانہ طالب علمی سے اِقبال سے لگاؤ تھا چنانچہ ایم اے میں اُنہوں نے "اِقبال کا مردِ مومن" کے موضوع پر ۶۰ صفحات کا مقالہ لکھا تھا۔

(۲) "اِقبال اور تصوف" کے موضوع پر آپ کی کتاب ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اِسے بزمِ اِقبال لاہور نے شائع کیا تھا اور اِس کے ۱۶۱ صفحے تھے۔ اَب تک اِس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بھارت میں تاج پبلشنگ کمپنی دھلی نے بھی اِسے شائع کیا ہے یہ ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں طبع ہوا اور اِس کی ضخامت ۲۰۰ صفحات تھی۔ تصوف کے بارے میں اِقبال کے نظریات پر سب سے پہلے لکھی جانے والی کتب میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

(۳) "اِقبال اور منکرین حدیث" :۔ آپ کی دوسری کتاب تھی۔ یہ ۱۹۶۳ء میں مکتبہ مجددیہ گجرات نے ۲۳۸ صفحات کی ضخامت کیساتھ شائع کی۔

(۴) پروفیسر محمد فرمان نے پی ایچ ڈی کیلئے "اِقبالیاتی اَدب کا جائزہ" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نگران تھے۔ مگر یہ مقابلہ بوجوہ منظور نہ ہو سکا۔ (۵)

اِقبالیات پر فرمان صاحب کے مضامین و مقالات بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے ان کا ایک مقالہ "اِقبال اور آرٹ" کے عنوان سے مجلّہ "اِقبال" بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا پھر اِس کی اہمیت کے پیش نظر گوہر نوشاہی نے اِسے "مطالعہ اِقبال" میں بھی شامل کیا۔ کئی مضامین اِقبالیات' شاہین (مجلّہ زمیندار کالج) میں شائع ہوئے۔

پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر

ملک حسن اختر کا نام اُردو اَدب اور اقبالیات میں محتاج تعارف نہیں۔ اقبال پر کئی تحقیقی کتب کے مؤلف ہیں۔

ملک حسن اختر یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو نوشہرہ خواجگان ضلع گجرات میں ملک کرم حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک اور زمیندار کالج سے بی اے کے بعد ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اُردو کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اِسی سال محکمہ تعلیم میں آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور، مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں بطور لیکچرر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک ڈپٹی ڈائریکٹر لائبریریز (پنجاب) رہے۔ ۱۹۸۸ء تک مرے کالج سیالکوٹ اور پھر وفات (۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء) تک گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں بطور پروفیسر اُردو تعینات رہے (۶)

ڈاکٹر حسن اختر ملک نے اُردو اَدب میں ۲۰ کے لگ بھگ بلند پایہ تحقیقی کتب کا اضافہ کیا ہے۔ افسوس یہ جانفشاں محقق اپنی تحقیقی سرگرمیوں کے دور عروج میں اِس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ ڈاکٹر حسن اختر ملک نے اِقبال پر درج ذیل کتب لکھی ہیں:

۱۔ اطرافِ اِقبال۔ مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۷۲ء۔ صفحات ۳۶۴
انڈیا میں اعتقاد پبلشنگ ھاؤس دہلی۔ ۱۹۷۶ء

۲۔ دائرہ معارفِ اِقبال۔ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء
(یہ کتاب اِقبال پر ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہے)

۳۔ اِقبال ایک تحقیقی مطالعہ۔ یونیورسل بکس لاہور، ۱۹۸۸ء صفحات ۲۴۸

۴۔ اِقبال اور نئی نسل: نذیر سنز لاہور، ۱۹۸۸ء صفحات ۱۱۲

۵۔ اِقبال اور مسلم مفکرین۔ فیروز سنز لاہور ۱۹۹۴ء (بعد از وفات)

۶۔ اِقبال پنجاب گزٹ میں۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کی وجہ سے ابھی تک شائع نہیں ہو سکی

اِقبالیات پر متعدد مقالات بھی رقم کیے مثلاً

۱۔ اِقبال اور الجیلی۔ مطبوعہ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی نومبر ۱۹۷۷ء

۲۔ اِقبال اور ابنِ خلدون۔ "اِقبال ۸۴" مرتبہ وحید عشرت

۳۔ علامہ اِقبال کا سلسلۂ ملازمت۔ اِقبال ریویو جنوری، ۱۹۸۵ء

سید نور محمد قادری

سید نور محمد قادری اقبال کی سوانح اور افکار ' ہر دو پر گہری نظر رکھنے والے محقق تھے انہوں نے اقبالیات کو تین عدد تحقیقی کتابوں کا تحفہ دیا۔

سید نور محمد چک نمبر ۱۵ شمالی تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (اب ضلع منڈی بہاؤ الدین) میں مئی ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ مروجہ اسلامی کتب کی تعلیم اپنے والد ماجد سید محمد عبد اللہ قادری سے حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں میٹرک پاس کیا اور اسی سال صاحبزادہ محبوب عالم (آوان شریف) کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ قادری صاحب نے اپنی ذاتی محنت اور ریاضت سے علم و ادب میں بلند مقام حاصل کیا اُن کے خاندان کے علامہ اقبال کے خاندان سے قدیمی مراسم ہیں۔ ان کے دادا سید چراغ شاہ ' علامہ کے والد کے دوستوں میں سے تھے اور سیالکوٹ میں کشمیری محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے والد سید عبد اللہ شاہ ' اقبال کے برادر بزرگ کے ہم محلہ و ہمعصر تھے۔ ان کے چچا سید ظہور اللہ شاہ علامہ کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ سب لوگ قاضی سلطان محمود کے ارادتمند تھے اور شیخ نور محمد بھی انہی کے فیضیافتہ تھے (۷) سید نور محمد نے نومبر ۱۹۹۶ء میں رحلت فرمائی۔

سید نور محمد نے اقبالیات میں درج ذیل کام کیے۔

۱۔ "اقبال کا آخری معرکہ":۔ مطبوعہ رضا پبلشرز لاہور ۱۹۷۹ء صفحات ۱۳۶
یہ کتاب اقبال اور حسین احمد مدنی کے درمیان نظریہ قومیت و وطنیت کی بحث پر مبنی ہے

۲۔ اقبال کے دینی و سیاسی افکار: زمیندار ایجوکیشنل ایسوسی ایشن گجرات ' ۱۹۸۲ء صفحات ۲۸

۳۔ میلاد شریف اور علامہ اقبال: مرکزی مکتبہ واہ کینٹ ۱۹۸۷ء صفحات ۴۰

قادری صاحب کئی اہم مقالات بھی لکھ چکے ہیں مثلاً

۱ اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔ ماہنامہ فیضان۔ فیصل آباد ' جون جولائی ۱۹۷۸ء

۲ سلسلۂ قادریہ میں اقبال کی بیعت۔ ماہنامہ فیضان۔ محولہ بالا

۳ علامہ اقبال کی عقیدت صوفیائے عظام سے: سہ ماہی 'اقبال' مارچ ۱۹۸۴ء

۴ اقبال اور طرزِ حکومت: ہفت روزہ استقلال لاہور ۷ مارچ ۱۹۸۴ء

۵ اقبال اور تحریکِ ترکِ موالات: روزنامہ نوائے وقت لاہور ۸ مئی ۱۹۸۰ء

۶ اقبال اور ابنِ عربی: سہ ماہی فنون لاہور۔ اپریل جون ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر مظفر حسن ملک

اِقبال شناسی میں ایک معتبر مقام کے مالک ڈاکٹر مظفر حسن ملک اپنی کتاب بعنوان "اِقبال اور ثقافت" کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔

ملک صاحب ۱۴ جون ۱۹۲۰ء کو ملک باغ علی کے گھر تحصیل کھاریاں کے گاؤں چک بدھو میں پیدا ہوئے۔ زمیندار کالج سے بی اے کیا۔ ایم اے اُردو کے بعد "اُردو مرثیہ میں مرزا دبیر کا مقام" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر فل برائیٹس یونیورسٹی آف امریکہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ لندن یونیورسٹی میں ریسرچ فیلو بھی رہے۔ درس نظامی کے بھی فاضل ہیں۔ عمر عزیز کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیم میں گزرا۔ ہیڈ ماسٹر، پروفیسر اور ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ڈویژنل ڈویلپمنٹ آفیسر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ مختلف موضوعات پر نصف درجن سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ Anthropology پر بھی خوب لکھتے ہیں۔

اِقبالیات پر دو کتب اور متعدد مضامین و مقالات لکھ چکے ہیں۔ کتابوں میں

۱۔ اِقبال اور ثقافت۔ اِقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶ء ۲۴۰ صفحات

۲۔ اِقبال اور معرکۂ خیر و شر: یہ کتاب سالہا سال سے اشاعت کی منتظر ایک سرکاری ادارے میں پڑی ہے۔

مضامین و مقالات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

۱۔ اِقبال بحیثیت مرثیہ گو۔ مطبوعہ ہفت روزہ وفاق لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۶۱ء

۲۔ اِقبال فکر و عمل کا اتحاد۔ سہ ماہی صحیفہ لاہور۔ جولائی ستمبر ۱۹۸۴ء

۳۔ مکارمِ اخلاق اور اِقبال۔ مشمولہ 'اِقبال ۸۴' مرتبہ وحید عشرت

۴۔ اِقبال اور نظریۂ پاکستان کا تجزیہ۔ سہ ماہی اِقبالیات۔ اکتوبر دسمبر ۱۹۸۵ء

۵۔ اِقبال اور مزدور۔ سہ ماہی صحیفہ لاہور اِقبال نمبر ۱۹۸۷ء

۶۔ اِقبال اور گجرات۔ سہ ماہی اِقبالیات۔ جنوری مارچ ۱۹۸۸ء

۷۔ سردار قیوم، ڈاکٹر جاوید اِقبال اور علامہ اِقبال۔ نوائے وقت لاہور ۱۳، ۱۴، ۱۵ فروری ۸۸ء

۸۔ انفرادی تہذیب اقبال کی نظر میں۔ مشمولہ اقبالیات جولائی، ستمبر ۱۹۸۶ء

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی

موجودہ دور میں ڈاکٹر سید اسعد گیلانی اِسلامی سیاسیات پر لکھنے والوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

وہ تحصیل کھاریاں کے گاؤں آچھ میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید غلام رسول گیلانی تھا۔ میٹرک کے بعد دہلی امپیریل سیکٹریٹ میں ملازم رہے۔ کچھ عرصہ بعد ملازمت کو خیرباد کہہ کر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔ ایوب دور میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا پھر ایم اے سیاسیات اور ایم اے اُردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سیاسیات میں پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ جماعت اِسلامی لاہور اور صوبہ پنجاب کے امیر کی حیثیت سے بھی خدمات بجالاتے رہے۔ اپنی جماعت کے انتظامی اور علمی امور میں بہت سرگرم تھے۔ ان کا قلم تمام عمر مثبت فکر اور اِسلامی بھائی چارے کا پرچار کرتا رہا۔ اِقبال، قائداعظم اور مولانا مودودی ان کے سیاسی و فکری آئیڈیل تھے۔ (۹) ڈاکٹر گیلانی نے ۳، اپریل ۱۹۹۲ء بمطابق ۲۹ رمضان ۱۴۱۲ھ جمعہ الوداع کے مبارک روز داعیٔ حق کو لبیک کہا۔

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی نے ۵۵ کے لگ بھگ کتب تحریر و تالیف کیں۔ اِقبالیات سے متعلقہ ان کی درج ذیل کتب یادگار ہیں۔

۱۔ اِقبال، قائداعظم، مودودی اور تشکیلِ پاکستان: مکتبہ تعمیرِ فکر، لاہور ۱۹۷۷ء

۲۔ اِقبال، دارالاسلام اور مودودی: اسلامی اکادمی لاہور ۱۹۷۸ء

۳۔ تصوراتِ اقبال: فیروز سنز لاہور ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر گیلانی کے لکھے ہوئے مضامین میں سے اقبالیات سے متعلقہ چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ تصورِ پاکستان اور اقبال۔ سیارہ۔ لاہور اکتوبر نومبر ۱۹۷۶ء

۲۔ اقبال اور دارالاسلام کی تعلیمی سکیم۔ سیارہ۔ لاہور فروری مارچ ۱۹۷۸ء

۳۔ اقبال کا مردِ مومن اور مودودی کا مردِ صالح۔ سیارہ۔ لاہور اپریل مئی ۱۹۸۰ء

مولوی محمد چراغ

مولوی محمد چراغ جلالپوری برادر خورد مولوی نجف علی عاصی ' اقبال کے ہمعصر تھے ۔ دار السلطنت کابل میں مدرس درجہ اول رہے ۔ اقبال نے میٹرک کے لئے فارسی نظم و نثر کا انتخاب " آئینۂ عجم " کے نام سے مرتب کیا تھا ۔ مولوی محمد چراغ نے اسکی شرح لکھی تھی ۔ یہ کتاب ۱۹۲۵ء کے قریب میں ۲۰۴ صفحات کیساتھ لاہور سے شائع ہوئی تھی ۔ اس پر نجف علی عاصی ' قاضی فضل حق اور مولانا اصغر علی روحی کی تقاریظ تھیں ۔

حکیم آفتاب احمد قرشی

حکیم آفتاب احمد قرشی (یکم جنوری ۱۹۲۵ ۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۱ء) ابن حکیم محمد حسن قرشی نے " اقبال اور عالم اسلام " لاہور س ۔ ن (۳۰ صفحات) " نظریہ پاکستان اور علامہ اقبال " (خطبہ الہ آباد کے اہم اقتباسات کا اردو ترجمہ ' لاہور س ۔ ن ۲۷ صفحات) نامی کتابچے لکھے ۔ علاوہ ازیں اقبالیات پر ان کے مضامین و مقالات بھی شائع ہوتے رہے ۔ مثلاً " اقبال اور اتحاد عالم اسلامی " (مطبوعہ روزنامہ جسارت کراچی ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء) " اقبال کا پیغام ۔ کسان کے نام " (مطبوعہ " علامہ اقبال اپنوں کی نظر میں " مرتبہ مصباح الحق صدیقی لاہور ۱۹۷۷ء)

صفدر میر

محمد صفدر میر (پ ۱۹۲۲ء) بھی گجرات کے صدارتی ادبی ایوارڈ یافتہ ادیب اور دانش ور ہیں ۔ دیگر کی کتب کے علاوہ اقبال پر ان کی کتاب Iqbal - The progressive چند برس قبل شائع ہوئی ہے ۔ اقبالیات پر ان کے مقالات و مضامین بھی گاہے بگاہے شائع ہوتے رہتے ہیں مثلاً " اقبال اور سوشلزم " (مطبوعہ " اقبال اور سوشلزم " مرتبہ محمد حنیف شاہد لاہور ۱۹۷۰ء)

مفتی اقتدار احمد نعیمی

اقتدار احمد ' مفتی احمد یار خان نعیمی کے صاحبزادے ہیں ۔ ۱۹۸۶ء میں ان کی کتاب " تنقیدات اقتدار بر نظریات اقبال " شائع ہوئی ۔ ۴۸ صفحات کے اس کتابچے میں وہی گھسے پٹے اعتراضات دہرائے گئے ہیں جو اقبال کی زندگی میں بھی ان پر ہوتے رہے ۔

سید روح الامین

سید روح الامین (پ ۱۹۶۵ء) بوکن ضلع گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں ان کی کتاب "پانچ دریا" شائع ہوئی۔ یہ کتاب پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو ناروے میں سردار عبدالقیوم اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی بحث کے رد عمل میں لکھے گئے اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

پروفیسر احسان اکبر

احسان اکبر (پ ۴ جنوری ۱۹۳۸ء) بن محمد اکبر نوشہرہ خواجگان، گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج سیٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے شعبہ اردو کے ریٹائرڈ صدر اور کئی کتب کے مصنف ہیں۔ اقبالیات پر ان کی دو کتابیں "اقبالیات حصہ اول" اور "اقبال۔ فکر و فلسفہ" شائع ہو چکی ہیں یہ مضامین و مقالات پر مبنی ہیں۔

پروفیسر عزیز احمد چوہدری

پروفیسر عزیز احمد (پ ۱۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء) کھاریاں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آجکل قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں تاریخ کے استاد ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتاب "قولِ اقبال" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی نثر سے منتخب کردہ اقوال پر مبنی ہے۔

ھاجرہ خاتون خان

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین فوارہ چوک کی سابق پرنسپل محترمہ ھاجرہ خاتون خان نے ایم اے اردو (پنجاب یونیورسٹی) میں "اردو شاعری پر اقبال کے اثرات" کے موضوع پر ۱۶۶ صفحات کا مقالہ لکھا جو تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ مذکورہ کالج کے مجلہ "رخشاں" کا اقبال نمبر ۱۹۷۸ء میں انہی کے دور سرپرستی میں شائع ہوا جس میں ان کا مقالہ "اقبال اور نژاد نو" شامل تھا۔

مضامین و مقالات لکھنے والے

شیر محمد اختر

شیر محمد اختر (۱۹۰۷-۱۹۷۴ء) نفسیات پر لکھنے والوں میں اہم مقام رکھتے تھے۔ "قندیل"

کے مدیر رہے۔ اقبالیات پر ان کے کئی مضامین شائع ہوئے مثلاً "اقبال کا فلسفہ خودی" (مطبوعہ "احسان" "اقبال نمبر" ۲۷ جون ۱۹۳۸ء) اور "ایک دھندلی سی تصویر" (مطبوعہ قندیل ۲۱ اپریل ۱۹۴۹ء)

پروفیسر محمد سرور

پروفیسر محمد سرور جامعی (۱۹۰۶ - ۱۹۸۳) سیکریالی گجرات کے سپوت تھے۔ جامعہ ملیہ میں تعلیم پائی۔ شاہ ولی اللہ اور عبید اللہ سندھی پر کئی کتب لکھیں۔ اقبال پر ان کے مضامین رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے مثلاً "اقبال کی دعوت فکر و عمل" "اقبال کی ایک پیش گوئی" (دونوں ہفت روزہ "آفاق" لاہور بابت ۳۰ اپریل ۱۹۴۹" میں شائع ہوئے)

ڈاکٹر صفدر محمود

موجودہ وفاقی سیکریٹری تعلیم ڈاکٹر صفدر محمود (پ ۱۹۴۴ء ڈنگہ گجرات) نے اپنی دو درجن تحقیقی کتب کے ساتھ ساتھ اقبالیات پر بھی اہم مقالات رقم کئے ہیں مثلاً "اقبال کا انکم ٹیکس ریکارڈ" (مطبوعہ "صحیفہ" "اقبال نمبر۱" دسمبر ۱۹۷۳ء) "اقبال کا تصور فکر" (مشمولہ اقبال ۸۴ء مرتبہ وحید عشرت) "علامہ اقبال کا تصور پاکستان اور ہجرت کا مسئلہ" (مطبوعہ جنگ لاہور ۹ نومبر ۱۹۹۱ء)

ڈاکٹر اختر پرویز

راقم الحروف کے گاؤں (لوراں، گجرات) کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والے واحد صاحبِ علم جناب اختر پرویز یکم مارچ ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ آجکل گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں اردو کے استاد ہیں۔ انھوں نے حال ہی (دسمبر ۱۹۹۷ء) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اقبالیات میں ان کے مضامین میں "اقبال اور رجائیت" (مطبوعہ محور پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۴ء)۔ "اقبال کا نظریہ تقدیر" (مطبوعہ ہفت روزہ نیا پیام لاہور ۱۹۷۴ء) اور "کلام اقبال میں مسمط کا جائزہ" (مطبوعہ صحیفہ لاہور اقبال نمبر ۱۹۸۷ء) شامل ہیں۔

راقم الحروف

راقم الحروف کی اقبالیات پر زیرِ نظر کتاب کے علاوہ مضامین و مقالات میں "اقبال کا انسانِ کامل" (مطبوعہ مجلہ شاہین زمیندار کالج ۱۹۸۶ء) "اقبال اور خوشی محمد ناظر" (مطبوعہ

ماہنامہ فانوس لاہور ناظر نمبر ۱۹۹۵ء) اور "اقبال کے تین معالجین" (زیر طبع سیارہ لاہور) شامل ہیں۔

کچھ مزید لکھنے والے

○ اقبال موت کے دربار میں ☆ از مجید لاہوری ☆ احسان اقبال نمبر ۳۰ مئی ۳۸ء
○ اقبال، حالی اور اکبر کا موازنہ (انگریزی) ☆ حکیم سید ارشاد ☆ ڈان دہلی ۱۷ جون ۴۵ء
○ خودی دا فلسفہ (پنجابی) ☆ حکیم عبداللطیف عارف ☆ پنجابی زبان لاہور اقبال نمبر ۷۴ء
○ حکمتِ اقبال ☆ زیبا درانی ☆ ہفت روزہ آفاق لاہور ۳۰ اپریل ۴۹ء
○ اقبال اور اشتراکیت ☆ حکیم چوہدری سردار خان ☆ آفاق لاہور ۳۰ اپریل ۴۹ء
○ اقبال اک صوفی (پنجابی) ☆ پروفیسر سید کبیر احمد مظہر ☆ چھماہی کھوج لاہور جولائی ۸۷ء
○ اقبال دی وضع داری (پنجابی) ☆ ڈاکٹر غلام حسین اظہر ☆ رچناب گوجرانوالہ دسمبر ۷۷ء
○ اقبال، نواب بہادر یار جنگ کی نظر میں ☆ خواجہ ظفر نظامی ☆ نوائے وقت ۲۱ اپریل ۸۶ء
○ اقبال کا تصور عشق و عقل ☆ خواجہ ظفر نظامی ☆ ماہنامہ پیغامِ اسلام برمنگھم اپریل ۷۵ء
○ حضرت اقبال کی ایران میں مقبولیت ☆ محمد انور مسعود ☆ فارسی ادب کے چند گوشے ۹۳ء

حوالہ جات و حواشی

۱۔ کلیاتِ اِقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۱ پر خطوط کی تعداد ۱۴۳ درج ہے
۲۔ کلیاتِ اِقبال صفحہ ۲۹
۳۔ ایضاً صفحہ ۴۲
۴۔ پروفیسر محمد فرمان کے حالات ان کے صاحبزادے نے فراہم کئے
۵۔ شاہین۔ اِقبال نمبر ۱۹۷۸ء مجلہ زمیندار کالج گجرات صفحہ ۴۳
۶۔ مکتوب ڈاکٹر ملک حسن اختر بنام راقم محررہ ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء
۷۔ یہ معلومات سید نور محمد قادری مرحوم سے براہ راست حاصل ہوئیں
۸۔ گجرات کی بات۔ مرتبہ اسحاق آشفتہ صفحہ ۴۲۹
۹۔ گجرات کی بات صفحہ ۴۰۷

حصہ سوم: مقلدین اِقبال

- ڈاکٹر محمد شجاع ناموس
- پروفیسر محمد اکبر منیر
- سید انور کرمانی
- محمد حسین شوق

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

(اِقبال)

ڈاکٹر محمد شجاع ناموس

ڈاکٹر ناموس کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا اور وہ فن شعر سے بخوبی آگاہ تھے۔ اِقبال کے فیض نے ان کے سینے میں سوز و ساز کا جو بیج بویا تھا وہ آگے چل کر ایک تناور درخت کی صورت میں سامنے آیا اور ڈاکٹر ناموس کی فکر اور فن پر چھا گیا۔

ڈاکٹر ناموس کا پہلا مجموعہ کلام 'صبحِ ازل' کے نام سے شائع ہوا۔ اِس کے مطالعہ سے ڈاکٹر ناموس کے خیالات و نظریات اور فن پر اِقبال کی صحبت اور تعلیمات کا واضح اور بھرپور اثر نظر آتا ہے 'صبحِ ازل' کی تقریظ میں سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں۔ (۱)

"اپنی طالبعلمی کے زمانہ میں ڈاکٹر ناموس صاحب کو علامہ اِقبال مرحوم کا فیض صحبت بھی نصیب ہوا ہے اور اِسی سبب سے اِن کے اشعار میں اِقبال کے رنگ کی جھلک ہے۔ مثلاً یہ شعر مِلاحظہ ہو۔"

تو نہ کر بیخودی و ذوق کی دریوزہ گری
مردِ کامل تو ہے خود جام و سبو خود ہے شراب

ایک اور شعر دیکھئے۔ اِقبالی انداز کلام ہے۔

سوز افراد کو مصروف عمل رکھتا ہے
حکم تسخیر مگر سوز ملل رکھتا ہے

"حکمت افرنگ" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کا یہ شعر قابل توجہ ہے

مئے افرنگ کی مستی میں انسان ہوش کھو بیٹھا
سمجھتا ہے نوائے عیش' اٹھتی ہے صدا غم سے"

صبحِ ازل کی ایک اور تقریظ میں آغا صادق حسین نقوی لکھتے ہیں۔ (۲)

"علامہ اِقبال کے مقلد حشرات الارض کی طرح پیدا ہو گئے ہیں لیکن وہ لفظی تراکیب یا چند غیرمانوس قوافی کے اِستعمال سے بزعمِ خود علامہ مرحوم کی تقلید کے مدعی ہیں۔ لیکن ناموس صاحب کو اِس بے ذوق نقالی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ آپ بسیط حقائق مختصر الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں۔ ایسے اشعار پر علامہ کے اشعار کا گمان ہوتا ہے۔ شاید اِس لئے کہ ناموس کو علامہ اِقبال کی صحبت میں بیٹھنے کا برسوں موقع ملا اور اِس صحبت کا اثر دل و دماغ پر ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ چند اشعار میں علامہ کا سا اعجاز اور دلفریبی پائی جاتی ہے "کوشش

پیہم" میں فرماتے ہیں۔

مگر تو جہد میں تطہیرِ فکر و ذِکر نہ بھول
بلند جتنے ارادے' بلند اتنا مقام

"یقین فتح" میں جو ایک پایہ کی نظم ہے' کس قدر لطیف شعر ہے۔

بلند تر ترا مقصود ہو ستاروں سے
ارادہ کوہ گراں' حوصلہ فلک پرواز

عقل و عشق کا موازنہ ملاحظہ ہو

عقل گو نور ہے محدود ہے گمراہی میں
عشق کا نور ہے' ہر ماہ میں ہر ماہی میں"

ڈاکٹر ناموس نے مقدور بھر اقبال کی تقلید کی ہے۔ اُنہوں نے وہی بلند مقصد پیش نظر رکھا ہے جو اقبال کی شاعری کا محور تھا۔ خیالات سے لے کر عنوانات اور بحور تک سبھی میں اقبال کا تتبع واضح ہے۔ مثلاً ' صبح ازل' کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔ حضرت انسان۔ حکمت افرنگ۔ کشمیر۔ تنہائی۔ شاعر۔ ایک سوال۔ طالب علم۔ خیالات جاوداں۔ عقل اور عشق۔ قوم۔ عمل' یہ سب عنوانات ہمیں اقبال کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ یہ تقلید صرف عنوانات تک ہی محدود نہیں' افکار بھی اقبالی فکر کا پرتو ہیں۔ ڈاکٹر ناموس اپنی نظم "کوشش پیہم" میں کہتے ہیں (۳)

حیات نام نہیں جز بکوشش پیہم
کہ خود ہے حرکت پیہم میں زندگی کا نظام

اقبال نے شاعر کو "دیدہ بینائے قوم" قرار دیا۔ ناموس کہتے ہیں (نظم شاعر) (۴)

دوررس اِس کی نگاہیں' آسمان پیما دماغ
محفلِ ہستی کی تاریکی میں ' نور افشاں چراغ
موجدِ اکسیر اعظم ' شاعر رنگیں بیاں
ہے سخن آبِ بقا' ملت کر رکھتا ہے جواں
آنیوالے عہد کی تیرا سخن تقدیر ہے
تیرے ذمہ فرضِ اول قوم کی تعمیر ہے

اقبال کے ہاں حیات ابدی کا راز عشق ہے۔ اِسی عشق کی عظمت کا بیان ڈاکٹر ناموس کی زبانی سنئے! (نظم حیات جاوداں۔ ۵)

ہیں مگر زندہ ہمیشہ صاحبِ علم و قلم
وہ ہیں عشق اور عشق ہے ناآشنا از بیش و کم
عشق مٹ سکتا نہیں مٹتی ہے صوری کائینات
عشق کر لیتا ہے پیدا خود حیات اندر ممات
باغِ نادیدہ خزاں اقبال اور غالب ہیں یہ
موت اوروں پر ہے لیکن موت پر غالب ہیں یہ
ہے حیاتِ جاوداں انکی ' یہ حق کے راز دار
دہر فانی ' ان کے گلشن میں مگر قائم بہار

خیالات کی مماثلت کی ایک اور خوبصورت مثال دیکھئے

ڈاکٹر اقبال

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں ' راکب ہے قلندر

ڈاکٹر ناموس (۶)

بہت بلند ستارے ہیں ' چرخِ نیلی فام
مگر بلند ہے ان سے قلندری کا مقام
جہان زمان و مکاں کا کوئی اثر ہی نہیں
قیودِ شام و سحر کا ' جہاں گزر ہی نہیں

طالب علم کے عنوان کے تحت ناموس کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں (۷)

کتاب تری نظر میں ہے ' تیرے دل میں نہیں
کریم ' ذوقِ نظر بھی تجھے عطا کر دے
تری نواؤں سے پیدا ہو سازِ فطرت پر
وہ سوز جو کہ ملائک کو ہمنوا کر دے

غرض ڈاکٹر ناموس کی شاعری مکمل طور پر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی عکاس ہے اور ڈاکٹر ناموس اسی عظیم مقصد کو لے کر آگے بڑھے جو اقبال کا آدرش تھا۔ وہی جرات رندانہ ' وہی عقل و عشق کی ٹکر ' وہی مکالماتی انداز ' فطرت نگاری اور خودی و عشق کی سربلندی ' بندے کا خدا سے سوال و جواب ' عمل کی برتری سب اقبال کی یاد دلاتے ہیں۔

پروفیسر محمد اَکبر منیر

پروفیسر اَکبر منیر کا فارسی مجموعہ کلام "ماہِ نو" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ اِس میں زیادہ تر شاعری اِن کے قیام ایران و عراق کے دور کی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کا جوہر شاعری ابھی نمو پذیر تھا۔ اِس دور کی شاعری میں ایران کے شعراء کا تتبع نظر آتا ہے ان کے سفر کے آغاز تک اِقبال کی صرف ایک کتاب "اسرارِ خودی" منظر عام پر آئی تھی اِس لئے "ماہ نو" میں ہمیں اِقبال کی تقلید کی زیادہ مثالیں نہیں ملتیں تاہم کہیں کہیں خیالات کی ہم آہنگی ضرور نظر آتی ہے مثلاً (۸) مصطفےٰ کمال پاشا کی مدح' بابا طاہر عریاں کے حضور' چاند سے شاعر کا مکالمہ' اور نوائے شاعر کی نظمیں اِقبال کی فکری تقلید کی مثالیں ہیں۔

تاہم واپسی کے بعد اُنہیں اِقبال کی قربت کا زیادہ موقع ملا۔ ان کے خیالات سے پوری طرح آشنا ہوئے اور اِن کے کلام کے عمیق مطالعہ کا موقع ملا۔ خود اَکبر منیر کی فکر بھی اب پختہ ہو چکی تھی چنانچہ اب ان کی شاعری اِقبال کا پرتو بن گئی۔ خصوصاً وہ نظمیں جو اُنہوں نے اَنجمن حمایت اِسلام لاہور کے جلسوں میں پڑھیں۔ اِس دور میں اِقبال کے انداز کی دھوم تھی۔ پھر قومی سطح پر ضرورت بھی ایسی ہی شاعری کی تھی۔ چنانچہ اَکبر منیر نے اِقبال کی تقلید میں خوبصورت قومی شاعری تخلیق کر کے عزت حاصل کی۔

اَنجمن حمایت اِسلام لاہور کے جشن جوبلی کے موقع پر دسمبر ۱۹۳۸ء میں اَکبر منیر نے جو نظم پڑھی اِس کا نام "لالہ صحرا" تھا۔ یہ اِقبال کے فکری و فنی تتبع کی خوبصورت مثال ہے۔ اِس نظم کا انتساب اِسلامیہ کالج لاہور کے نوجوان مسلم طالب علم کے نام ہے۔ اِس انتساب سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ (۹)

میرا سرودِ عشق ہے پیغامِ لا الہ
لایا ہوں تیرے سر کیلئے تاجِ سروری
تو ماہِ نو ہے تیغ صفت پاک و آبدار
رقصاں ہے تیرے آئینہ میں روحِ حیدری
عشقِ خدا میں ڈوب کے ماہ تمام ہو
شمشیرِ لا الہ سے جہاں کا امام ہو

نظم میں کہتے ہیں (۱۰)

بندۂ مومن ہے تو عرش ہے تیرا مقام

بتکدۂ خاک کی تجھ پہ محبت حرام

اَکبر منیر کا فلسفہ اِقبال کے فلسفہ عشق سے ہم آہنگ ہے کہتے ہیں

مومنِ جانباز ہے عشق کی شمشیر سے
بزمِ جہاں کا چراغ ' اہلِ جہاں کا امام

--☆--

عشق کی آتش سے ہے ' گرمیٔ بزمِ حیات
زندگیٔ عشق ہے زندگیٔ کائنات

اِقبال نے کہا تھا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اَکبر منیر نے اِسی بات کو یوں بیان کیا ہے

بخت رہے واژگوں ' مومنِ بے باک کا
بندۂ مومن نہیں ' تو وہ ہے خاشاک کا

نوجوان مسلم کی تن آسانیاں اِقبال کو رلاتی تھیں۔ اَکبر منیر بھی اس پر متفکر ہیں

آج ہیں ننگِ وطن ' آج ہیں ننگِ جہاں
میری تن آسانیاں تیری تن آسانیاں

'وحدت اِسلام' پر اَکبر منیر کے خیالات مِلاحظہ ہوں

کر دے اِسے آشنا وحدتِ اِسلام سے
پیکرِ بے روح کو ' زندہ کر اِس جام سے
دین سے ناآشنا ' مست ہیں میرے جواں
ساغرِ افرنگ کے بادۂ گلفام سے

اسی نظم سے کچھ اور اشعار دیکھیے

چہرۂ مسلم پہ ہے ' غیر کے در کا نشاں
کانپتا ہے آفتاب' کانپتا ہے آسماں

--☆--

سطوتِ ایماں نہیں' الفتِ قرآں نہیں
کیوں نہ ہوں ہم ناتواں کیوں نہ ہوں ہم نیم جاں

--☆--

یہ سفرِ زندگی، جادہ پیکار ہے
عشق سے آسان ہے، عقل سے دشوار ہے

--☆--

بندۂ حق بے ریا، بندۂ حق بے نیاز
بندۂ حق پاک دل، بندۂ حق پاک باز

--☆--

بندۂ حق کا وطن سارے جہاں کا چمن
اس کے ہیں ایران و ہند، اس کے ہیں چین و حجاز

--☆--

تیز ہے تیغِ عمل، جب ہو فساں لا الہ
معرکہ ہوتا ہے سر، جب ہو نشاں لا الہ

--☆--

عشق سے ہے پائدار، آدمِ ناپائدار
عشق سے ہے اِستوار زندگی بے ثبات

اکبر منیر کی نظم "جبریل و ابلیس" انجمن حمایت اِسلام لاہور کے باون ویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء میں پڑھی گئی۔ یہ بھی مکمل طور پر اِقبال کی تقلید میں لکھی گئی۔ اکبر منیر بھی اِقبال کی طرح مولانا روم سے متاثر ہیں۔ جبریل و ابلیس، جو الگ شائع ہو کر تقسیم ہوئی کے صفحہ اول پر مولانا کا یہ شعر درج ہے۔ (۱۱)

داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

اس نظم کا انتساب بھی نوجوان مسلم کے نام ہے جنہیں مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں

تاریکیوں میں چھپ گیا رخسارِ زِندگی
حسنِ عمل کے نور سے کر اِس کو بے حجاب
خمخانۂ حجاز سے لا ساغرِ حیات
دے آدمی کو فتنۂ ابلیس سے نجات

اس نظم کا انداز بھی وہی ہے جو اِقبال کی نظم جبریل و ابلیس میں ہے۔ ابلیس کہتا ہے

میرا نفس شعلہ ریز ' میرا نفس شعلہ خیز
مجھ سے دِلوں کی ترنگ ' مجھ سے دِلوں میں امنگ
لاکھوں ہیں فتنے مرے ' جن میں سے ہیں ایک دو
فتنۂ تہذیب و رنگ' فتنۂ ناموس و ننگ

--☆--

میرے نفس سے ہے گرم خونِ دل کائنات

--☆--

دُور ہے ابلیس کا ' مردِ مسلماں کہاں
حاملِ قرآں کہاں ' عاشقِ یزداں کہاں

--☆--

کھل گئے افرنگ میں ' میرے نئے میکدے
ان سے ہے اب ہاؤ ہو ان سے ہے اب ناؤ نوش

یہاں بھی ابلیس کو وہی خوف اور خدشہ ہے جو "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ہے

ڈر ہے یہ فتنہ کہیں کل کو قیامت نہ ہو
مجمع جمہور میں ' اِس کی امامت نہ ہو!

اَکبر منیر کی فارسی رباعیات (غیر مطبوعہ) سے تین مثالیں دیکھئے (۱۲)

نگاہ اَز عشقِ حق شمشیر گردد جہانِ آب و گِل نخچیر گردد
بیا خودرا ایں آتش بینداز کہ مشتِ خاکِ تو اکسیر گردد

--☆--

بیا اے بلبلِ باغِ حجازی بگو اَز راہ و رسمِ عشق بازی
ردائے برکش اَز نورِ حقیقت کہ دِل بگرفت اَز بزمِ مجازی

--☆--

زمطرب آتشِ سیال خواہم نوائے رومی و اقبال خواہم
سرایم نغمۂ عشق دِل افروز جہانے را بہ وجد و حال خواہم

--☆--

سیّد انور کرمانی

گجرات کے مشہور اِقبالی اور مقلد اِقبال ' سید مظفر حسین انور کرمانی اِقبال کے سچے فدائیوں اور شیدائیوں میں سے ایک تھے۔

لدھیانہ سے ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ شکیل بدایونی اور ساحر لدھیانوی کی دوستی پیچھے رہ گئی اور اِقبال سب پر حاوی ہوگیا۔ ان کے والد خان بہادر ڈپٹی امیر علی انبالہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ہجرت کے بعد سرگودھا آئے جہاں انکی جاگیر تھی۔ پھر گجرات تشریف لائے اور ایک طویل مدت تک گجرات کی علمی ادبی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔ گجرات شہر میں وٹرنری ہسپتال کے قریب رہتے تھے۔

سید انور کرمانی اَپنے ذوقِ فن کو اِقبال کا فیض قرار دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر پیرو جواں فکرِ اِقبال کا پیرو ہو۔ وہ پیغام اقبال کے فروغ کے ذریعے امتِ مسلمہ کے نیم مردہ جسم کو زندہ کرکے پھر سے ماضی کا تابناک دور واپس لانا چاہتے تھے۔ گجرات کی ادبی مجالس میں اپنا جاندار اِقبالی کلام سناتے تھے اور داد پاتے تھے۔ کرمانی صاحب کا انداز بلاحظہ ہو کہ وہ اِقبال کے نظریات اور فن سے کس قدر متاثر تھے (۱۳)

جو مردِ قلندر ہے فائق ہے وہی آخر
اسرار و رموز اول تکمیلِ خودی آخر

کرمانی صاحب کا ایک اور قطعہ دیکھئے (۱۴)

میں مردِ جہاں بین و خدا مست و خود آگاہ
سلطاں کا مصاحب ہوں نہ میں جام ہوں جم کا
رکھ معنی و مفہوم کی آتش سے مجھے دور
میں آخری ہوں لفظ تیرے لوح و قلم کا

---☆---

چودھری محمد حسین شوق

چودھری محمد حسین شوق گجرات کے نامور شاعر' ادیب ' ماہر تعلیم اور درویش صفت انسان تھے ۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے اور ۱۷ مئی ۱۹۷۱ء کو رحلت فرمائی ۔ ایک عرصہ تک سرگودھا میں لازمی تعلیم آفیسر رہے ۔ سرگودھا میں علمی و ادبی مجلس کے روح رواں تھے۔

اقبال سے بہت متاثر تھے اور ان کے خیالات کا پرتو آپ کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ آپ نے زیادہ نہیں لکھا اور جو لکھا وہ بھی اپنی قلندرانہ طبیعت کی وجہ سے محفوظ نہ رکھا جگہ جگہ اقبال کی تقلید اور اقبال سے فکری ہم آہنگی نظر آتی ہے یہ رباعی دیکھئے (۱۵)

جنوں نواز و حق آگاہ اہلِ سوز ہے گر
فقیہہِ شہر سے وہ رندِ اشکبار اچھا
جو اپنی ایک نظر سے جہاں بدل ڈالے
ہزار شیخِ حرم سے وہ بادہ خوار اچھا

ایک اور نظم جس کا عنوان "دعائے مسلم" ہے' کے چند اشعار دیکھئے (۱٦)

اے حامی و ہمدردے ' اے چارۂ ہر دردے — گلہائے تمنا سے دامن کو میرے بھر دے
بازوئے مسلماں میں پھر قوتِ حیدر دے — جو کفر کے خیبر کو پھر زیر و زبر کر دے
دل دے جو محبت میں اسلام کی مٹ جائے — الفت میں محمد کی کٹ جائے وہ سر دے
شمشیر عطا کر وہ جو کفر مٹا ڈالے — کفار کے سینوں سے ہو پار وہ خنجر دے
پھر اپنے مسلماں کو دے تختِ سلیمانی — پھر شوکت دارا دے پھر بختِ سکندر دے
اسلام کے لشکر کو پہلے سے بہادر دے — فاروق دے خالد دے ' مردِ حیدر صفدر دے

---☆---

حوالہ جات و حواشی

۱۔ صبحِ ازل از ڈاکٹر محمد شجاع ناموس ۔ محمد امین پرنٹرز لاہور س ن ص ۱
۲۔ ایضاً ص ۶
۳۔ ایضاً ص ۱۷
۴۔ ایضاً ص ۸۳، ۸۴
۵۔ ایضاً ص ۲۱
۶۔ ایضاً ص ۴۰
۷۔ ایضاً ص ۵۹
۸۔ 'ماہِ نو' از محمد اکبر منیر مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء
۹۔ لالۂ صحرا ۔ از محمد اکبر منیر مدرستہ البنات ۔ جالندھر شہر (یہ نظم انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۸ء میں پڑھی گئی
۱۰۔ لالۂ صحرا نظم کا متن ص ۷ تا ۳۲
۱۱۔ 'جبریل و ابلیس' از محمد اکبر منیر۔ مکتبہ علمیہ ۔ مدرستہ البنات ۔ جالندھر شہر ۱۹۴۲ء
۱۲۔ پروفیسر محمد اکبر منیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ان کے حالات زندگی راقم کو ڈاکٹر احمد حسین قریشی سے دستیاب ہوئے
۱۳۔ ہفت روزہ "تعمیرِ نو" گجرات سالنامہ ۱۹۵۹ء نظم بعنوان "گلبانگ سروش"
۱۴۔ بیاض پروفیسر حامد حسن سید گجرات
۱۵۔ مقامِ شوق مرتبہ راجہ محمد یعقوب الحفیظ ۔ شوق پبلیکیشنز راولپنڈی ۔ ۱۹۹۱ء صفحہ ۴
۱۶۔ ایضاً صفحہ ۸۶

حصہ چہارم: جرائد و رسائل اور بزمہائے اِقبال

- ماہنامہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین
- مجلّہ "شاہین" زمیندار کالج گجرات
- مجلّہ "رخشاں" ڈگری کالج برائے خواتین گجرات
- "بزمِ اِقبال" زمیندار سکول و زمیندار کالج گجرات

ماہنامہ "صوفی" - پنڈی بہاؤالدین

ماہنامہ "صوفی" آپنے دور کا بہت معیاری اور کثیرالاشاعت رسالہ تھا۔ اس کا اجراء ملک محمد الدین صوفی نے پیر حیدر شاہ صاحب جلالپوری کی یادگار کے طور پر کیا تھا۔ پیر صاحب نے ۱۹۰۸ء میں رحلت فرمائی اور غالباً اسی سال "صوفی" کا اجراء ہوا۔ "صوفی" کا سب سے قدیم شمارہ جو دستیاب ہوا ہے وہ جنوری ۱۹۰۹ء کا ہے (۱)۔ صوفی اپنی ظاہری سج دھج اور باطنی محاسن دونوں اعتبار سے بہت بلند پایہ ماہنامہ تھا۔ اس کے معیار اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کے سبھی نامور شعراء' اُدباء "صوفی" کے قلمی معاونین میں شامل تھے اور صوفی کی اکثر تحریریں نامور لکھنے والوں کی ہوتی تھیں۔ مثلاً علامہ اِقبال' اَکبرالہ آبادی' ابوالکلام آزاد' مولانا ظفر علی خاں' مولانا محمد علی جوہر(۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) مولانا حسرت موہانی(۱۸۷۵-۱۹۵۱ء) خواجہ حسن نظامی(۱۸۷۶-۱۹۵۵ء) عبدالحلیم شرر' قاضی سلمان منصور پوری' سیماب اَکبر آبادی (۱۸۸۵-۱۹۵۱ء) مولانا غلام قادر گرامی (۱۸۵۶-۱۹۲۷ء) مولانا اصغر علی روحی' نیاز فتح پوری' منشی تلوک چند' خواجہ دل محمد' مولوی احمد علی' عمادی پھلواروی عظیم آبادی' سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰-۱۹۴۳ء) اور منشی محمد الدین فوق جیسے عہد ساز اہل قلم صوفی کے مستقل لکھنے والوں میں شامل تھے۔

اِقبالیات "صوفی"

اِقبال کا کلام بھی تواتر سے "صوفی" کے صفحات کی زینت بنتا۔ اس دور میں ملک کے سبھی رسائل اِقبال سے تازہ کلام کے متقاضی ہوتے تھے لیکن وہ صرف معیاری رسائل کو اپنا کلام مرحمت فرماتے تھے۔ کبھی کبھی صوفی میں بھی تازہ کلام اِقبال چھپتا تھا۔ چند ایک دستیاب پرچوں میں اِقبال کے کلام کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱۹۱۲ء :- جنوری = دردِ عشق' فروری = نوید صبح' اپریل = طفلِ شیر خوار' جون = شمع اور شاعر' نومبر = رات اور شاعر

۱۹۱۳ء :- جنوری = جواب شکوہ' جون = چاند

۱۹۱۴ء :- اگست = جزیرہ سسلی

۱۹۱۵ء :- فروری = سلیمی' اپریل = نوائے غم' جون جولائی = والدہ مرحومہ کی یاد میں (۲)

۱۹۱۶ء :- مئی = حضرت بلال حبشی

۱۹۱۹ء :- ستمبر = غزل (سختیاں کرتا ہوں دِل پر' غیر سے غافل ہوں میں)

۱۹۲۳ء :- مئی = زِندگی' جون = انتساب پیام مشرق

۱۹۲۴ء :- جنوری = نوائے اِقبال' فروری' مارچ = دِل' اپریل = تنہائی (فارسی)' ستمبر = درس عمل

۱۹۲۵ء :- اکتوبر = ہستی بیتاب

۱۹۲۶ء :- اکتوبر = تقریر علامہ اِقبال بسلسلہ عید میلاد النبی ﷺ

۱۹۲۹ء :- نومبر = درس عمل

۱۹۳۰ء :- مئی' جون = دین ابراہیم

۱۹۳۱ء :- مارچ = حکمائے اِسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت (مقالہ)

اپریل = اُردو ترجمہ خطبہ الہ آباد (۳)

خطبہ الہ آباد اور "صوفی"

اِقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد کے محلہ یاقوت گنج میں اپنا تاریخ ساز خطبہ ارشاد فرمایا۔ ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ مسلمان اسے اپنے مسائل کا حل جان کر بہت پسند کر رہے تھے جبکہ دوسری طرف ہندو اسے "شاعر کا خواب" اور "سیاسی غزل" کا نام دے کر تمسخر اڑا رہے تھے۔ یہ خطبہ انگریزی میں تھا۔ عوام الناس اس کی تفصیلات سے آگاہ نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ "صوفی" نے اسے اُردو میں ترجمہ کروا کر شائع کرنے اور مفت تقسیم کرنے کا بندوبست کیا۔

صوفی کے مدیر و مالک ملک محمد الدین نے خطبہ کے اُردو ترجمہ کے لیے جامعہ ملیہ دہلی کے اُستاد سید نذیر نیازی کا انتخاب کیا۔ وہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھے کیونکہ وہ ترجمہ کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ساتھ علامہ کے فیض یافتہ اور ان کے دوست ہونے کی وجہ سے اس خطبہ کے پس منظر اور علامہ کے افکار سے خوب واقف تھے۔

خطبہ کے ایک دو روز بعد ہی نیازی صاحب سے رابطہ کر لیا گیا۔ انہوں نے خط لکھ کر علامہ سے اجازت طلب کی۔ جواباً ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء کو اِقبال نے اُنہیں لکھا (۴)

"ایڈریس کا اُردو ترجمہ شائع کرنے کا خیال نہایت اچھا ہے' ضرور کیجئے"

تاہم نیازی صاحب اپنی عدیم الفرصتی اور آپنے بھائی کی علالت کی وجہ سے ترجمہ مارچ سے پہلے مکمل نہ کر سکے۔ یہ ترجمہ اپریل کے "صوفی" میں شائع ہوا اور اسکی ہزاروں کاپیاں

مفت تقسیم کی گئیں۔
سید نذیر نیازی رقمطراز ہیں۔ (۵)

"خطبہ الہ آباد کا ترجمہ رسالہ "صوفی" پنڈی بہاؤالدین کے اصرار پر کیا گیا تھا۔ باوجود کم فرصتی اور پریشانی کے...... یہ ترجمہ رسالہ "صوفی" کے زیر اہتمام چھپا اور ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا"۔

ترجمہ کی اشاعت اپریل ۱۹۳۱ء کے شمارے میں ہوئی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۱ء کے روزنامہ "انقلاب" میں "درج ذیل اشتہار کے ذریعے عوام الناس کو اس امر کی اطلاع دی گئی (۶)

خطبہ علامہ اقبال رسالہ "صوفی" میں مفت طلب کیجئے

سر محمد اقبال کا خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ جو ہندوستان کی موجودہ سیاسیات پر اسلامی نقطہ نگاہ سے غالباً بہترین اور سب سے اہم تبصرہ ہے۔ اپریل کے "صوفی" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چونکہ خطبہ کی ہر طرف سے مانگ تھی اس لیے اِسکا بطور خاص ترجمہ کرایا گیا ہے۔

خطبہ کی اشاعت کی غرض سے اپریل کے پرچے کی چند ہزار کاپیاں مفت تقسیم کی جائیں گی۔ جو اصحاب مفت کاپیاں چاہتے ہوں ان سے درخواست ہے کہ وہ براہ مہربانی جلد سے جلد مجھ کو لکھ دیں کہ ان کو کس پتہ پر اور کتنی کاپیاں چاہئیں۔ ممکن ہو تو ترسیل کے اخراجات کے لیے ڈاک خانہ کے ٹکٹ ارسال فرما دیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ امید ہے کہ سندھ، سرحد، بلوچستان اور بنگال کے مسلمان خاص طور پر کاپیاں منگوائیں گے۔

مخلص ملک محمد اسلم خان۔ ایم اے (کیمرج) بیرسٹرایٹ لاء
گجرات۔ پنجاب"

"شاہین" ۔ زمیندار کالج گجرات

زمیندار کالج گجرات ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا۔ اگلے سال کالج میگزین کا اجراء ہوا۔ اس کا نام اِقبال کے شاہین کی نسبت سے "شاہین" رکھا گیا جسے سب نے پسند کیا۔ پہلا شمارہ جون ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ جس کے سرپرست پرنسپل سید شبیر حسین بخاری تھے نگران اُستاد حصہ اُردو، تاج محمد خاں اور نگران حصہ انگریزی فاضل محمد افضل تھے۔ اُردو کے مدیر محمد اسلم اور انگریزی کے صفدر حسین تھے۔ مارچ ۱۹۴۰ء کے شمارے سے اُردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی کا حصہ بھی شروع ہوا مگر یہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ شروع میں شاہین سال میں ۴ دفعہ شائع ہوتا تھا۔ قیام پاکستان سے ۱۹۷۱ء تک ششماہی اور بعد ازاں سالنامہ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔ شاہین اَپنے علمی و اَدبی معیار کے اعتبار سے کبھی پنجاب کے چند گنے چنے کالج مجلوں میں سے ایک تھا۔ اور اپنے تحقیقی اور بلند پایہ علمی مقالات کی وجہ سے ایک قیمتی دستاویز ہوا کرتا تھا۔ اس کے خاص نمبرز مثلاً سیرت نمبر۔ خیال نمبر۔ اِقبال نمبر، غالب نمبر یادگار حیثیت کے حامل ہیں۔

اقبالیات شاہین

اِقبالیات شروع ہی سے شاہین کا مستقل اور اہم حصہ رہا ہے۔ اسکے بیشتر شماروں کے سر ورق پر "اِقبال کا شاہین" جلوہ افروز رہا ہے۔ اور ساتھ اِقبال کے متعلقہ اِشعار۔ شاہین کے اولین شمارے میں اِقبالیات پر پہلا مضمون حصہ اُردو کے مدیر محمد اسلم نے لکھا اِسکا عنوان "اِقبال اور اُردو اَدب" تھا۔ ۱۹۷۸ء میں شاہین کا "اِقبال نمبر" شائع ہوا۔ گو اس کا مواد اور معیار زیادہ وقیع نہیں تھا تاہم کچھ حصے خوب تھے۔ اسی نمبر میں پروفیسر حامد حسن سید کا مضمون "اِقبال اور گجرات" شائع ہوا جو اس موضوع پر اپنی اولیت کے لحاظ سے اہم تھا۔

اِقبالیات پر لکھنے والوں میں طلباء کے علاوہ پروفیسر حامد حسن سید، پروفیسر عبدالواحد، مفتی حمیداللہ، چودہری محمد احسن وغیرہ شامل ہیں۔ سَربراہان میں سے ڈاکٹر جہانگیر خان، تاج محمد خیال (۱۹۰۴ء۔۱۹۶۱ء)، پروفیسر غلام سرور (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء)، پروفیسر محمد فرمان اِقبال شناسی میں بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ تاج محمد خیال کا مقالہ "اِقبال کا کردار ابلیس" اور محمد فرمان کی کتاب "اِقبال اور تصوف" حوالہ جاتی تحریریں ہیں۔ منظوم ھدیہ عقیدت کے لئے سے عبدالقیوم طارق، تبسم قریشی، احمد حسین قریشی، مسرور کپور تھلوی کے نام قابل ذِکر ہیں۔

اقبالیات شاہین

شاہین کے اولین پرچے (جون ۱۹۳۹ء) سے لیکر تا حال اِس میں اقبالیات پر بہت سے مضامین و مقالیات شائع ہوئے۔ چند اہم کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

مضمون/مقالہ	مصنف	شمارہ
اِقبال اور اُردو آدب	آز محمد اسلم خان	جون ۱۹۳۹
اِقبال اور قومیت	آز محمد رفیق	جون ۱۹۴۱ء
مومن اِقبال کی نظر میں	آز عبدالقیوم	جون ۱۹۴۱ء
اِقبال ایک مصلح قوم کی حیثیت سے	میر قمرالدین	جون ۱۹۴۱ء
عقل و عشق اِقبال کی شاعری میں	محمد شریف	جون ۱۹۴۵ء
The Poet of the East	راجہ خاں بھٹی	دسمبر ۱۹۵۱ء
علامہ اِقبال کا نظریۂ حیات	عبدالستار خاں	مارچ ۱۹۵۲ء
علامہ اِقبال کا مکتوب بنام پروفیسر محمد اَکبر منیر	پروفیسر محمد اَکبر منیر ایم اے	جون ۱۹۵۳ء
کلام اِقبال کا مطالعہ	پروفیسر محمد فرمان ایم اے	جون ۱۹۵۳ء
اِقبال کی مسجد قرطبہ	سید حسن عسکری	ستمبر ۱۹۵۴ء
اِقبال اور تصوف	پروفیسر محمد فرمان ایم اے	ستمبر ۱۹۵۴ء
علامہ اِقبال کے کلام میں تشبیہات و استعارات	پروفیسر افتخار حسین شاہ	ستمبر ۱۹۵۴ء
Some Aspects of Iqbal's poetry	پروفیسر غلام سرور	جولائی ۱۹۵۵ء
اِقبال کا تصورِ دین و سیاست	خورشید الزماں ہاشمی	دسمبر ۱۹۵۵ء
تبصرہ بر کتاب منظوم (ترجمہ زبورِ عجم) آز اے جی آربری بی جامعہ کیمبرج	محمد فرمان ایم اے	دسمبر ۱۹۵۵ء
اِقبال کا فلسفۂ حیات	عبدالجلیل نجفی	دسمبر ۱۹۵۶ء
اِقبال اور یقین	امین الحق ڈپٹی کمشنر گجرات	دسمبر ۱۹۵۶ء
علامہ اِقبال اور قومی کردار	ڈاکٹر جاوید اِقبال	جون ۱۹۶۶ء
علامہ اِقبال کا نظریۂ شعرو شاعری	چوہدری محمد احسن علیگ	دسمبر ۱۹۶۷ء
Iqbal's concept of God.	اطہر علی بخاری	دسمبر ۱۹۶۷ء
کلام اِقبال ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں	عبدالواحد ایم اے	دسمبر ۱۹۶۸ء
جاوید نامہ، عدم قبولیت، محرکات، پیغام	مفتی حمیداللہ	دسمبر ۱۹۶۹ء
Iqbal A Study	تنویر حسین امجد	جون ۱۹۷۰ء
Iqbal's Patriotic Poetry	محمد ارشد اِقبال	جون ۱۹۷۱ء

بزمِ اِقبال زمیندار کالج گجرات	احمد حسین احمد	جون ۱۹۷۳ء
بزمِ اِقبال گجرات	احمد حسین احمد	جون ۱۹۷۳ء
غزل سرای اِقبال در راہ حافظ	محمد حسین تسبیحی ایرانی	جون ۱۹۷۳ء
علامہ اِقبال کا پیغام نوجوانوں کے نام	خان مشتاق	جون ۱۹۷۴ء
اقبال اور گجرات	حامد حسن سید	دسمبر ۱۹۷۸ء
اقبال اور نوجوان	طارق مسعود کھوکھر	دسمبر ۱۹۷۸ء
اقبال کا فلسفۂ خودی	عبدالرحمٰن ناصر	دسمبر ۱۹۷۸
دانائے راز	سید مسعود انور	دسمبر ۱۹۷۸ء
فلسفہ خودی اور مردِ مومن	سید عبدالقیوم	دسمبر ۱۹۷۸ء
اک مردِ قلندر نے کیا...	محبوب الٰہی بٹ	دسمبر ۱۹۷۸ء
شعرِ اقبال	مرزا اعجاز بشیر	دسمبر ۱۹۷۸ء
اقبال کا پیغام خودی	نجم الاسلام	دسمبر ۱۹۷۸ء
اِقبال کا فنِ تاریخ گوئی	طاہر محمود قریشی	دسمبر ۱۹۷۸ء
نوادراتِ اِقبال	احمد حسین قریشی	دسمبر ۱۹۷۸ء
اِقبال کا ملی شعور	پروفیسر محمد صدیق قریشی	دسمبر ۱۹۸۲ء
حضرت علامہ محمد اقبال	سید طاہر حسین نقوی	جنوری ۱۹۸۴ء
مغربی ثقافت اور اِقبال (انگریزی)	محمد لطیف بھٹی لیکچرر	جنوری ۱۹۸۵ء
اِقبال کا انسانِ کامل	محمد منیر احمد سلیچ	جنوری ۱۹۸۶ء
اِقبال کی خوش طبعی	محمد منیر احمد سلیچ	جنوری ۱۹۸۶ء
شعرِ اقبال	راجہ امیر افضل	دسمبر ۱۹۸۷ء
اِقبال کا شاہین	غضنفر علی ظفر	جنوری ۱۹۸۸ء
ڈاکٹر وزیر آغا بحیثیت اِقبال شناس	محمد اسلم راہی لیکچرر	جنوری ۱۹۸۹ء
اِقبال اور اشتراکیت	پروفیسر مظہر اکبر	۹۳-۱۹۹۲ء
اقبال کا شاہین اور آج کا نوجوان	ذوالفقار انجم	۹۵-۱۹۹۴ء
اقبال اور قرآن	حافظ اختر محمود زاہد	۹۷-۱۹۹۶ء
علامہ اقبال	حافظ محمد ریاض	۹۷-۱۹۹۶ء

اِقبال کے حضور خراج عقیدت اور کلام اِقبال کے تراجم میں سے چند ایک۔

اِقبال	م۔ ر۔ تبسم قریشی	جنوری ۱۹۴۱ء
کلامِ رسا	محمد کبیر خان رسا علیگ	جون ۱۹۴۱ء
حضرتِ اِقبال	سید علی جمال خوارزمی	جون ۱۹۴۱ء
رباعیاتِ طارق' روح اِقبال کے نام	عبدالقیوم طارق	نومبر ۱۹۴۱ء
اِقبال کی روح سے خطاب	ریاض خوارزمی	فروری ۱۹۴۲ء
تصویر کے تین رخ (علامہ اِقبال کی یاد میں)	پروفیسر انور علی انور	نومبر ۱۹۴۸ء
سہ آتشہ (کلام اِقبال کا تین زبانوں میں ترجمہ)	آفتاب احمد قریشی	دسمبر ۱۹۷۸ء
نذرِ اِقبال (قطعہ)	علامہ عبدالکریم قریشی	دسمبر ۱۹۷۸ء
شاعرِ مشرق	راز کاشمیری	دسمبر ۱۹۷۸ء
برمزارِ اِقبال ۱	احمد حسین احمد	دسمبر ۱۹۷۸ء
برمزارِ اِقبال ۲	احمد حسین احمد	دسمبر ۱۹۷۸ء
بدرسِ اِقبال	جان کاشمیری	دسمبر ۱۹۷۸ء
اقبال کے شاہین	سیف الرحمن سیفی	دسمبر ۱۹۷۸ء
علامہ اقبال کے یومِ پیدائش پر	سلیم احمد خالد	دسمبر ۱۹۷۸ء

مجلّہ "رَخشاں" ڈگری کالج برائے خواتین گجرات

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین گجرات گذشتہ چار دہائیوں سے اپنا میگزین "رخشاں" شائع کر رہا ہے۔ یوں تو ہر اشاعت میں اِقبالیات پر تحریریں موجود ہوتی ہیں لیکن "رخشاں" کا اِقبال نمبر خصوصیت سے قابلِ ذِکر ہے جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس کی سرپرست مسز ہاجرہ خاتون (پرنسپل)، نگران مس شاہین مفتی (لیکچرار اُردو) اور مدیرہ تسنیم اسحاق سال چہارم تھیں۔

اس اِقبال نمبر کے اہم مندرجات یہ تھے۔

☆==اِقبال اور نژادِ نو	اَز مسز ہاجرہ خاتون خان (پرنسپل)
☆==اِقبال اور مغربی تہذیب و تمدن	مس رخسانہ غضنفر شعبہ تاریخ
☆==اِقبال اور تعلیم	مس شمیم بخاری شعبہ اُردو
☆==اِقبال اور مملکتِ خداداد	مس شمشاد نواز شعبہ تاریخ
☆==اِقبال کا تصورِ وطنیت	میمونہ زمان سال چہارم
☆==اِقبال کا تصورِ خودی	فریدہ رانی سال سوم
☆==اِقبال کا فلسفۂ عشق	نسیم مختار سال چہارم
☆==اِقبال کا تصورِ تقدیر	میمونہ رشید سال چہارم
☆==اِقبال اور عشقِ رسول	فرحت النساء سال سوم
☆==اِقبال کا مردِ مومن	مصباح ناز یکے اَز رفتگان
☆==اِقبال کا فلسفۂ عرفان ذات	رفعت ظہور سال چہارم
☆==اِقبال اور رومی	نائیلہ میر سال سوم
☆==وسیع تناظر کی ایک نظم "مسجدِ قرطبہ"	شاہین مفتی لیکچرار اُردو
☆==اِقبال کا ایک شعر (کسی ایسے شرر سے)	روبینہ شاہین
☆==اِقبال بھی اِقبال سے آگاہ نہیں ہے	شبینہ کاظمی لیکچرار اُردو
☆==بیادِ اِقبال (فارسی نظم)	فرحت افزاء قریشی
☆==اِقبال بارگاہ رسالت میں	سائرہ اِقبال
☆==اِقبال اور قرآن	نیلم بٹ سال سوم

"بزمِ اِقبال" ۔ زمیندار سکول و کالج گجرات

۱۹۳۵ء کے لگ بھگ گجرات کے انٹر کالج میں "بزمِ اِقبال" کی بنیاد رکھی گئی۔ طلباء میں سے میاں اعجاز نبی اسکے صدر تھے۔ میاں اعجاز نبی (م ۲۹ جون ۱۹۹۵ء ریٹائرڈ سول سرونٹ) نے راقم سے ایک ملاقات میں اس بات کی تصدیق کی تھی۔ ان کے بقول اسی بزم نے سب سے پہلے اِقبال کی وفات کے بعد "یومِ اِقبال" منایا تھا۔

ڈاکٹر قریشی احمد حسین لکھتے ہیں کہ علامہ کی وفات کے بعد ان کی یاد میں سب سے پہلے بزمِ اِقبال قائم کرنے کا اعزاز زمیندار سکول گجرات کو حاصل ہے جہاں اِقبال کی وفات کے چند ماہ بعد اس کا قیام ظہور پذیر ہوا۔ اس کے بانی اور سرپرست سید شبیر حسین بخاری تھے۔ ماسٹر محمد طفیل صدر اور طلباء میں سے پہلے سیکرٹری عبدالکریم خالد تھے۔ اگلے سال (۱۹۳۹ء) یہ بزم زمیندار کالج میں بھی قائم ہو گئی۔ (۸)

ایک اور روایت کے مطابق انٹر کالج میں بزمِ اِقبال' اِقبال کی زِندگی ہی میں قائم ہو چکی تھی اور اِقبال کو اس کی باقاعدہ اطلاع بھی دی گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں انٹر کالج بند ہو جانے کے بعد ۱۹۳۸ء میں زمیندار کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ زمیندار کالج میں بزمِ اِقبال کا اجراء کالج کے پہلے مستقل پرنسپل ڈاکٹر محمد جہانگیر خان (۱۹۰۹۔۱۹۸۸ء) نے کیا تھا۔ یہ بزم آج تک پورے تزک و احتشام سے چل رہی ہے۔

بزمِ اِقبال کی صدارت پر فائز رہنے والے اساتذہ میں چودہری فضل حسین' پروفیسر احمد حسین قریشی' پروفیسر عبدالواحد اور پروفیسر سیف الرحمن سیفی جیسے باصلاحیت لوگ شامل ہیں۔ بزمِ اِقبال کے سیکرٹری رہنے والے طلباء میں انور مسعود' ملک حسن اختر' اے۔ کے۔ خالد' آفتاب اصغر' غلام حسین اظہر اور سیف الرحمٰن سیفی کے نام قابل ذِکر ہیں۔ بزمِ اِقبال کے زیرِ انتظام ہر سال باقاعدگی سے "ہفتہ اِقبال" منایا جاتا ہے۔ یکم سے نو نومبر تک مضمون نویسی' مشاعرہ' تقاریر اور کلام اِقبال پڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جیتنے والوں کو بڑی تقریب میں انعامات دیئے جاتے ہیں۔ اس خصوصی تقریب میں ملک کی نامور علمی شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اب تک ان تقریبات میں تشریف لانے والوں میں علامہ علاؤالدین صدیقی' ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر محمد باقر' علامہ علم الدین سالک' پروفیسر محمد عثمان' ڈاکٹر نیاز احمد' ڈاکٹر سید علی جعفری (تہران)' اشفاق احمد' بانو قدسیہ اور ڈاکٹر سلام الدین نیاز جیسے ماہرین آدب اور اِقبال شناس شامل ہیں۔

بزم اقبال نے پرنسپل غلام سرور کے عہد میں بہت ترقی کی۔ ان کے خطبات نہایت فکر انگیز اور خیال آفرین ہوا کرتے تھے۔ ان کے بعد پروفیسر فضل حسین کی سربراہی میں بھی بزم اقبال خوب پھلی پھولی۔ چودھری فضل حسین جب بزم اقبال کے صدر تھے اور پھر بعد میں جب سرپرست (پرنسپل) تھے' بزم اقبال صحیح معنوں میں فعال تھی۔ مضمون نویسی مشاعرہ' بیت بازی' اور تقاریر سبھی کچھ ہوتا اور ہفتہ اقبال کے دوران خوب رونق ہوتی تھی۔ بزم اقبال کی صدارت جب پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی نے سنبھالی تو اس پر ایک مرتبہ پھر جوبن آیا۔ اور یہ ان کی سربراہی میں ابھی تک قائم ہے۔ چودھری فضل حسین کے دور میں "آل پاکستان مشاعرے" بزم اقبال کا قابل ذکر کارنامہ ہیں۔

حوالہ جات:۔

(۱) مکتوب خواجہ عبدالروف مہتہ بنام راقم مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۴ء

(۲) مظلوم اقبال از اعجاز احمد' کراچی ۱۹۸۶ء صفحہ ۶۷

(۳) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے از محمد حمزہ فاروقی بحوالہ روزنامہ "انقلاب" ۱۸ مارچ ۱۹۳۶ء

(۴) روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔ اقبال اکادمی لاہور' ۱۹۷۷ء' صفحہ ۴۲۶

(۵) مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی' مرتبہ سید نذیر نیازی صفحہ ۶۷

(۶) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے حوالہ مذکور نمبر ۳

(۷) ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے مضمون "زمیندار کالج گجرات کے مجلہ شاہین میں اقبال شناسی" مطبوعہ مجلہ "اقبال" بزم اقبال لاہور اکتوبر ۹۲' جنوری ۹۳' سے مدد لی گئی ہے۔

(۸) شاہین۔ اقبال نمبر' ۱۹۷۸ء سے مدد لی گئی ہے۔

باب ششم

شعرائے گجرات کا اِقبال سے اظہارِ عقیدت

(منتخب منظومات اُردو' فارسی' پنجابی)

سر کا خطاب ملنے پر:۔

- از مولوی سلام اللہ شائق

وفات اِقبال پر:۔

- از چودہری خوشی محمد ناظر
- از کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی
- از شیخ محمد ممتاز فاروقی

قطعاتِ تاریخ رحلت:۔

- از چودھری خوشی محمد ناظر
- از مولوی نورالدین انور
- از کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی
- از پروفیسر ضیاء محمد آف قلعہ دار
- از محمد مظفر علی آف چک عمر

متفرق نذرانہ ہائے عقیدت:۔

- کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی
- حکیم عبداللطیف عارف
- صاحبزادہ ظفر علی شاہ عباسی
- محمد انور مسعود
- سید افتخار حیدر
- ساقی گجراتی

سر کا خطاب ملنے پر قطعۂ تاریخ

آز مولوی محمد سلام اللہ شائقؔ

مولوی سلام اللہ شائق، گجرات کے بلند پایہ عالم اور شاعر مولوی شیخ عبداللہ ساکن چک عمر ضلع گجرات کے بھتیجے اور جانشین تھے۔ مولوی شائق خود بھی جیدّ عالم دین اور شاعر تھے۔ آپ نے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کو انتقال کیا۔ اور چک عمر سے جانب شمال اپنے خاندانی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔ زمین کے ایک مقدمے میں اِقبال آپ کے وکیل تھے۔ جس کی وجہ سے مراسم تھے۔ (اس مقدمے کی فائل کا کچھ حصہ راقم الحروف نے ڈاکٹر احمد حسین قلعداری کے پاس دیکھا تھا اُنہوں نے کئی ماہ تک یہ فائل زیرِ نظر کتاب کے لیے دینے کا وعدہ جاری رکھا پھر یہ کہ کر فائل دینے سے انکار کر دیا کہ اس پر لکھنے سے تم توہینِ عدالت کے مرتکب ہو جاؤ گے!!)

جنوری ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) میں جب اِقبال کو سر کا خطاب ملا تو مولوی سلام اللہ شائق نے درج ذیل قطعۂ تاریخ لکھ کر پیش کیا (۱)

مبارک صد مبارک بہرِ اِقبال
کہ آز فضلِ خدائے لا یزالی
عطا گردیدش آز سرکارِ والا
بمطلب سر بہ سر فرخندہ حالی
نوشتم آز سرِ اخلاص سالش
"خطاب عزت و اِقبال عالی"

۱ + ۱۳۴۰ = ۱۳۴۱ھ

وفاتِ اقبال پر

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

از چودھری خوشی محمد ناظر۔ ۱۹۳۸ء

الوداع اِقبال، اے محبوبِ دوراں الوداع
الوداع اے قوم کے نجمِ درخشاں الوداع
الوداع اے بلبلِ خوش خوانِ گلزارِ وطن
الوداع اے باغ ملت کے غزل خواں الوداع
اے ریاض خلد کے مرغِ خوش الحاں الوداع
درس گاہ عشق کے تلمیذِ رحماں الوداع
الوداع اے غم گسارِ خاکساراں الوداع
الوداع اے راز دارِ چرخِ گرداں الوداع
الوداع اے محفل توحید کے چشم و چراغ
الوداع اِسلام کے خورشیدِ رخشاں الوداع
الوداع اے ساربان ناقۂ بیت الحرام
اے حجازی کاروانوں کے حدی خواں الوداع
الوداع اے شمع فانوسِ شبستانِ وجود
الوداع اے جان پاک اے جسمِ بے جاں الوداع
آج نعش اِقبال کی مسلم کے زیب دوش ہے
بزمِ ملت کی یہ شمعِ آخری خاموش ہے
ماتمِ اِقبال میں ہم اس قدر رویا کریں

سال و ماہ و روز و شب صبح و مسا رویا کریں
اپنے بیگانے کے دل پر ہے تری فرقت کا داغ
آشنا رویا کریں، نا آشنا رویا کریں
بلبلیں صحنِ چمن میں مرثیہ خوانی کریں
غنچہ و گل، شبنم و باد و صبا رویا کریں
یاد میں تیری نوائے روح پرور کی، مدام
ہم سخن رویا کریں اور ہم نوا رویا کریں
مسجدوں میں متقی پڑھتے رہیں تجھ پر درود
خانقہ میں صوفیانِ با صفا رویا کریں
تیرے میخانے میں وہ جام و سبو باقی نہیں
تجھ کو مستانے ترے اے ساقیا رویا کریں
کنجِ مسجد میں شہیدِ قوم کی ہے خوابگاہ
سب نمازی اس پر پڑھ کر فاتحہ رویا کریں
مصر و کنعاں آج جس کے غم میں نیلی پوش ہے
یوسفِ ملت کو اہلِ قافلہ رویا کریں
وہ کرشمے روح پرور، وہ ادائیں دلنواز
تیری کس کس بات پر اے دلربا رویا کریں
صبحِ نو کی تیری شامِ زندگی تمہید ہے
وہ تری جاوید منزل زندہ جاوید ہے
سوزِ دل سے نبض جو مسلم کی تڑپاتا رہا
ہائے وہ اسلام کا قلبِ تپاں جاتا رہا
قلعۂ کوہ ہمالہ سے پیامِ زندگی
مصر و شام و روم و ایراں تک وہ پہنچاتا رہا
دل سے جو اقبال" کے اٹھی" صدائے درد ناک
کاشغر سے باختر تک اسکو دہراتا رہا
فطرتِ بے تاب سے اپنی شرارِ آرزو
عرصۂ عالم کے مظلوموں میں سلگاتا رہا

سینۂ سوزاں میں مخفی تھے جو شعلے طور کے
ان سے شرق و غرب کی دنیا کو چمکاتا رہا
اس کی تھی ہر شاخ میں پنہاں شمیم زندگی
جس سے وہ معمورۂ ہستی کو مہکاتا رہا
وہ سرودِ زندگانی بخش اسرار و رموز
وہ خودی کی راگنی ہر رنگ میں گاتا رہا
پھونک دی مفلوجِ جسم قوم میں روحِ عمل
شہبازی کبکِ کہساری کو سکھلاتا رہا
وہ فقیرِ خانقہ مست مئے عرفاں رہا
عشرتِ میری کے میخانوں کو ٹھکراتا رہا
تھا کبھی محوِ تماشا سیر میں افلاک کی
عرشِ اعظم کے کبھی پردوں کو سرکاتا رہا
مرتبہ انسانِ خاکی کا کیا اتنا بلند
عالمِ ناہوت سے ناسوت ٹکراتا رہا
برتر از ادراک اہلِ بزم یہ مست الست
کنجِ خلوت میں سرودِ سرمدی گاتا رہا
زندگی اقبال کی ہے جاودانی زندگی
کشتگانِ عشق کی ہے غیر فانی زندگی
زندگی اس کی ہے اب عرش آشیانی زندگی
خلد منزل زندگی، جنت مکانی زندگی
زندگی اس کی مسلسل ہے ازل سے تا ابد
وہ تھی فانی زندگی، یہ جاودانی زندگی
برتر از قیدِ مکاں ہے، برتر از قید زماں
عالم لاہوت کی یہ لامکانی زندگی
کس قدر ہنگامہ آرا قرنِ حاضر میں رہی
یہ اویسِ عصر کی صاحبقرانی زندگی
اس سرودِ سارباں سے کسقدر سر مست تھی

کاروانِ قوم کی یہ کاروانی زِندگی
زندگانی اِس کی تھی پیہم رواں، پیہم دواں
باغوں کی سیر، دریا کی روانی زِندگی
داستانِ آسمان و ماورائے آسماں
مہر و ماہ و بزمِ انجم کی کہانی زِندگی
تھی نوید شادمانی زِندگی اِقبال کی
شعرِ مشرق میں رہی غم کی کہانی زِندگی
ہائے وہ حسن آشنا فطرت کا تخیل جمیل
ہائے وہ عشق آفریں، جانِ جہانی زِندگی
ناظرِ مجبور کی ہے تربتِ اِقبال " پر
دیدۂ خونتابہ سے گوہر فشانی زِندگی
سینہ کوبی میں رہے، جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اِقبال کا ماتم رہا (۲)

استقبالِ موت

از کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی

۱۹۳۸ء

کسقدر وحشت اثر ہوتی ہے قیل و قالِ موت
توڑتے ہیں بے پناہ جورو ستم افعالِ موت
زندگی بے چارگی کا دوسرا اک نام ہے
ہے قیامت در حقیقت جشنِ استقلالِ موت
وہ حکیمِ بے بدل مشرق کا تھا جس سے۔ فروغ
منکشف جس پر تھے اسرارِ حیات اعمالِ موت
موت سے بے خوف ہو جانے کا جو دیتا تھا درس
کھیل بچوں کا' نظر میں جسکی تھے اشکالِ موت
فلسفہ جسکا سمجھتا تھا جہانِ عشق میں
چہرہ ہستی کی زیبائش ہے خط و خالِ موت
"مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں"
جو کیا کرتا تھا ان لفظوں میں استقبالِ موت
دست بردِ موت اس کو لے گئی ہے چھین کر
گھٹ گیا اقبال ہستی' بڑھ گیا اقبالِ موت
علم و حکمت کی بدولت زندہٴ جاوید ہے
پیکر اقبال ہے گرچہ متاع و مالِ موت
آخری دم کتنے اطمینان و استقلال سے
مردِ مومن کی طرح اس نے کیا ابطالِ موت
دب کے رہ جاؤں میں خوفِ مرگ سے ممکن نہیں
مجھ پر غالب آ نہیں سکتے کبھی اہوالِ موت
"میں مسلماں ہوں' مسلماں موت سے ڈرتا نہیں"
خندہ پیشانی سے کرتا ہوں میں استقبالِ موت (۳)

آہ

بلند خیال علامہ اقبال

از شیخ محمد ممتاز فاروقی

جناب محمد ممتاز فاروقی (م ۱۹ دسمبر ۱۹۵۶ء) اقبال کے احباب میں سے تھے۔ ذیل کے اشعار اور تاثرات ان کی اپنی زبان میں پیش کئے جاتے ہیں

"اے نام تو راحت زبانم
و ز یاد تو پر شکر دھانم

مرحوم و مغفور کی وفات حسرت آیات کی متواحش خبر سن کر جب لاہور پہنچا تو آنجہانی فردوس مکانی بادشاہی مسجد کے دامن میں مدفون ہو چکے تھے۔ تربت مبارک پر انوار رحمت کے آثار نمایاں تھے۔

فاتحہ خوانی کے بعد دفعتہً مرقد مقدسہ کے ذراتِ خاکِ پاک سے جذبات ابھر کر طالب نیاز و مساز ممتاز کے دل و دماغ میں ودیعت کر گئے۔ "ایں چنیں مستم کہ از چشم شراب آید بروں" کی کیفیت طاری ہو گئی اور بے ساختہ اشعار ذیل زباں زد ہو گئے باوجودیکہ فارسی میں نظم کہنے کا بہت کم اتفاق تھا۔

از پئے دیدن اقبال چوں رفتم بمزار
دیدم اورا کہ تنش خفتہ و چشمش بیدار
چوں مرا دید بنالید و بفرمود کہ "آہ"
حیف از نظمِ من احباب نجستند "اسرار"

---☆---

گفتم اے راہبرِ ما چیست بگو رازِ نہاں
تاکہ پیغام دہم از تو بہر شہر و دیار
گفت چوں موج بود جوش چو دریا تنظیم
تاں بگیریم جہاں را بسپاہِ انصار (۴)

قطعاتِ تاریخِ رحلت

قطعۂ تاریخِ رحلت، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

از خان بہادر چودہری خوشی محمد ناظؔر

سابق گورنر و منسٹر ریاست جموں و کشمیر (۵)

وائے قسمت چل بسا علاّمہ، حکمت پناہ
افتخارِ خاوراں و نازشِ شہر و دیار
وہ علوم عقلی و نقلی کا بحرِ بیکراں
وہ فنونِ شرقی و غربی کا دریائے بے کنار
وہ معلم تھا خودی کا حریت کا پاسباں
اور ایمان و یقیں کا ایک مستحکم حصار
خودنگر، خود گر، خود آموز و خود آگہ خود شناس
آرزو و جستجو و اضطراب و اضطرار
ہم عناں روح الامیں کی اسکی تھی فکرِ بلند
اور تخیل عرش پیما اس کا تھا یزداں شکار
شاعری میں اسکی تھا اک پرتوِ پیغمبری
عقل کا آموز گار اور عشق کا پروردگار
کر رہا تھا قوم کے زخموں کی جو بخیہ گری
جامۂ ہستی کیا اس کا اجل نے تار تار
مصرعِ تاریخ مجھ پر غیب سے نازل ہوا
سالِ رحلت کا ہوا ہاتف سے جب میں خواستگار
آہ کا نکلا الف ناظؔر زبانِ خامہ سے
"مسجدِ شاہی بنی اقبالِ ملت کا مزار"

۱۳۵۸-۱=۱۳۵۷ھ

قطعۂ تاریخ رحلت علامہ سر محمد اِقبال

آز مولوی نورالدین انوؔر

لگا ہے زِندگی کے ساتھ ہر دم موت کا کھٹکا
لکھی تاریخ انوؔر نے "اف اِقبالِ سخن الٹا"

۱۳۵۷ھ

(معنوی اعتبار سے لفظ اِقبال کو اُلٹنے سے لابقا بن جاتا ہے اور "اف اقبالِ سخن الٹا" کے اعداد جمع کرنے سے ہجری سن رحلت بر آمد ہوتا ہے)

یاد رہے کہ مولوی نورالدین انور' اِقبال کی وفات (۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء) کے تقریباً ایک مہینہ بعد ۲۳ مئی ۱۹۳۸ء کو رحلت فرما گئے تھے۔ اِقبال کی رحلت کے چند روز بعد یہ مادہ؎ سن رحلت لکھا گیا۔ جو خوبصورت بھی ہے اور منفرد بھی!(۶)

قطعاتِ تاریخِ رحلت اِقبال

آز کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی (۷)

ندیم علم و دانش بودہ اِقبال پئے حکمت زبانش بودہ اِقبال
شنو تاریخِ رحلت آز تبسم "فروغ علم و دانش بودہ اِقبال"

۱۹۳۸ء

---☆---

مثیلِ حضرتِ اِقبال مرحوم نمی یابم بدوراں گر بجویم
اگر پرسی زمن سالِ وصالش "غروب مہر حکمت بودہ" گویم

۱۹۳۸ء

---☆---

ہوا اِقبال جب دُنیا سے رخصت بشرق و غرب ماتم کا بچھا جال
پئے تاریخ جب ہاتف سے پوچھا پکارا "ایشیا کا فخر اِقبال"

۱۳۵۷ھ

---☆---

وصالِ اقبال

از پروفیسر ضیاء محمد آف قلعہ دار (م ۱۹۸۴ء)

رفت آہ از عالمِ کون و فساد شاعرِ مشرق حکیم پاک زاد
رختِ ہستی بست آہ اقبال ما داغِ حسرت بر دلِ عالم نہاد
آفتابِ علم و حکمت شد غروب آہ رفت آہ پاک دل و پاک اجتہاد
آں کلیمے امتِ گم کردہ راہ داد درسِ عزم وہمت' اعتماد
آں مسیحے امتِ مردہ دلے قم باذن اللہ برما کرد باد
آں دلیلِ امت گم کردہ راہ شرحِ مرگ و زندگی برما کشاد
حرف گیری بر پیامِ آں کلیم ارتداد است' ارتداد است' ارتداد
صاحبِ بانگ و پیام و ارمغاں زندہ خواہد ماند تا یوم التناد
حق تعالیٰ بارشِ لطف و کرم دائما برخاک پاک او کناد
عاشقِ قرآن و اسلام اُو کلیم بودہم مداح آں خیرالعباد
سالِ وصلِ او چو پرسیدم ز دل گفت "المغفور" آں قدسی نژاد
گفت ہاتف "شاعرِ مشرق گزشت" ہست تاریخ حکیمِ پاک شیخ زاد (۸)

۱۹۳۸ء

قطعۂ تاریخِ رحلت اقبال

از محمد مظفر علی (چک عمرا)

"زبدہ آفاق سر محمد اقبال نور اللہ مرقدہ" = ۱۳۵۷ھ

"اولاً سیالکوٹی ثم لاھوری" = ۱۳۵۷ھ

جناب حضرت اقبال کر گئے رحلت
ہوا ہے فوت سے انکی ہر ایک دل رنجور
سنِ وفات سر اقبال' آفتابِ جہاں
کہا ہے ہاتفِ غیبی نے مجھ کو "المغفور" (۹)

۱۳۵۷ھ

متفرق نذرانہ ہائے عقیدت

اِقبال

از کیپٹن محمد رمضان تبسم قریشی۔(۱۹۴۰ء)

(منتخب بند)

دھر میں چرچے ہیں کس کی شوخیٔ گفتار کے
کس کے نغمے راز داں ہیں عالم اسرارِ کے
گلستاں کس نے کھلائے عظمتِ افکار کے
کس نے عقدے کر دیئے حل منزلِ دشوار کے
کس نے دکھلایا ہے نیچا رفعتِ افلاک کو
کس نے پرویں کر دیا ہندوستاں کی خاک کو

کون ساقی دے گیا ہے ساغرِ ہمت نواز
قطرے قطرے میں ہے جس کے مستی سوز و گداز
جامِ جمشیدی سے پیمانہ تھا جسکا سرفراز
میکدے پر جس کے نازاں ہے جان سوزو ساز
جس کے پیمانے سے پی احرار نے' ابرار نے
کام مرسل کا کیا' اِقبال کے اِشعار نے

وہ حجازی لے میں گاتا تھا ترانے قوم کے
قومِ غافل کو سناتا تھا فسانے قوم کے
دردِ دل اپنا دکھاتا تھا بہانے۔۔ قوم کے
نور سے پر کر گیا تاریک خانے قوم کے
معرفت کے حسن کا وہ جلوۂ بیتاب تھا
جلوۂ بیتاب کا اک بے پناہ سیلاب تھا (۱۰)

حکیم مشرق علامہ اقبال

از حکیم عبداللطیف عارف (م ۱۹۷۱ء)

سیالکوٹ کی اس ماں پہ لاکھ رحمت ہو
دیا تھا جس نے وطن کو بفضلہٖ اک لال
وہ ترجمانِ حقیقت، مریدِ مرشدِ روم
رموز دانِ سیاست، وہ قوم کا اقبال
خدا سے شکوہ پھر اس کا جواب کیا کہنے
پڑھو یہ ماضی و حال اور مناؤ استقلال
خودی غلامی، امامت قلندری تہذیب
حقائق ایسے کہ ذہنِ فرنگ ہوا پامال
سمجھ رہے ہیں مسلماں کبھی تو سمجھیں گے
کہ جامعیتِ امت ہے قاتلِ دجال
قدم قدم پہ رکھ اقبال ؒ کا مقولہ دوست
"بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہبی است" (۱۱)

ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ اقبال ؒ

از صاحبزادہ ظفر علی شاہ عباسی الہاشمی (م ۱۹۷۳ء)

صاحبِ جاوید آں اقبالِ قوم — عارفِ اسرار، پر و بالِ قوم
ریز ریز از ضرب او اصنام عصر — از زبورش شدگر افہامِ عصر
انقلابِ دہرِ ما اشعار او — شورشِ میدانِ محشر نارِ او
از آفتابِ شعرِ او ظلمات رفت — گفت آں سرے کہ صد آفات رفت
قوم از سرمایۂ او مفتخر — در جہادِ زندگی چالاک تر
پیر رومی را صدائے باز گشت
بر نگاہِ او فدائے ہرچہ ہست (۱۲)

قصیدہ در مدح رومیؒ و اقبالؒ

از محمد انور مسعود

اقبال سے متعلقہ اشعار

دانندہ و بینندۂ اسرارِ نہانی   آں مشعلِ رخشندۂ اربابِ معانی
در دورۂ ماکرد مگر نقلِ مکانی   اقبال بایں عصر شدہ "رومئ ثانی"
درویشِ حق آگاہ بہ بر کرد کلیمی
شعرش ز گلستانِ حجاز است نسیمی

چوں نالہ رومیست خوش آہنگ و شکربیز   دِل سوز و دِل افروز و دِل آویز و دِل انگیز
بیداریٔ او مرکب جان راز دہ مہمیز   از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابگراں خیز
خوش گفت گرامی و نکوتر نتواں گفت
"پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت"

ایں شرق زمیں رومی و اقبال بزاید   بر سازِ نفس نغمۂ عرفاں بسراید
تاریکیٔ شب را یدِ بیضا بنماید   خورشید ہمیشہ زکفِ شرق بر آید
آں کیست کہ آگاہ ازیں نور نباشد
منکر برخِ مہر بجز کور نباشد

آز درگہ ملای عجم باز نگردم   اقبال عطا کردہ مرا آہ سحر دم
بی آہ وفغاں ہیچ شی صرف نکردم   دادند بدل دُرِّ گرانمایہ دُردم
انور ز خدا جز دل بیتاب نخواہم
من اطلس و ابریشم و کمخواب نخواہم (۱۳)

یادِ اقبال

از سید افتخار حیدر

جو حیاتِ جاوداں ہیں "بالِ جبریل" سے
آؤ ان کی یاد میں ہم بزم آرائی کریں
مسلکِ عشق و وفا میں شوق ہے شرطِ حیات
آؤ بزمِ یار میں پھر شوق افزائی کریں
لے کے "اسرارِ خودی" چن کر "رموزِ بیخودی"
خود سے بے خود ہو کے عالم کو تماشائی کریں
اپنے سنگِ راہ سے پھوٹیں گے پھر چشمے ہزار
جذبۂ "ضربِ کلیمی" سے شناسائی کریں
جذبۂ عشق و وفا ہے یادگار اقبال کی
ہم تو بس دیوار پر تصویر آرائی کریں
ملتِ اسلام محدودِ ممالک کب تلک
دینِ آفاقی سے بھی کچھ تو شناسائی کریں
فرقوں نسلوں اور زبانوں کے بنے لات و منات
توڑ کر بت نفرتوں کے عالم آرائی کریں
قوم مردہ ہو تو سب بیکار ہیں حکمت کے بول
"قم باذن اللہ" سے پہلے مسیحائی کریں
دیکھیے حیدر بنا بیت الحرم بت خانہ پھر
اب امام العصر ہی آ کر صف آرائی کریں (۱۴)

سچیاں خواباں ویکھن والا
از ساقی گجراتی

علم ادب دے اسماناں تے چڑھیا سی اک چن
نھیر دلاں وچ چانن کیتا اس دے سچے فن
جیون بھر اوہ لکھدا رہیا' آزادی دے گیت
شعراں راہیں پیار وفا دی خوب نبھائی ریت
دِل دے اِکتارے دے اتے' چھیڑ خودی دا ساز
منٹھی لے وچ اس جیون دے' آ سمجھائے راز
راگ خودی دے سن کے' اک دوجے ول اُلری قوم
اک نعرے تے کٹھی ہو گئی' کھِلری پُلری قوم
اس دیاں فکراں تے سوچاں دے دیوے نال لئے
آزادی دے راہیاں آپنے' رستے بھال لئے
اوہدیاں تدبیراں نے پلٹی ملت دی تقدیر
پیارا پاکستان اے اوہدے سفنے دی تعبیر
اوہنے بھانویں جگ تے مڑ کے' پائی نہیں مڑ جھات
دِل وچ سانبھ کے رکھیں اوہدیاں یاداں دی سوغات
ساڈی دولت' ساڈی پونجی' ساڈا مال منال
سچیاں خواباں ویکھن والا' علامہ اِقبالؒ (۱۵)

ماخذات

(۱) اوراقِ گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین صفحہ ۱۰

(۲) نذرِ اِقبال مرتبہ ذوالفقار احمد تابش۔ اِقبال اکادمی ۔ لاہور۔ ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۴۳

(۳) یادِ اِقبال مرتبہ غلام سرور فگار۔ کراچی ۱۹۴۴ء

(۴) ماہنامہ "نشیمن" گجرات' جون ۱۹۴۹ء صفحہ ۵

(۵) ماہنامہ "محبِ کسان" گجرات جون ۱۹۳۸ء صفحہ ۱

(۶) "احوال و کلام مولوی نورالدین انور" مرتبہ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ گجرات ۱۹۹۷ء صفحہ ۱۵۳

(۷) شاہین۔ مجلّہ زمیندار کالج گجرات اِقبال نمبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۷

(۸) "شاعرِ مشرق گزشت" کا مادہ سیماب اکبر آبادی نے بھی برآمد کیا تھا اور "المغفور" کا مادہ بھی بہت سے دیگر شعراء نے سوچا تھا۔

(۹) اخبار 'اِقبال' ملتان ۷ نومبر ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰ کالم ۳

(۱۰) شاہین۔ مجلّہ زمیندار کالج گجرات۔ جنوری ۱۹۴۱ء صفحہ ۹ تا ۱۲

(۱۱) درسِ تہذیب۔ از حکیم عبدالطیف عارف۔ گجرات ۱۳۸۱ھ صفحہ ۳۹

(۱۲) نعرۂ حریت از صاحبزادہ ظفر علی شاہ عباسی الہاشمی چکوڑی شریف (گجرات) ۱۹۵۸ء

(۱۳) سہ ماہی "فنون" لاہور اِقبال نمبر۔ دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۹

(۱۴) سوزِ ازل از سید افتخار حیدر: لاہور۔ ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۴۷

(۱۵) ماہنامہ "پنجابی زبان" لاہور اِقبال نمبر۔ اپریل مئی ۱۹۷۴ء

عکس دستاویزات و خطوط

(۱) اِقبال اور کریم بی بی کا نکاح نامہ
(۲) کریم بی بی کا خط خواجہ فیروزالدین کے نام (تحریر بدست معراج بیگم)
(۳) معراج بیگم کا خط اپنی خالہ فاطمہ بی بی کے نام
(۴) شیخ عطا محمد (برادر بزرگ اقبال) کا خط بنام مدا رالنسا دی لیو بند
(۵) ڈاکٹر شیخ عطا محمد کو 'خان بہادر' کا خطاب ملنے کا ذِکر 'گزٹیر آف گجرات میں
(۶) ڈاکٹر شیخ عطاء محمد کو ریٹائرمنٹ کے وقت ریاست مالیر کوٹلہ کے نواب کی طرف سے ملنے والی تعریفی سند
(۷) کرنل خواجہ عبدالرشید کا خط بنام نامعلوم
(۸) پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ کا خط بنام سردار عبدالغفور دُرانی
(۹) مکتوب اِقبال بنام ڈاکٹر محمد شجاع ناموس (منعمی)
(۱۰) پروفیسر اَکبر منیر کے خود نوشت حالات سے ایک صفحے کا عکس
(۱۱) مکتوب علامہ محمد اقبال بنام ڈاکٹر ضیاالدین احمد جس میں پروفیسر عطاالله کی کتاب "پنجاب میں تحریک امداد باہمی" پر انہیں یونیورسٹی فنڈ میں سے ۱۰۰ پونڈ دینے کی سفارش کی گئی۔
(۱۲) مکتوب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بنام خان بہادر شیخ عبدالقادر' جو اُنھوں نے اَپنے نوٹ کیساتھ ماسٹر طالع محمد کو بھیجا

کریم بی بی کا خط خواجہ فیروزالدین کے نام (تحریر بدست معراج بیگم)

از سیالکوٹ
مورخہ ۱۱ جنوری

مکرمہ معظمہ جناب خالہ صاحبہ سلامت

بعد اسلام علیکم کے واضح ہو - یہاں پر بفضل خدا سب طرح
خیریت ہے - اور آپکی خیروعافیت جناب الٰہی سے نیک
چاہتی ہوں - صورت حال یہ ہے کہ آپ کا خط آیا
ہوا تھا - مگر بروقت اس کے جواب نہ دے سکی - امید ہے
کہ آپ معاف فرما دیں گے - میری طرف سے آپ بے فکر
رہیں - اب میں نے دوائی استعمال کرنی شروع کی
ہے - امید ہے کہ فائدہ ہوگا - بخار تو خفیف سا
ہر روز ہوتا ہے - اور کھانسی بالکل کم ہے - اور
نانا صاحب نے دو دفعہ سوئی بازو پر لگائی ہے
اور اسی طرح آٹھ دس دفعہ سوئی اور لگائینگے -
تو پھر گلے کو بھی فائدہ ہو جائیگا - اور سب
گلٹیاں اچھی ہو جائینگی - اور پھیپھڑوں کو بھی
فائدہ ہو جائیگا - کیونکہ یہ دوائی ایسی ہے - جو سارے
جسم میں بلکہ رگ رگ میں اپنا اثر کرتی ہے - آپ
دعا کریں کہ یہ دوائی فائدہ مند ہو - اور واضح
ہو - خالو جان کا خط آپکے نام کا یہاں آیا ہوا ہے
شاید وہ سمجھے ہونگے کہ آپ آزاد نگر گئی ہے -
آج آپکو بھیجدیا جائیگا - اگلے اتوار اپنی تصویروں کا
پیکٹ انہوں ماموں صاحب کے نام پر یہاں بھیجا
تھا - وہ ماموں صاحب کو روانہ کر دیا ہے - اور اس
میں ایک تصویر آپکی تھی - امید ہے کہ مل گئی ہوگی
تو واضح ہو - جناب نانا صاحب آخیر فروری یا
شروع مارچ کو ضرور لاہور جائینگے - کیونکہ ان
دنوں میں ماموں صاحب نے ولایت جانا ہوگا - اور
گجرات سے پنشن لینے کے واسطے جائینگے - اور پھر آپ
دفعہ خالہ حمیدہ کو اور خالہ نواب کو اور آپکو
اپنے ہمراہ لے آویں گے - خالہ نواب بھی رام پور سے
مہینہ روز پہلے گجرات آ جائیگی - اس لیے میں آپکو
تکلیف دیتی ہوں - یہ میرا پہلا کام ہے - وہ یہ
ہے کہ نانا صاحب جاویں گے - تو دوسرے ہی دن آپ
یہاں آ جاویں گے اس لیے آپکو نہایت ادب سے
عرض کرتی ہوں کہ ایک بچہ ساڑھی کا دینا
جس کا نمونہ میں بھیجتی ہوں خرید کر کے ہمراہ
بھیجنے کی عرض کی ہے - تو پانچ گز - اگر چھوٹے گز
ہوں - تو جتنی ساڑھی بن سکتی ہے - خرید کر
بھیج دیں - اور مجھے بھی اطلاع دیں کہ کس قیمت
ہے تو نانا صاحب کے ہاتھ بھیجدی جائیگی - دوسرا
یہ کہ وہ رنگ اچھی قیمت کا ہو - جس وقت [illegible]
پہلے ضرور پہلے ہی خرید کر رکھیں - اور تین گز
ریشمی لیس رنگ فیروزی جیسی کہ آپ نے
خالہ حمیدہ کو لیس مجھے دی تھی - اسی قسم کی ہو
مگر رنگ فیروزی ہو - جس وقت کوئی شہر جانا ہو
جب کبھی ایسا موقعہ ہو - ضرور منگا رکھیں - اور
ایک دوپٹہ ہرا کی ڈوری والا رنگ موتیا - یا سفید
شہزادہ کے واسطے خرید رکھیں - اور اسی قسم کی لیس
جیسی کہ آپنے سفید ہرا کو لگی ہوئی تھی ایک
سینڈل شہزادہ کے واسطے - خرید کر رکھیں ان سب
چیزوں کی قیمت دیا جائیگا نانا صاحب کے ہاتھ فورا
برخوردار [illegible] جاویں - جب آپ یہ سب
خرید لینگے - تو مجھے اطلاع دیں - اور سب کی
الگ الگ قیمت لکھ دیں - نہایت مہربانی ہوگی -
میں نے یہ چیزیں لکھ کر [illegible] کہ میری
یہ خالہ ہی [illegible] منگا لیں - امید
ہے کہ آپ [illegible] خوش کرینگے

معراج بیگم کا خط اپنی خالہ فاطمہ بی بی کے نام

GUJRAT DISTRICT.]

APPENDIX I-B—*concluded.*

Title.	Holder.	Date of bestowal.	Service rendered.
Sardar Bahadur ...	Munshi Sukha Singh ...	2nd January 1911—Sardar Sahib; 3rd June 1915—Sardar Bahadur.	Criminal Investigation Department serv ces.
Rai Bahadur ...	Lala Ram Rattan, Khatri, of Gujrat.	25th June 1907 ..	Superintendent, office of the Director, Medical Services, India.
Do. ...	Lala Sundar Das of Dinga.	...	For work as military contractor.
Rai Sahib ...	Lala Gopal Dass, Khatri, of Kunjah.	1st January 1910 ...	Plague work as Assistant Surgeon.
Do. ...	Lala Kidar Nath ...	1st January 1919 ...	For services in connection with the Great War.
Khan Bahadur ...	Sheikh Ata Muhammad, Kashmiri, Sheikh, of Gujrat.	24th May 1888 ...	Medical.
Do. ...	Khan Muhammad Afzal Khan, Mamoozai Durrani, of Gujrat.	22nd June 1914 ...	In the Burma Military Police.
Khan Sahib ...	Dr. Muhammad Hayat Khan, Rajput, of Gujrat.	26th June 1908 ...	Medical.
Do. ...	Chaudhri Fazal Ali, Kalas Gujjar, of Gujrat.	1st January 1909 ...	For good work as Sub-Registrar and Honorary Magistrate and War services.
Do. ...	Sheikh Sultan Ahmad, Jat Waraich, of Hariawala.	1st January 1910 ...	For good work in the Chenab Colony.
Do. ...	Sheikh Abdul Aziz ...	3rd June 1918 ...	Criminal Investigation Department.
Do. ...	Chaudhri Muhammad Khan of Ajnala.	...	For recruiting.
Do. ...	Ghulam Hussain Khan, Chib, Rajput, of Bese, District Gujrat	1st January 1913 ...	Civil Veterinary Department.
Do. ...	M. Abdul Malik, born in 1855, Chuhan, Mashir Mal, Bahawalpur State.	...	Recruiting.
M.B.E. ...	Munshi Muhammad Zaman Khan, born December 2nd, 1877.	...	Recruiting work.
Do. ...	Khan Bahadur Muhammad Ashrif Khan.	...	For political services.
Do. ...	Khan Sahib Chaudhri Fazl Ali.	3rd June 1918 ...	For war work.

ڈاکٹر شیخ عطا محمد کو 'خان بہادر' کا خطاب ملنے کا ذکر 'گزیٹیر آف گجرات' میں

IJLAS-I-KHAS
MALER KOTLA STATE

محکمہ جات اجلاس خاص

از پیشگاہ عالیجناب فیض مآب معلی القاب نواب مستطاب [illegible] ہز ہائینس نواب محمد احمد علی خان بہادر کے سی ایس آئی۔ والیٔ ریاست مالیر کوٹلہ دام اقبالہٗ

مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۱۸ء

نمبر ۱۰۹

رخصت ہوا لیر تب خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد صاحب چیف میڈیکل آفیسر ریاست

آپکی درخواست مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۱۸ء بذریعہ رپٹ ہوم منسٹر صاحب ریاست باستدعائے استعفا ملازمت من ابتدائے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء پیش ہوکر ملاحظہ کیگئی۔ چونکہ آپ ترک ملازمت سے بسبب اپنی چند مجبوریوں کا اظہار کرتے ہیں۔ بنابراں آپکی درخواست استعفا من ابتدائے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء منظور کیجاکر صادر حکم ہے کہ تاریخ مذکورہ پر آپ چارج عہدہ چیف میڈیکل آفیسر ریاست ڈاکٹر جگت رام صاحب سائنی کے سپرد کرکے سبکدوشی حاصل کریں۔ آپکی طبی خدمات کو جو دوران ملازمت ریاست میں آپنے انجام دیں۔ اور آپکے حسن قابلیت اور تجربہ فن کو جو حضور انجناب کیلئے بطرح موجب خوشنودی مزاج رہا۔ ابد بدولت واقبال نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لہذا بصلہ خدمات مذکورہ آپکو خلعت خاص بقدر [illegible] روپیہ کا عطا کیا جاکر پروانہ ہذا باظہار خوشنودی مزاج واعتراف خدمات پسندیدہ آپ کو عطا کیا جاتا ہے۔ کہ سند اپنے پاس رکھیں۔

4/9/1918

ڈاکٹر شیخ عطاء محمد کو ریٹائرمنٹ کے وقت ریاست مالیر کوٹلہ کے نواب کی طرف سے ملنے والی تعریفی سند

کرنل خواجہ عبدالرشید کا خط بنام نامعلوم

پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ کا خط بنام سردار عبدالغفور دُرانی

Off Aden.
Mar. 8th.

My dear Abdul Ghafur Khan.

I hope that the enclosed testimonial will meet your wishes. I have not gone into details about your family, as their distinguished services are already so well known & can be attested by separate documents. I write with great difficulty, as the ship is rolling about so much. I shall always be glad to hear from you & shall watch your career with interest.

I hope that you will get through your B.A. exam well & soon obtain the Government service you desire. Mrs. Arnold joins me in kind wishes. We have had a good journey so far, but it is getting hotter, the nearer we approach Arabia. ✓

Yours sincerely
T. W. Arnold.

My congratulations upon your marriage, which I hope will be attended [illegible]

کو صلاحیتوں کو تقویت ملی اور وہ اور زیادہ اُجاگر ہوئیں ۔ شاعری میں مجھے علامہ اقبال سے بہت فائدہ پہنچا ، وہ میری طالب علمی کے زمانے سے میرا شاعرانہ کاوشوں میں دلچسپی لیتے تھے ، اور بعد میں اُن کی رہنمائی میرے بہت کام آئی ۔ اُن کے مکتوبات میرے نام اقبال نامہ حصہ دوم میں چھپ چکے ہیں اور اُن سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔ مولانا سید میر حسن صاحب سے میں نے منشی فاضل کے نصاب کی چند کتابیں پڑھیں جن سے مجھے فارسی زبان اور ادب کے سلسلے میں بہت فائدہ ہوا ۔

شاعر کی شاعری کو کیا حصہ سمجھئے کہ اُس کے چند ایک عناصر ہیں جو پس منظر کا کام دیتے ہیں ۔ پہلا وراثت ہے ، یہ ہو چکا ۔ دوم تعلیم و تربیت ہے ، اس کا بھی ذکر آ گیا ۔ تیسرا تاریخ معاصر اور عام ماحول ہے جو سراپا انقلاب ہے ۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور میں بھی آپ میں داخل ہوا ، گویا نصف صدی سے زائد کی تاریخ میری آنکھوں کے سامنے وجود میں آئی ہے ۔ کیا میں اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہوں ؟ پھر ایک اہم عنصر مناظر قدرت کا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بحرین ، شیراز ، طہران اور بغداد کے مناظر نے مجھے بہت متاثر کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ 1927ء میں پہلی دفعہ کشمیر گیا اور تقریباً پندرہ سال تک گرمی کی تعطیلیں اس خطۂ جنت نظیر میں گزارتا رہا ۔ جو رنگ و نور اور سرود و سرور کی وادی نے تمام پہلے نقوش لوح دل سے محو کر دئے ۔

میری فارسی نظموں کا مجموعہ "ماہ نو" 1928ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے مرحوم مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف کی نگرانی میں شائع ہوا ۔ یہ 1921ء سے 1927ء تک چھ سات سال کا کلام ہے ، کیونکہ 1928ء کا کلام اس میں شامل نہیں ۔ شعراء و ادباء و فضلاء پاکستان و ایران کی آراء اور تبصروں میں سے چند ایک اقتباسات علیحدہ نقل کر رہا ہوں ، یہ کتاب کے متعلق رائے قائم کرنے میں معاون ثابت ہوں گے ۔ نیز "ماہ نو" کی اشاعت کے بعد کے کلام کے بھی چند اقتباسات علیحدہ لکھ رہا ہوں جو مقالہ کے نقطۂ نظر سے یقیناً مفید ہوں گے ۔

"ماہ نو" کے بعد سنہ 1947ء میں ایک رسالہ بعنوان "نقش حق" شائع کیا تھا جس کا موضوع عشق و ایمان ہے ۔ ان کے علاوہ کچھ اردو نظمیں "لالۂ صحرا" ، "جبرئیل و ابلیس" وغیرہ بھی جو میں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے مختلف سالانہ جلسوں میں پڑھیں پمفلٹ کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں ۔ آئندہ دو سال کے دوران ان شاء اللہ دس بارہ کتابیں جو زیر تالیف و ترتیب ہیں ، شائع کرنے کا ارادہ ہے ۔ چند کتابوں کے عنوان یہ ہیں : ۔

(۱) "مہر منیر" : اردو کلام کا مجموعہ ، جس کا مقدمہ "میری شاعری کی تاریخ" پر مشتمل ہے ۔
(۲) "خمخانۂ عرفان" یعنی حقیقت شعر و پیغام قرآن ۔ (۳) "قرآن کا فلسفۂ محبت" ۔
(4) "تصوف اسلام کی حقیقت" ۔ (5) "زہد کا قرآنی تصور" ۔ (6) "اسلام اور ڈسپلن" ۔
(7) "اُم الکتاب یا قرآن مجمل" (تفسیر سورۂ فاتحہ) ۔

نوٹ : "ماہ نو" میں نظم "خورشید بیرون" کو غور سے دیکھئے ۔ اس کے سٹینزے (بند) اور تشبیہات مرکب و مفصل میرے ساتھ مخصوص ہیں ۔ یعنی ہمارے مشرقی شاعری میں اس کا نمونہ موجود نہیں ، یہ بالکل نئی چیز ہے ۔ "کوہ صبا" کسی خاص پہاڑ کا نام نہیں فرضی نام ہے : چونکہ یہ پہاڑ صبوی شیراز ہے ، نظم میں اس کا نام "کوہ صبا" رکھ دیا ہے ۔

Munir
9.1.67

پروفیسر اکبر منیر کے خود نوشت حالات سے ایک صفحے کا عکس

Jawaid Manzil,
Mayo Road,
Lahore.

My dear Dr. Ziauddin,

I am addressing to you on a matter of supreme importance both to the country and to the community. I understand Mr. Ataullah of your University has completed a book (The Cooperative Movement in the Punjab) which George Allen, the famous London publishers after their expert's report on the manuscript, have agreed to bring out. The book has also been accepted by the All India Cooperative Institutes' Association for being issued under the Indian Cooperative Series.

In view of the scientific nature of the book the publishers, like the rest of their trade wish to ensure themselves against any possible financial loss and have hence asked the author to contribute £ 100/- by way of subsidy towards the publication of the book. This sum quite naturally is above the means of the author.

I cannot sufficiently impress upon you the importance of Mr. Ataullah's work and its intimate connection with the economic life of the Mussalmans of the Punjab. You know our community sadly lacks economists of any reputation and you will agree that any amongst these who works needs every encouragement especially when he belongs to Aligarh and his work has already won recognition. Musalmans of the Punjab are deeply interested in the subject and I am perfectly confident that the publication of this book will bring honour both to the author and to your University. I would request you to provide Mr. Ataullah with £ 100/- from the University funds or through your personal influence and thus enable him to bring out his book without all avoidable delay. Mr. Ataullah undertakes to pay to the University all royalty money he receives till the amount thus given by the University is paid up.

I can assure you that in the interest of the community and the University money so spent will be exceedingly well spent. May I hope you will give your immediate and serious consideration to this request and suggestion. I shall feel highly obliged if you intimate to me your decision in the matter.

Yours sincerely,
Muhammad Iqbal

Dated Lahore
21st Ap. 1936

مکتوب علامہ محمد اقبال بنام ڈاکٹر ضیاالدین احمد جس میں پروفیسر عطااللہ کی کتاب "پنجاب میں تحریک امداد باہمی" پر انہیں یونیورسٹی فنڈ میں سے ۱۰۰ پونڈ دینے کی سفارش کی گئی۔

Pro-Vice Chancellor.

MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH

Muslim University,
Aligarh.

17th April 1925.

My dear Khan Bahadur Sahib,

I received your letter about Talia Mohammad for a post in the Muslim University School. The vacancy in school is for the teaching of the Science. Please let me know whether Mr. Talia Mohd. knows Physics, Chemistry and preferably Biology.

Yours sincerely,

[illegible]

مکتوب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بنام خان بہادر شیخ عبدالقادر؛ جو انہوں نے آپنے نوٹ کیساتھ ماسٹر طالع محمد کو بھیجا

کتابیات و ماخذات

"اقبال اور گجرات" کی تیاری کے دوران جن کتب' اخبارات اور خطوط سے مدد ملی ہے ذیل میں اُن کی فہرست بلحاظ ترتیب حروف تہجی' مصنفین کے شکریئے کیساتھ دی جا رہی ہے۔

کتب (اردو' فارسی' پنجابی)

نمبر	کتاب	مصنف	مقام	سال
۱۔	ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال	ڈاکٹر گیان چند	حیدر آباد	۱۹۸۸ء
۲۔	احوال و آثار مولوی نجف علی عاصی	عبدالجلیل نجفی	لاہور	۱۹۸۷ء
۳۔	احوال و کلام مولوی نور الدین انور	ڈاکٹر منیر احمد سلیچ	گجرات	۱۹۹۷ء
۴۔	ارمغان کشمیر	ڈاکٹر آفتاب اصغر	لاہور	۱۹۹۳ء
۵۔	اسرارِ خودی (پنجابی ترجمہ)	ڈاکٹر احمد حسین قریشی	لاہور	۱۹۷۶ء
۶۔	اسلامی تصوف اور اقبال	ڈاکٹر ابو سعید نور الدین	لاہور	۱۹۵۹ء
۷۔	اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ	پروفیسر احمد سعید	لاہور	۱۹۹۲ء
۸۔	اشعارِ اقبال کی تصویری جھلکیاں	چودہری محمد احسن	لاہور	۱۹۸۹ء
۹۔	افکارِ اقبال	محمد حامد	لاہور	۱۹۸۸ء
۱۰۔	اقبال از عطیہ بیگم (اردو)	عطیہ بیگم/ضیاء الدین احمد	لاہور	۱۹۸۱ء
۱۱۔	اقبال اور انجمنِ حمایتِ اسلام	محمد حنیف شاہد	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۲۔	اقبال اور احمدیت	بشیر احمد ڈار	لاہور	۱۹۸۴ء
۱۳۔	اقبال اور پنجاب کونسل	محمد حنیف شاہد	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۴۔	اقبال اور تصوف	محمد فرمان	لاہور	۱۹۸۴ء
۱۵۔	اقبال اور علمائے پاک و ہند	اعجاز الحق قدوسی	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۶۔	اقبال اور کشمیر	سلیم خاں گمی	لاہور	۱۹۸۵ء
۱۷۔	اقبال اور کشمیر	صابر آفاقی	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۸۔	اقبال اور نئی نسل	ڈاکٹر ملک حسن اختر	لاہور	۱۹۸۸ء
۱۹۔	اقبال ۸۵ء	ڈاکٹر وحید عشرت (مرتب)	لاہور	۱۹۸۹ء
۲۰۔	اقبال دانشکارہ	اختر حسین شیخ	لاہور	۱۹۸۴ء
۲۱۔	اقبال درونِ خانہ	خالد نظیر صوفی	لاہور	۱۹۸۳ء
۲۲۔	اقبال کا آخری معرکہ	سید نور محمد قادری	لاہور	۱۹۷۹ء
۲۳۔	اقبال کا سیاسی کارنامہ	محمد احمد خاں	لاہور	۱۹۷۷ء

۲۴۔	اقبال کی ابتدائی زندگی	ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین	لاہور	۱۹۸۶ء
۲۵۔	اقبال کی صحبت میں	عبداللہ چغتائی	لاہور	۱۹۷۷ء
۲۶۔	اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	لاہور	۱۹۷۸ء
۲۷۔	اقبال کے اُستاد مولوی میر حسن	ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین	لاہور	۱۹۸۱ء
۲۸۔	اقبال کے حضور	سید نذیر نیازی	لاہور	۱۹۸۱ء
۲۹۔	اقبال کے دینی و سیاسی افکار	سید نور محمد قادری	گجرات	۱۹۸۲ء
۳۰۔	اقبال کے محبوب صوفیاء	اعجاز الحق قدوسی	لاہور	۱۹۷۶ء
۳۱۔	اقبال کے ممدوح علماء	قاضی افضل حق قرشی	لاہور	۱۹۷۷ء
۳۲۔	اقبالنامہ جلد اول	شیخ عطاءاللہ	لاہور	۱۹۴۵ء
۳۳۔	اقبالنامہ جلد دوم	شیخ عطاءاللہ	لاہور	۱۹۵۱ء
۳۴۔	اقبالیات کے تین سال	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	لاہور	۱۹۹۳ء
۳۵۔	اقوام شرق دا وچار (پنجابی)	اقبال/ڈاکٹر احمد حسین قریشی	لاہور	۱۹۹۴ء
۳۶۔	اکابر تحریک پاکستان	صادق قصوری	لاہور	۱۹۷۹ء
۳۷۔	امیر حزب اللہ	ڈاکٹر محمد عبدالغنی	جہلم	۱۳۸۴
۳۸۔	انوار اقبال	بشیر احمد ڈار (مرتب)	کراچی	۱۹۶۷ء
۳۹۔	اوراق گم گشتہ	رحیم بخش شاہین (مرتب)	لاہور	۱۹۷۹ء
۴۰۔	باقیات اقبال	سید عبدالواحد معینی (مرتب)	لاہور	۱۹۵۲ء
۴۱۔	بانگ دھل	اُستاد امام دین گجراتی	لاہور	۱۹۹۱ء
۴۲۔	بحضور اقبال	مصباح الحق صدیقی وغیرہ	لاہور	۱۹۷۷ء
۴۳۔	پو پھٹی	پیر نیک عالم	لاہور	س ن
۴۴۔	تاریخ اقوام کشمیر	منشی محمد الدین فوق	لاہور	؟
۴۵۔	تحریک مسجد شہید گنج	جانباز مرزا	لاہور	۱۹۸۸ء
۴۶۔	تذکرہ اکابر اہلسنت	عبدالحکیم شرف قادری	لاہور	۱۹۷۶ء
۴۷۔	تذکرہ علمائے پنجاب	اختر راہی	لاہور	۱۹۸۱ء
۴۸۔	تذکرہ مشائخ قادریہ	محمد دین کلیم	لاہور	۱۹۸۵ء
۴۹۔	جبریل و ابلیس	محمد اکبر منیر ایم اے	جالندھر	۱۹۴۳ء
۵۰۔	جشن نامہ اقبال	عبادت بریلوی (مرتب)	لاہور	۱۹۷۷ء
۵۱۔	جاوید نامہ (پنجابی ترجمہ)	شریف کنجاہی (مترجم)	لاہور	۱۹۷۷ء
۵۲۔	حیات اقبال کا ایک جذباتی دور	پروفیسر محمد عثمان	لاہور	۱۹۷۵ء

۵۳۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں	عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۸۲ء
۵۴۔ حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے	محمد حمزہ فاروقی	لاہور	۱۹۸۸ء
۵۵۔ حیاتِ امیر شریعت	جانباز مرزا	لاہور	۱۹۸۹ء
۵۶۔ خدوخالِ اقبال	محمد امین زبیری	کراچی	۱۹۸۶ء
۵۷۔ خطوطِ اقبال	رفیع الدین ہاشمی (مرتب)	لاہور	۱۹۷۷ء
۵۸۔ خفتگان خاکِ گجرات	ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ	گجرات	۱۹۹۶ء
۵۹۔ خفتگانِ خاکِ لاہور	پروفیسر محمد اسلم	لاہور	۱۹۹۳ء
۶۰۔ خفتگانِ کراچی	پروفیسر محمد اسلم	لاہور	۱۹۹۱ء
۶۱۔ داستان اقبال	صابر کلوروی	لاہور	۔
۶۲۔ دانائے راز	سید نذیر نیازی	لاہور	۱۹۸۸ء
۶۳۔ درس تہذیب	حکیم عبداللطیف عارف	گجرات	۱۳۸۱ھ
۶۴۔ دِل دی آواز (پنجابی ترجمہ)	علی احمد گوندل	بھلوال	۱۹۷۸ء
۶۵۔ ذِکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	لاہور	۱۹۸۳ء
۶۶۔ ذِکرِ حبیب	ملک محمد الدین (مدیر "صوفی")	لاہور	۱۴۰۴ھ
۶۷۔ رجالِ اقبال	عبدالرؤف عروج	کراچی	۱۹۷۷ء
۶۸۔ روایاتِ اقبال	عبداللہ چغتائی (مرتب)	لاہور	۱۹۷۷ء
۶۹۔ روزگارِ فقیر (جلد اول دوم)	فقیر سید وحید الدین	لاہور	س ن
۷۰۔ زندہ رود۔ جلد اول	ڈاکٹر جاوید اقبال	لاہور	۱۹۸۵ء
۷۱۔ زندہ رود۔ جلد دوم	ڈاکٹر جاوید اقبال	لاہور	۱۹۸۶ء
۷۲۔ زندہ رود۔ جلد سوم	ڈاکٹر جاوید اقبال	لاہور	۱۹۸۷ء
۷۳۔ سر سید احمد خاں پنجاب میں	مولوی سید اقبال علی	دہلی	۱۹۸۸ء
۷۴۔ سرگزشت	عبدالمجید سالک	لاہور	۱۹۵۵ء
۷۵۔ سرگزشت اقبال	عبدالسلام خورشید	لاہور	۱۹۷۷ء
۷۶۔ سوزِ ازل (مجموعہ کلام)	سید افتخار حیدر	لاہور	۱۹۸۸ء
۷۷۔ سیرتِ اقبال	محمد طاہر فاروقی	لاہور	۱۹۸۱ء
۷۸۔ شعرالعجم فی الہند	شیخ محمد اکرام	لاہور	۱۹۶۱ء
۷۹۔ شکوہ، جوابِ شکوہ (پنجابی)	احمد حسین قریشی قلعداری	لاہور	۱۹۶۳ء
۸۰۔ شکوہ، جوابِ شکوہ (پنجابی)	کاظم علی	گجرات	۱۹۶۸ء
۸۱۔ شہادت الفرقان	شیخ عطاء اللہ وکیل	لاہور	س ن

نمبر	کتاب	مصنف/مرتب	مقام	سال
۸۲۔	صحیفہ اقبال	یونس جاوید (مرتب)	لاہور	۱۹۸۶ء
۸۳۔	صبح ازل (مجموعہ کلام)	ڈاکٹر محمد شجاع ناموس	لاہور	نامعلوم
۸۴۔	عروج اقبال	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	لاہور	۱۹۸۷ء
۸۵۔	عکاسیات احسن	چودہری محمد احسن (علیگ)	گجرات	۱۹۷۰ء
۸۶۔	علامہ اقبال اور انکی پہلی بیوی	سید حامد جلالی نقوی	کراچی	۱۹۶۷ء
۸۷۔	علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں	جعفر بلوچ	لاہور	۱۹۹۵ء
۸۸۔	قبر جنہاں دی جیوے	احمد سلیم	لاہور	۱۹۹۶ء
۸۹۔	کنایات اقبال	رفیع الدین ہاشمی	لاہور	۱۹۷۷ء
۹۰۔	کلاسیکی ادب کا مطالعہ	ڈاکٹر وحید قریشی	لاہور	۱۹۶۵ء
۹۱۔	کلیات اقبال (اردو)	علامہ محمد اقبال	لاہور	۱۹۹۰ء
۹۲۔	کلیات اقبال (فارسی)	علامہ محمد اقبال	لاہور	۱۹۹۰ء
۹۳۔	کلیات مکاتیب اقبال جلد ۱	سید مظفر حسین برنی (مرتب)	دہلی	۱۹۸۹ء
۹۴۔	کلیات مکاتیب اقبال جلد ۲	سید مظفر حسین برنی (مرتب)	دہلی	۱۹۹۱ء
۹۵۔	گجرات کی بات	اسحاق آشفتہ (مرتب)	گجرات	۱۹۹۱ء
۹۶۔	گفتار اقبال	محمد رفیق افضل (مرتب)	لاہور	۱۹۸۹ء
۹۷۔	گلشن راز جدید و بندگی نامہ	احمد حسین قریشی (مترجم)	لاہور	۱۹۸۴ء
۹۸۔	گلگت اور شنا زبان	ڈاکٹر محمد شجاع ناموس	بہاولپور	۱۹۶۱ء
۹۹۔	لالہ صحرا (نظم)	محمد اکبر منیر ایم اے	جالندھر	۱۹۴۰ء
۱۰۰۔	ماہ نو (فارسی مجموعہ کلام)	محمد اکبر منیر ایم اے	اعظم گڑھ	۱۹۲۸ء
۱۰۱۔	مذہبی افکار کی تعمیر نو (اردو ترجمہ)	شریف کنجاہی	لاہور	۱۹۹۲ء
۱۰۲۔	مطالعہ اقبال	گوہر نوشاہی (مرتب)	لاہور	۱۹۷۱ء
۱۰۳۔	مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال	ڈاکٹر اکبر حسین قریشی	لاہور	۱۹۸۶ء
۱۰۴۔	مظلوم اقبال	اعجاز احمد	کراچی	۱۹۸۵ء
۱۰۵۔	معاصرین اقبال کی نظر میں	عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۰۶۔	مفتاح التقویم	حبیب الرحمن خان صابری	دہلی	۱۹۷۷ء
۱۰۷۔	مفکر پاکستان	محمد حنیف شاہد	لاہور	۱۹۸۲ء
۱۰۸۔	مقالات اقبال	سید عبدالواحد معینی (مرتب)	لاہور	۱۹۸۸ء
۱۰۹۔	مقام شوق	راجہ یعقوب الحفیظ	راولپنڈی	۱۹۹۱ء
۱۱۰۔	مقامات محمود	نواب معشوق یار جنگ بہادر	جہلم	۱۹۸۳ء

۱۱۱-	مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان	بزم اقبال لاہور (مرتب)	لاہور	۱۹۵۴ء
۱۱۲-	مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی	سید نذیر نیازی (مرتب)	لاہور	۱۹۵۷ء
۱۱۳-	ملفوظات اقبال مع حواشی و تعلیقات	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۱۴-	موج کوثر	شیخ محمد اکرام	لاہور	۱۹۸۱ء
۱۱۵-	میلاد شریف اور علامہ اقبال	سید نور محمد قادری	واہ کینٹ	۱۹۷۸ء
۱۱۶-	نذر اقبال (منظومات)	ذوالفقار احمد تابش (مرتب)	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۱۷-	نذر اقبال (مقالات)	محمد حنیف شاہد (مرتب)	لاہور	۱۹۷۲ء
۱۱۸-	نعرہ حریت	صاحبزادہ ظفر علی شاہ عباسی	گجرات	۱۹۵۱ء
۱۱۹-	نغمہ فردوس جلد اول	چودہری خوشی محمد ناظر	لاہور	۱۹۳۷ء
۱۲۰-	نغمہ فردوس جلد دوم	چودہری خوشی محمد ناظر	لاہور	۱۹۳۸ء
۱۲۱-	نغمہ فردوس (انتخاب)	چودہری خوشی محمد ناظر	لاہور	۱۹۹۲ء
۱۲۲-	نور تن (خاکے)	شورش کاشمیری	لاہور	۱۹۶۷ء
۱۲۳-	وفیات مشاہیر پاکستان	پروفیسر محمد اسلم	لاہور	۱۹۹۱ء
۱۲۴-	وے صورتیں الٰہی	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	لاہور	۱۹۸۳ء
۱۲۵-	یاد اقبال (سوانح)	صابر کلوروی	لاہور	۱۹۷۷ء
۱۲۶-	یاد اقبال (منظومات بحضور اقبال)	سرور فگار (مرتب)	کراچی	۱۹۴۴ء
۱۲۷-	یاران کہن	عبدالمجید سالک	لاہور	۱۹۶۷ء

128- All of us - Directoru of Graduates of KEMC LHR 1860-1985.

129- Iqbal - AS I knew him- By Doris Ahmed LHR 1987.

130- King Edward Medical College LHR 1860-1985.

131- The Devil's Conference By Muhammad Ashraf Gujrat 1951.

132- The Gazeteer of District Gujrat 1921.

133- The Letters and writings of Iqbal By B A Dar LHR 1986.

134- The Rod of Moses By Syed Akbar Ali Shah LHR 1983.

135- Thus Conferred Satan By Muhammad Asharf LHR 1977.

رسائل و جرائد

شمار	نام	دورانیہ	مقام اشاعت	بابت
۱۔	آفاق	ہفت روزہ	لاہور	۳۰ اپریل ۱۹۴۹ء
۲۔	استقلال	ہفت روزہ	لاہور	۱۰ فروری ۱۹۸۳ء
۳۔	استقلال	ہفت روزہ	لاہور	۲۲ فروری ۱۹۸۳ء
۴۔	اقبال	سہ ماہی	لاہور	اکتوبر ۱۹۵۷ء
۵۔	اِقبال	سہ ماہی	لاہور	اکتوبر ۹۲ جنوری ۹۳ء
۶۔	اِقبال ریویو	سہ ماہی	لاہور	اِقبال نمبر ۱۹۷۷ء
۷۔	اِقبال ریویو	سہ ماہی	لاہور	اِقبال نمبر ۱۹۸۴ء
۸۔	اِقبالیات	سہ ماہی	لاہور	جنوری' مارچ ۱۹۸۸ء
۹۔	اِقبالیات	سہ ماہی	لاہور	جنوری' مارچ ۱۹۹۶ء
۱۰۔	تعمیرنو	ہفت روزہ	گجرات	سالنامہ ۱۹۵۶ء
۱۱۔	تعمیرنو	ہفت روزہ	گجرات	سالنامہ ۱۹۵۹ء
۱۲۔	تعمیرنو	ہفت روزہ	گجرات	سالنامہ ۱۹۶۷ء
۱۳۔	تعمیرنو	ہفت روزہ	گجرات	سالنامہ ۱۹۶۸ء
۱۴۔	تنظیم	ہفت روزہ	بھمبر۔ گجرات	۸ جنوری ۱۹۶۸ء
۱۵۔	چٹان	ہفت روزہ	لاہور	سالنامہ ۱۹۶۲ء
۱۶۔	چیلنج	ہفت روزہ	گجرات	۲۳ اپریل ۱۹۸۱ء
۱۷۔	چیلنج	ہفت روزہ	گجرات	۱۲ اکتوبر ۱۹۸۱ء
۱۸۔	حروف	سالنامہ	مجلّہ زمیندار سائنس کالج گجرات	۱۹۸۸ء
۱۹۔	راوی	سالنامہ	مجلّہ گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۷۴ء
۲۰۔	راوی	سالنامہ	مجلّہ گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۸۵ء
۲۱۔	راوی	سالنامہ	مجلّہ گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۹۲ء
۲۲۔	سیارہ ڈائجسٹ	ماہنامہ	لاہور	اِقبال نمبر مارچ ۷۸ء
۲۳۔	شاعر	ماہنامہ	بمبئی	اِقبال نمبر ا۔ ۱۹۸۸ء
۲۴۔	شاہین	سالنامہ	مجلّہ زمیندار کالج گجرات	۱۹۴۱ء
۲۵۔	شاہین	سالنامہ	مجلّہ زمیندار کالج گجرات	۱۹۶۴ء
۲۶۔	شاہین	سالنامہ	مجلّہ زمیندار کالج گجرات	۱۹۷۰ء
۲۷۔	شاہین	سالنامہ	مجلّہ زمیندار کالج گجرات	اِقبال نمبر ۱۹۷۸ء

۲۸۔	شاہین	سالنامہ	مجلہ زمیندار کالج گجرات	۱۹۸۶ء
۲۹۔	شاہین	سالنامہ	مجلہ زمیندار کالج گجرات	۱۹۸۸ء
۳۰۔	صادق	ہفت روزہ	لاہور	اقبال نمبر ۲۰ اپریل ۵۶ء
۳۱۔	صدائے قاسمی	ماہنامہ	کراچی	قریشی نمبر دسمبر ۹۵ء
۳۲۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۸۴ء
۳۳۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۸۵ء
۳۴۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۸۶ء
۳۵۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۸۷ء
۳۶۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۸۸ء
۳۷۔	صحیفہ	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر ۱۹۹۰ء
۳۸۔	صوفی	ماہنامہ	پنڈی بہاؤالدین	متعدد شمارے
۳۹۔	ضیائے حرم	ماہنامہ	لاہور	اپریل ۱۹۷۵ء
۴۰۔	غازی	ہفت روزہ	گجرات	چند شمارے
۴۱۔	فنون	سہ ماہی	لاہور	اقبال نمبر دسمبر ۱۹۷۷ء
۴۲۔	فنون	سہ ماہی	لاہور	ستمبر، دسمبر ۱۹۹۲ء
۴۳۔	قانوگو	ماہنامہ	لاہور	دسمبر ۱۹۶۶ء
۴۴۔	قومی صحت	ماہنامہ	لاہور	قریشی نمبر دسمبر ۱۹۸۸ء
۴۵۔	کریسنٹ	سالنامہ	مجلہ اسلامیہ کالج لاہور	حالی نمبر ۱۹۶۹ء
۴۶۔	کریسنٹ	سالنامہ	مجلہ اِسلامیہ کالج لاہور	صد سالہ نمبر ۱۹۹۲ء
۴۷۔	لہراں	ماہنامہ	لاہور	اکتوبر ۱۹۸۹ء
۴۸۔	محب کسان	ہفت روزہ	گجرات	متعدد پرچے
۴۹۔	مہک	سالنامہ	مجلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ	اقبال نمبر ۱۔ ۱۹۷۴ء
۵۰۔	مہک	سالنامہ	مجلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ	گوجرانوالہ نمبر ۱۹۸۶ء
۵۱۔	نشیمن	ماہنامہ	گجرات	جون ۱۹۳۹ء
۵۲۔	نقوش	سہ ماہی	لاہور	اِقبال نمبر ۱
۵۳۔	نقوش	سہ ماہی	لاہور	اِقبال نمبر ۲
۵۴۔	نقوش	سہ ماہی	لاہور	لاہور نمبر ۱
۵۵۔	نقوش	سہ ماہی	لاہور	لاہور نمبر ۲
۵۶۔	نقوش	سہ ماہی	لاہور	مکاتیب نمبر ۱

۵۷۔ نقوش سہ ماہی لاہور آپ بیتی نمبر۱

اخبارات

۱۔	اخبار	اقبال	ملتان	۷ نومبر۱۹۳۸ء
۲۔	روزنامہ	امروز	لاہور	۲۱ اپریل ۱۹۸۱ء
۳۔	روزنامہ	پاکستان	لاہور	۹ نومبر۱۹۹۱ء
۴۔	روزنامہ	جنگ	لاہور	۹ نومبر۱۹۹۱ء

مکاتیب (جن سے معلومات حاصل ہوئیں)

۱۔	مکتوب تھامس ولیم آرنلڈ بنام سردار عبدالغفور خان	محررہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء
۲۔	مکتوب کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید بنام احمد حسین قریشی قلعداری	محررہ ۲۱ مارچ ۱۹۶۷ء
۳۔	مکتوب کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید بنام نامعلوم	محررہ ۲۰ فروری ۱۹۷۹
۴۔	مکتوب ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین بنام راقم (ڈاکٹر منیر سلیچ)	محررہ ۲ دسمبر۱۹۹۱ء
۵۔	مکتوب ڈاکٹر حسن اختر ملک بنام راقم	محررہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ء
۶۔	مکتوب ضیاء الدین ملک بنام راقم	محررہ ۱۵ جولائی ۱۹۹۴ء
۷۔	مکتوب ضیاء الدین ملک بنام راقم	محررہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۴ء
۸۔	مکتوب پروفیسر خواجہ عبدالرؤف مہتہ بنام راقم	محررہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۴ء
۹۔	مکتوب سید ذوالکفل بخاری بنام راقم	محررہ ۳، اگست ۱۹۹۴ء
۱۰۔	مکتوب اطہر مسعود بنام راقم	محررہ ۵، اگست ۱۹۹۴ء
۱۱۔	مکتوب بیگم رشیدہ آفتاب اقبال بنام راقم	محررہ یکم، نومبر۱۹۹۴ء
۱۲۔	مکتوب بیگم رشیدہ آفتاب اقبال بنام راقم	محررہ ۱۵، دسمبر۱۹۹۴ء
۱۳۔	مکتوب جناب مختار مسعود بنام راقم	محررہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء
۱۴۔	مکتوب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام راقم	محررہ ۱۳ مئی ۱۹۹۵ء
۱۵۔	مکتوب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بنام رقم	محررہ ۱۳ جون ۱۹۹۵ء
۱۶۔	مکتوب بیگم رشیدہ آفتاب اقبال بنام راقم	محررہ ۳۰ جون ۱۹۹۷ء
۱۷۔	مکتوب پروفیسر انور حسین سید بنام راقم	محررہ ۶ جنوری ۱۹۹۸ء
۱۸۔	مکتوب جناب مختار مسعود بنام راقم	محررہ ۳ فروری ۱۹۹۸ء

اشاریہ

اشخاص، کتب، رسائل
اماکن، ادارے وغیرہ

اشخاص:۔

کتب، رسائل، اخبارات

اماکن

ادارے، تنظیمیں، مدارس، مطابع، تحاریک

تعارف مصنّف

نام۔ محمّد منیر احمد سلیچ

تاریخ پیدائش۔ ۶ جنوری ۱۹۶۸ء

جائے پیدائش۔ لوراں گجرات (پنجاب)

پرائمری تعلیم۔ پرائمری سکول لوراں ۱۹۷۸ء

مڈل وہائی۔ آر اے ہائی سکول مدینہ گجرات ۱۹۸۳ء

ایف ایس سی۔ گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات ۱۹۸۵ء

ایم بی بی ایس۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور ۱۹۹۱ء

بی اے (نجی طور پر)۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۷ء

ایم اے پنجابی (")۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۱ء

ایم اے اردو (")۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۳ء

مصروفیات۔ میڈیکل آفیسر محکمہ صحت / تصنیف و تالیف

اعزازات :۔

☆ اول تا ایف ایس سی ہر جماعت میں اول پوزیشن

☆ وظائفِ ذہانت۔ مڈل 'میٹرک 'ایف ایس سی

☆ جنرل سیکرٹری بیالوجیکل سوسائٹی زمیندار کالج گجرات

☆ بہترین مضمون نگار زمیندار کالج ۱۹۸۴ء '۱۹۸۵ء

☆ دوسرا بہترین مضمون نگار گوجرانوالہ ڈویژن ۱۹۸۴ء

☆ مدیر مجلّہ کیمکول کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج ۱۹۹۰ء

☆ بہترین انفرادی سکورر کوئز ٹیم میڈیکل کالج ۱۹۹۰ء

☆ سیکرٹری اطلاعات پی ایم اے گجرات ۱۹۹۷ء

☆ امام الدین میموریل گولڈ میڈل برائے ۱۹۹۷ء

☆ بانی جنرل سیکرٹری پیر فضل ادبی مجلس گجرات

☆ بانی رکن گجرات رائٹرز کلب گجرات

تصانیف

مطبوعہ :۔

۱ ۔خفتگانِ خاکِ گجرات

۲ ۔احوال و کلام مولوی نورالدین انور

۳ ۔ گجرات کے پنجابی نعت گو شعرا

۴ ۔ گجرات کے اردو نعت گو شعرا

۵ ۔اقبال اور گجرات

منتظرِ اشاعت مسودات :۔

۱ ۔ گجرات دے پنجابی لکھاری

۲ ۔ گجرات کے علمی مشاہیر

۳ ۔اہلِ گجرات کی مطبوعہ کتب

۴ ۔احوال و آثار پیر فضل گجراتی

۵ ۔قومی علمی مشاہیر کے خطوط

۶ ۔کلیاتِ عاصی رضوی